تاریخ ملتان

جلد اوّل

مولانا نور احمد خان فریدی

قصر الادب رائٹرز کالونی، ملتان

مُلتانِ ما بجنّتِ اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

تاریخ ملتان

جلد اوّل

عہدِ قدیم سے عہدِ قریش تک

از

مولانا نور احمد خان فریدی

ناشر قصر الادب
نور محل براہ شجاع آباد ضلع ملتان
رائیٹرز کالونی، ملتان شہر

انتساب

اُن وارثانِ نبوّت کے نام

جو

اِس عظیم شہر کی پاک سرزمین میں

محوِ خواب ہیں

رحمہم اللہ علیہم جمیعاً

خاکسار

مُصنّف

عظمتِ ملتان

بہ ہر سرے کہ بہ بینم ہوائے ملتان است
بہ ہر سرا کہ نشینم ضیائے ملتان است

حریم خطۂ ملتاں حریم فقر و غناست
ورائے سطوتِ شاہاں گدائے ملتان است

متاعِ امن و سکوں از اہالیٔ ایں شہر
فضائے خلق و مروّت فضائے ملتان است

بروں ز دہم و گماں عظمتِ بہاء الدینؒ
بروں ز حیطۂ تخمیں بہائے ملتان است

دیارِ رُشد و ہدایت، دیارِ رُکن الدّینؒ
بقائے جذب و طریقت بقائے ملتان است

فرخ درّانی

میر محمد کرم شاہ صاحب ایم اے (الازہر) پرنسپل دار العلوم محمدیہ بھیرہ ضلع سرگودھا

مولانا نور احمد خاں فریدی اپنی وسعتِ علمی، بالغ نظری اور ان کی تصانیف اپنی افادیت اور اہمیت کے باعث کسی تقریب یا کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

مؤرخ اقوام و ملل کے علمی، روحانی، تمدنی اور عمرانی خزانوں کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا اہم فریضہ ادا کرتا ہے۔ یہ کام بڑا نازک اور بے حد مشکل ہے۔ اس کے لئے وسعتِ مطالعہ کی ضرورت ہے تاکہ اس موضوع پر جتنا کام پہلے ہو چکا ہے۔ اس کا کوئی گوشہ پوشیدہ نہ ہو۔ اس کے لیے فکرِ رسا کی ضرورت ہے تاکہ واقعات میں ربط قائم کر کے نتائج اخذ کئے جا سکیں۔ اس کے لئے قلبِ بینا کی ضرورت ہے تاکہ حال کے آئینہ میں مستقبل کے خدوخال دیکھ کر اپنی ملت کے کارواں کو صحیح راہ پر گامزن کیا جا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا فریدی صاحب کو بڑی فیاضی سے ان صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ایک خصوصی کرم جو ان پر ہوا ہے، یہ ہے کہ مشیتِ ایزدی نے ان کے قلم کو سلاطین و امراء کی قصیدہ گوئی سے ہٹا کر اقلیمِ معرفت کے تاجداروں، میدانِ فتوت و مردانگی کے شہسواروں اور ملکِ معنی کے سلاطین کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے منتخب فرمایا اور وہ بھی اس زمانہ میں جبکہ الحاد و دہریت کے طوفان امڈ کر آ رہے ہیں، جبکہ موجودہ سائنسی علوم کی فتوحات ذہنوں کو مرعوب کر رہی ہیں، اور جبکہ ملتِ اسلامیہ خود فراموشی اور احساسِ کہتری کے ساتھ ساتھ مادہ پرستی کے روگ میں مبتلا ہے۔ اس پُر آشوب دور میں اللہ تعالیٰ نے فریدی صاحب کے قلم کو یہ کام سونپا ہے کہ وہ ان زندہ جاوید ہستیوں اور اسلام کے نامور فرزندوں کے زریں کارناموں کو بڑی شائستگی، دلفریب انداز اور علمی اسلوب میں پیش کر کے اپنی ملت کے نوجوانوں کو دعوتِ فکر و نظر دیں۔

مولانا کی ہمت، جوانمردی اور ثابت قدمی کی داد دیئے بغیر انسان نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے اس جہاد میں اغیار کے ستم بھی برداشت کئے اور اپنوں کی بے رُخی اور حوصلہ شکن بے مہری کا بھی مقابلہ

کیا۔ آپ نے خاندانِ سہروردیہ اور شیخ الاسلام بہاء الدین ابو محمد زکریا قدس سرہ العزیز، آپ کی اولاد امجاد اور خلفائے ابرار کا تذکرہ جس تحقیقی اور دلرُبا انداز سے رقم کیا وہ ان کا زندہ جاوید کارنامہ ہے حضرت غوث العالمین کی اولاد اور آپ کے عقیدت مندوں پر ان کا بڑا احسان ہے جس کا شکریہ ادا کرنے کا ابھی ان کے دل میں احساس بھی پیدا نہیں ہُوا۔

اس وقت تاریخ ملتان کی جلد اوّل میرے سامنے ہے۔ ملتان جنّت نشان فاضل مصنّف کا وطن ہے۔ وطن سے کس کو پیار نہیں ہوتا، لیکن اس پیار اور محبّت کا حق ہر شخص ادا نہیں کر سکتا۔ خصوصًا جب وطن ملتان ہو جس کی تاریخ تاسیس کا تعیّن ابھی تک مورخین کے لئے ایک معمّہ ہے جس کا یہ طویل عہد عروج و زوال، اقبال و ادبار کا ایک ختم نہ ہونے والا تسلسل ہے۔ جس کی زندگی کا ہر دَور تاریخی اہمیت کا حامل ہے، جس کا ہر ذرّہ اپنے سینے میں غم و مسرّت کی ایسی یادیں سمیٹے ہوئے ہے جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جس کے ہر گوشہ میں بڑے بڑے فاتح، سلاطین اور فضلاء آسودہ ہیں۔ جس کا ہر گلی کوچہ ان مردانِ پاکباز کا مسکن ہے جن کے آستانوں سے نُور و عرفان کے میٹھے چشمے اب بھی ابل رہے ہیں۔ ایسے قدیم شہر کی تاریخ مرتب کرنا، طرح طرح کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا، واقعات کی گم گشتہ کڑیوں کا سُراغ لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن مولانا نے جس محنت، بالغ نظری اور دقت رسی کا ثبوت دیا ہے، اہلِ علم ہمیشہ اسے عزّت و احترام کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

آپ کی اس محققانہ تالیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو سخت کش مکش کا سامنا اُس وقت کرنا پڑا جب آپ نے تاریخ ملتان کے ضمن میں اہل اللہ کے حالات قلمبند کیے۔ ہماری تاریخ کا المناک سانحہ یہ بھی ہے کہ ایسے شہبازوں کی مسند اُن لوگوں کے حصّہ میں آئی جن کا روحانی پہلو بدیں وجہ کمزور ہو چکا ہے جن کی کم ہمّتی اور عیش کوشی نے انہیں ان بلندیوں میں جھانکنے کی مہلت نہ دی جہاں ان کے قابلِ فخر اسلاف پَر کُشا رہے تھے ؎

میراث میں آئی ہے اُنہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن
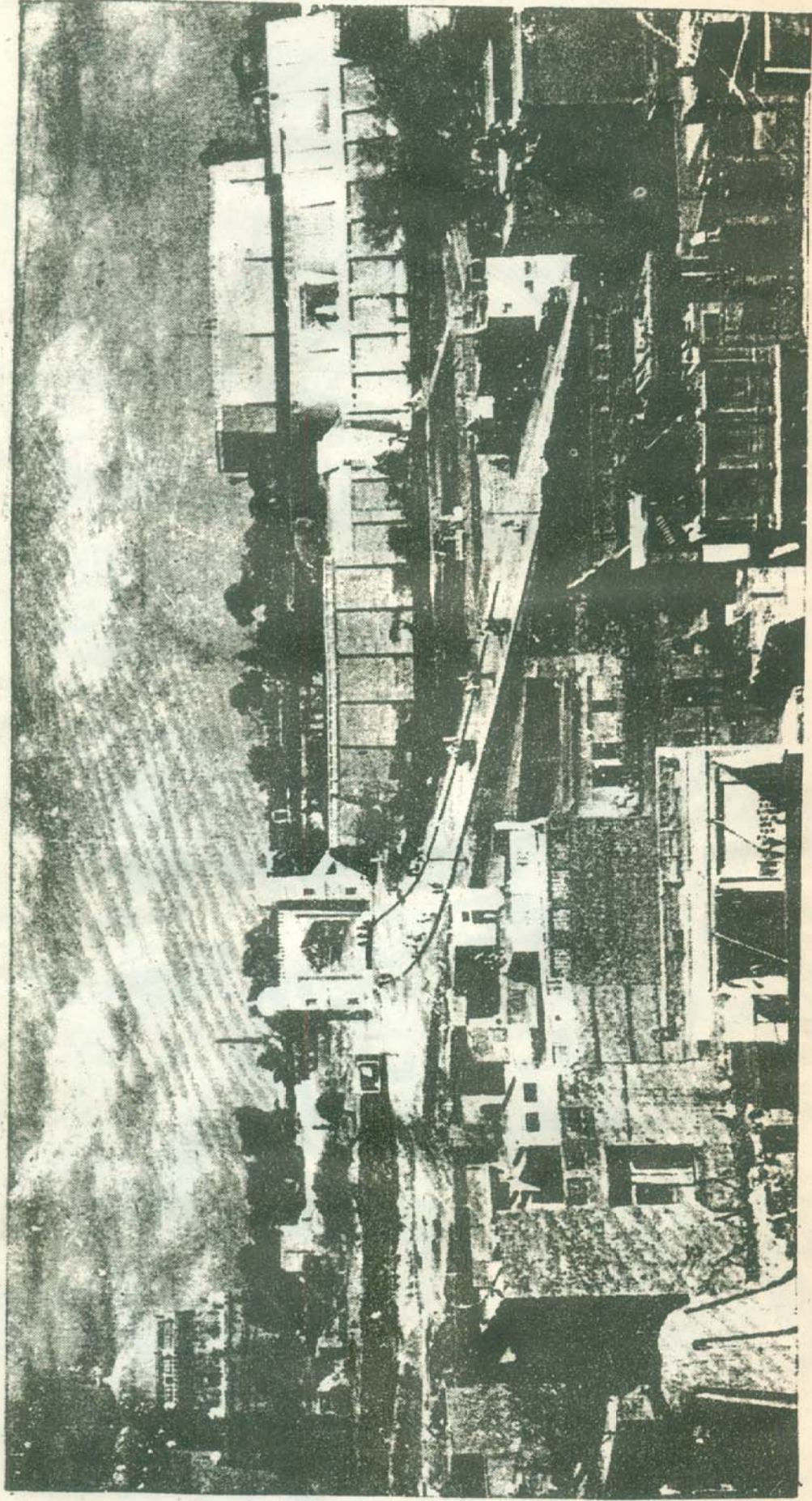
قلعہ قدیم ملتان کا منظر عمومی
(پس منظر میں دمدمہ - باب قاسم رح - اور مقبرہ شاہ رکن عالم رح)

سکندر اعظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

پیش لفظ

سنہ ۱۹۳۸ء میں دفعتہً مجھ پر قولنج عقرب کا حملہ ہوا، اور مجھے سول ہسپتال ملتان میں داخل کرادیا گیا۔ احقر کم و بیش دو ماہ اس ہسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ چونکہ ہسپتال شہر کے قریب تھا احباب طبع پرسی کے لئے آتے رہتے تھے۔ ایک دن چودھری مبارک علی صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ملتان تشریف لائے اور فرمایا۔ میرے ہاں پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری آئے ہوئے ہیں۔ آج ملتان کے بزرگوں کے آستانوں پر حاضری دینے کی غرض سے نکلے تھے، بڑی مشکل سے چند بزرگوں کے مقابر تک رسائی ہو سکی۔ اور فاتحہ پڑھ کر واپس آگئے۔ جونہی اللہ کریم آپ کو شفائے کاملہ عطا کرے۔ زائرین اور سیاحوں کے لئے ملتان کا تعارفی کتابچہ لکھ ڈالیں۔ خدا کسی کی نیکی ضائع نہیں کرتا یقیناً آپ کو بھی اس کا اجرِ عظیم عطا ہوگا۔

چودھری صاحب تو چلے گئے، مگر میرے لئے ایک کٹھن کام چھوڑ گئے۔ میں ہسپتال میں پڑا تھا، اور لکھنا پڑھنا بجائے خود رہا۔ مجھے احباب سے ملنے جلنے کی اجازت تک نہ تھی۔ اور یہ کام شہر میں چل پھر کر کرنے کا تھا۔ اس سلسلے میں میں نے چند دوستوں کا انتخاب کیا۔ جن میں ڈاکٹر نثار حسین اور ایم عطاء اللہ مرحوم کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ دوڑ بھاگ کر ضروری معلومات فراہم کرتے اور میں انہیں اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتا۔ اس سلسلے میں مولانا حافظ دلدار بخش صاحب صدیقی کی ایک قلمی یادداشت بھی بڑی مفید ثابت ہوئی۔ ہسپتال سے نکلتے ہی احقر نے مسودہ پر نظرِ ثانی کی اور تین ماہ کے اندر ہی اندر ملتان کا تعارفی کتابچہ "سرزمین ملتان" کے نام سے منظرِ عام پر آگیا۔ احباب نے میری کوشش کو سراہا۔ زائرین اور سیاحوں نے تعریفی خطوط لکھے اور تھوڑے سے عرصہ میں اس ننھی سی تصنیف کو ملتان کے

کتب خانوں اور بک اسٹالوں میں اس کے شایانِ شان جگہ مل گئی۔
"سرزمینِ ملتان" سے پہلے لالہ حکم چند صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی "تاریخ ملتان" اور سید محمد اولاد علی گیلانی کی "مرقع ملتان" متداول بین الناس تھیں۔ مگر ان میں شہر کی تاریخ کا حصہ بہت کم تھا۔ ان دونوں کتب کا بیشتر حصہ دیہات کے حالات پر مشتمل تھا۔ اس لئے ملتان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں نے احقر کو اجمال سے تفصیل کی طرف جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ بندہ مسلسل ملتان پر لکھنے میں مصروف رہا۔ پہلے نواب مخدوم مرید حسین قریشی مرحوم سجادہ نشین "آستانہ زکریا" کے ایما پر شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ کی سیرت مدوّن کی، جسے پڑھ کر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمۃ نے فرمایا:-

"فریدی صاحب! آپ نے یہ کتاب لکھ کر شیخ کی قبر کو غسل دیا ہے خدا کی قسم اس کتاب کے مطالعہ سے پہلی بار شیخ کا اصل مقام میرے سامنے آیا ہے۔"

پھر نیاز مند نے حضرت شیخ الاسلام کے صاحب سجادہ اور خلف اکبر الشیخ العارف صدر الدین محمد اور پیارے پوتے قطب الاقطاب شاہ رکن عالم رحمہم اللہ کے تذکرے طبع کرائے جو بے حد مقبول ہوئے۔ محکمہ تعلیم نے انہیں تمام کالجوں اور سکولوں وغیرہ کی لائبریریوں کے لئے منظور کیا۔ کمشنر صاحب ملتان ڈویژن نے تمام میونسپل، ٹاؤن کمیٹیوں اور یونین کونسلوں کو ان کے خریدنے کی سفارش فرمائی۔ اس کے بعد خاکسار نے تاریخ ملتان کو مدوّن کرنا شروع کیا۔ لیکن ابھی اسے مکمل نہیں کر پایا تھا کہ پتے اور جگر کے عوارض کا شکار ہو گیا۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کو آپریشن کرانے کی نیت سے نشتر ہسپتال میں داخل ہوا۔ ۴ر نومبر کو آپریشن ہونا تھا۔ ہفتہ عشرہ کا یہ وقفہ میرے لئے انتہائی پریشانی اور بے اطمینانی کا وقفہ تھا۔ خوراک ختم ہو چکی تھی۔ صرف گلوکوز پر جی رہا تھا۔ کمزوری کا یہ عالم تھا کہ بات تک نہیں کر سکتا تھا۔ ڈاکٹروں کی انتہائی ممانعت کے باوجود اس خطرے کے پیش نظر کہ اگر آپریشن میں جانبر نہ ہو سکا تو میری یہ محنت رائیگاں جائے گی۔ میں نے تاریخ ملتان کے مسوّدہ پر نظر ثانی کی اور اسے تکمیل کو پہنچایا۔
چونکہ ملتان کا مجد و شرف مشائخ اور فقراء کی وجہ سے ہے اور اسے پیروں فقیروں

کی نگری کہا جاتا ہے۔ اس لئے نیاز مند نے اس کتاب میں اہل اللہ کے حالات کو وہی مقام دیا ہے جس کے یہ قدسی نفوس مستحق تھے۔ اور سلاطین و امرائے کے حالات کو ثانوی حیثیت دی ہے۔ بایں ہمہ مجھے اعتراف ہے کہ بے شمار خدا یاد درویشوں کے حالات اس کتاب کی زینت نہیں بن سکے۔ کیونکہ ان کا تذکرہ کسی تاریخ اور سیرت کی کتاب میں نہیں ملتا۔ ملتان شہر کو قدیم سے بابِ لہند کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مشائخ اور علماء جو بھی اس ملک میں داخل ہوئے، ملتان کو سب سے پہلے ان کی پابوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اس شہر میں جگہ جگہ بڑی قبور نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک دو نہیں، سینکڑوں شہداء دفن ہیں۔ گویا ہر قبر اپنی اپنی جگہ پر "گنج شہیداں" ہے۔ اسی طرح ہر مسجد کے پہلو میں جو قبور ملتی ہیں، یہ ان علماء کی آخری آرامگاہیں ہیں جنہوں نے ان مساجد کے در و دیوار کو قال اللہ و قال الرسول سے گرمایا تھا۔ جنہوں نے مسندِ درس کو زینت دے کر کتاب و سنت کے اسرار و معارف بیان کئے تھے۔ آج کوئی نہیں جانتا کہ ان گمنام قبروں میں کس پایہ کے مفسر، محدث، فقیہہ، اور رزم آزما جوان کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کی چادر تانے محوِ خواب ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے اب یہ قبریں مٹتی جا رہی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد نہ یہ قبریں رہیں گی اور نہ کوئی انہیں یاد کرے گا۔ اللہ بس باقی ہوس!

خان عمر کمال خان [تعارف]

میں ۱۹۴۰ء میں گورنمنٹ ہائی سکول ملتان میں تعلیم پاتا تھا اور جناب مولانا عبدالرشید نسیم صاحب جنہیں ادبی دُنیا مولانا طالوت کے نام سے جانتی ہے۔ ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ ہمارا تمام سکول مولانا طالوت کے تبحرِ علمی اور پاکیزہ سیرت کی وجہ سے ان کا گرویدہ تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا۔ کہ مولانا طالوت متشرع وضع قطع کے ایک بزرگ سے بڑی محبت اور انکساری اور تواضع سے مل رہے ہیں۔ مجھے تجسس ہوا۔ کہ اس قدر بڑا اہلِ علم اس پیرِ مرد کے آگے کیوں جھکا جا رہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا۔ کہ میرے استاد جس شخص سے اس قدر محبت سے مل رہے تھے۔ وہ ہمارے علاقے کی جامع الصفات شخصیت مولانا نور احمد خان فریدی ہیں۔ اس

کے بعد مولانا سے نیاز مند قریب ہوتا چلا گیا۔ اور ان کی علمی خدمات سے اس قدر متاثر ہوا۔ کہ آج نیاز مند کو اس شہر کے دانشوروں اور ادیبوں کے مقابلے میں مولانا صاحب کی شخصیت سب سے زیادہ محترم اور مکرم نظر آتی ہے۔ مولانا صاحب محض مؤرّخ اور نقّاد ہی نہیں، بلکہ ایک کامیاب افسانہ نویس بھی ہیں۔ انہوں نے علّامہ محمد اقبالؒ کی اس خواہش پر کہ نوجوان طبقہ کے لیئے تاریخِ اسلام کو افسانوی رنگ میں پیش کیا جائے۔ دو (۲) جلدوں میں اِسلامی افسانے لکھے اور اس امر کی سخت احتیاط کی کہ افسانیت حقیقت پر غالب نہ آنے پائے۔

مولانا کا ایک اور علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولانا عزیز الرحمان مرحوم کی دعوت پر مولانا طالوت، خرّم بہاول پوری، اور پروفیسر دلشاد کلانچوی کی معیت میں دیوانِ فریدی کا ترجمہ کیا۔ اسی سعی جمیل کے پیشِ نظر مولانا طالوت نے انہیں ادیب فرید کے لقب سے نوازا تھا۔

مولانا تذکرہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ، تذکرہ صدر الدین عارفؒ۔ تذکرہ شاہ رُکنِ عالمؒ اور جاکرِ اعظمؒ جیسی پچیس کتابوں کے مُصنّف ہیں۔ ہوشربا گرانی کے باوجود مولانا نے پیٹ پر پتھر باندھ کر اور قناعت کر کے پندرہ کتابیں طبع کرا لی ہیں۔ اور باقی طباعت کی منتظر ہیں۔

تاریخ کے سلسلے میں ۱۹۴۰ء میں مولانا نے سَرزمینِ مُلتان کے نام سے ایک تعارفی کتابچہ شائع کیا تھا۔ اس کتابچہ کی اٹھان سے ہی اہلِ علم نے اندازہ لگایا تھا کہ مولانا کا رہوارِ تحقیق کس طرف رُخ کر رہا ہے۔ چنانچہ چوبیس سال کی شبانہ روز مساعی کے بعد آج آپ نے اہلِ ملتان کے سامنے دو (۲) ضخیم کتابیں پیش کی ہیں جو اس عظیم شہر کی مفصل اور مبسوط تاریخ پر محیط ہیں۔ اس کی تدوین کے سلسلے میں مولانا نے جو جدّ و جہد اور محنت کی ہے اس

کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے معلومات تاریخی مواد اور ماخذات کے سلسلے میں ایسے ایسے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ جہاں ہر کہ ومہ کی رسائی نہیں ہوتی۔ بلکہ دو تین کتب خانے ایسے ممسک اصحاب کے قبضے میں تھے۔ جو بالکل بے فیض اور علم دوستی کے جذبہ سے عاری تھے۔ میں خود اور دوسرے کئی شائقین ان مخطوطات کو ان کے مکانات پر بیٹھ کر پڑھنے کی رعایت سے محروم ہو چکے تھے۔ لیکن مولانا نے کسی نہ کسی طرح ان مخفی خزانوں تک رسائی حاصل کر ہی لی اور کافی چھان پھٹک اور غیر جانبداری سے ملتان کی ایسی جامع تاریخ لکھی ہے۔ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گی۔

آخر میں بھارت کے مشہور مؤرخ اور نقاد مولانا حامد حسن قادری مرحوم کے اشعار جو انہوں نے آج سے چوبیس سال پہلے مولانا کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کیے تھے۔ عرض کرتا ہوں، فرماتے ہیں ؎

رہے تاریخ کے میداں میں گردش
سمندِ کلک کو ہرگز نہ ٹھہرا
مئے اسلام کے سب جام و خم ہیں
تری ایک ایک سطر، ایک ایک پیرا
بیا اے ساقیٔ تاریخِ اسلام
بگردش آر ایں مینا و مے را
حماک اللہ عن شر النوائب
جزاک اللہ فی الدارین خیرا

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا صاحب کو عمرِ خضر عطا کرے۔ تاکہ وہ

اِسی طرح قوم وملک اور علم وادب کی خدمت انجام دیتے رہیں۔

جناب عاصی کرنالی

لانبا قد، چہرے پر سجی ہوئی ڈاڑھی، سر پر ترکی ٹوپی، ستھرا لباس، اجلا تن، اجلا من
یہ ہیں مولانا نور احمد خان فریدی۔ میں انہی کے حوالے سے ملتان کو دیکھتا ہوں۔ ملتان کا قد وقامت اتنا بلند ہے کہ مجھے اس کے مقابلے میں بہت سے شہر اور وہاں کی تہذیبیں بونی لگتی ہیں۔ ملتان کے چہرے پر علم وفضل اور دین وتقویٰ کی سجی ہوئی ڈاڑھی بھی مجھے نظر آتی ہے۔ ملتان کے سر پر ایک ٹوپی ہے۔ جسے میں تاجِ ولایت قرار دیتا ہوں۔ اس سرزمین کے اولیاء اور اصفیاء یہاں کی کلاہِ عزت اور تاجِ وقار ہیں۔ ملتان کا تن اور من بھی اُجلا ہے۔ ملتان کا تن اس کی ثقافت ہے اور اتفاق یہ ہے بلکہ یہ یہاں کے بزرگانِ دین اور اہلِ علم کی کرامت ہے۔ کہ یہ لباسِ ثقافت ہمیشہ نو بہ نو رہتا ہے اور اس کی کہنگی اس کی شانِ تقدیس وتطہیر میں اضافہ کرتی ہے۔ ملتان کا اُجلا تن یہاں کی روحانیت ہے۔ یہاں کا اخلاق ہے۔ یہاں کا خلوص ہے۔ جو ہمیشہ اُجلا ہی رہتا ہے۔ جیسے وہ کوثر کی موج ہو۔ یا جیسے آفتابِ سحر کی پاکیزہ کرن! ۔ سو حضرات میرے نزدیک مولانا فریدی آئینہ ملتان نما ہیں۔ میں اس آئینہ میں حسب توفیق نظر، ملتان کی عظمتوں کے نقوش اور تہذیب وتمدن کی شفاف تصویریں دیکھ کر اپنی دُنیا نکھارتا اور اپنی عاقبت سنوارتا ہوں
علم وفضل کے اس سکندر نے ایک آئینہ ایجاد کیا ہے۔ جس کا نام تاریخ ملتان ہے،
یہ آئینہ رنگ برنگے مظاہر اور تجلّیوں کا امین ہے۔ ہم اس آئینے پر نظر جمائیں تو درِ آئینہ باز ہوتا ہے اور ہم اس حیرت خانے میں جا نکلتے ہیں۔ جس میں ملتان کے ماضی

مؤلف و ناشر

خاکسار نور احمدؒ خان فریدی

اگر سیاہ دِلم داغِ لالہ زارِ تو ام
دگر گشادہ جبینم گلِ بہارِ تو ام
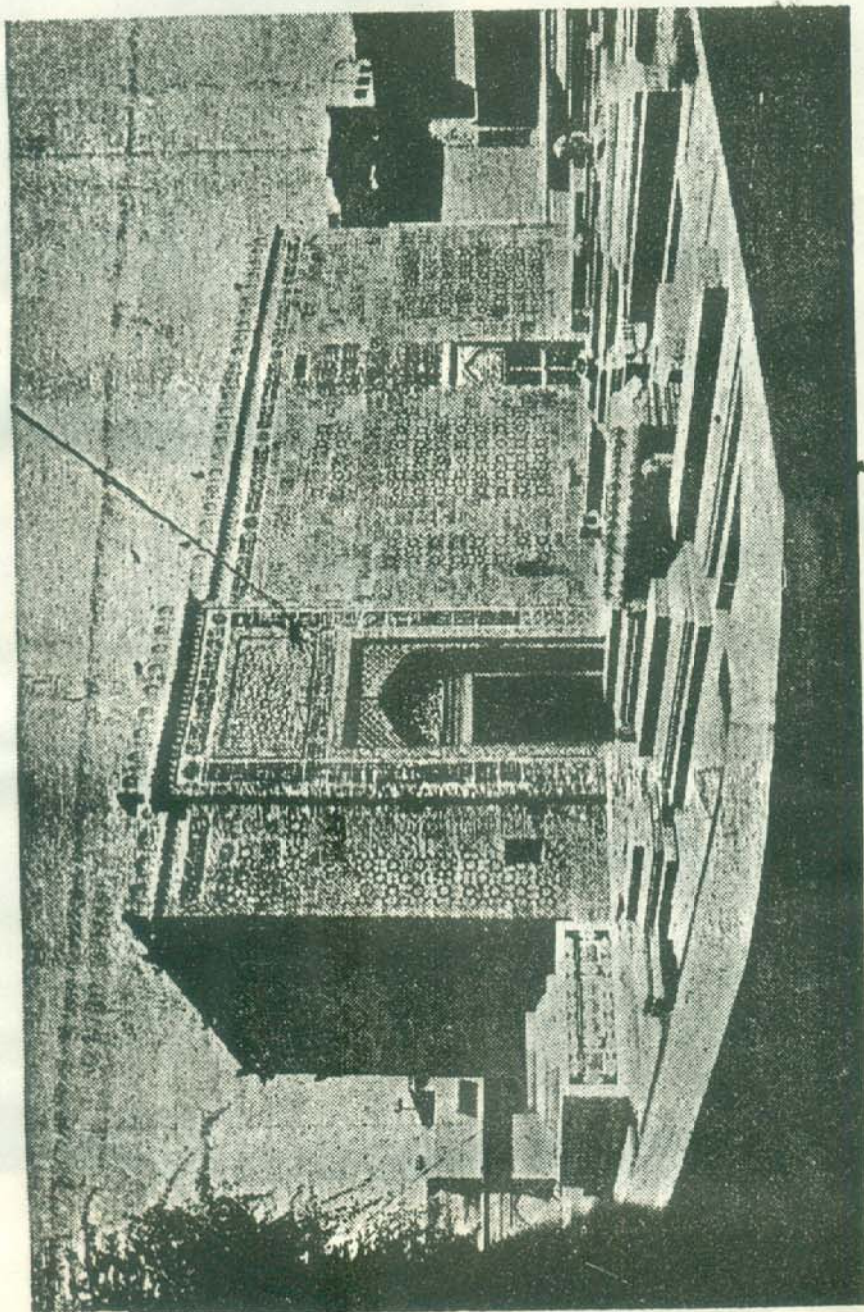
مقبرہ حضرت شیخ الاسلام شاہ محمد یوسف گردیزی رحمتہ اللہ علیہ

اپنی تمام صداقتوں، لطافتوں، رفعتوں، شوکتوں اور اپنے تمام جلال، جمال اور کمال کی تابانیوں کے جلوہ فرما ہے۔ ماضی قدیم نے اپنی روشنی کی چھوٹ عصرِ حاضر پر ڈالی ہے اور اس طرح ایک تہذیب اپنے تسلسل کے ساتھ اور ایک تمدن اپنے تواتر کے ساتھ اس حیرت کدے سے ضیاپاشیاں کر رہا ہے۔ مولانا فریدی نے ایک مفکر کی فراست، ایک عالم کی بصیرت، ایک ناقد کی ذکاوت، ایک محقق کی ریاضت، ایک محتسب کی جرأت اور ایک مؤرخ کی دیانت کے ساتھ اس عظیم نقش کو مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ایک طویل و عریض کینوس پر محیط ہے۔ مولانا نے اس خاکِ زندہ کی نفس شماری اس وقت سے کی ہے۔ جب اس نے پہلا سانس لیا۔ اور اوّلین پیکر اختیار کیا۔ اس عہد سے لے کر عصرِ حاضر تک جتنے ادوار جتنے تغیّرات، جتنے انقلابات، جتنی تہذیبیں، معاشرتی، علمی اور سیاسی کروٹیں، اس پیکرِ حیات نے لیں اُن سب کو شمار کیا ہے، عروس البلاد ملتان کا محلِ وقوع، وجہِ تسمیہ، یہاں کا عہدِ قدیم، ایرانی حملے، سکندرِ اعظم کی تاخت، ہندو پیریڈ اہلِ ملتان کا تہذیب و تمدن، بیرونی اثرات و نفوذات، ملتان کا اپنا تہذیبی تشخص، ہر عہد کے سلاطین و اُمراء، ممتاز روحانی شخصیات، بے شمار خانوادے، قبائل، دینی، سماجی اور سیاسی تحریکات، ان تمام موضوعات و مطالبات کو لے کر چلتے ہیں اور ان کے ڈانڈے ملتان کی موجودہ تہذیبی فنی اور ثقافتی ترقی سے ملا دیتے ہیں۔ اس سارے علمی کارنامے میں کتنی وُسعت، کتنا تبحّر زبردست مطالعہ اور کس قدر استعداد و قابلیت درکار ہے مولانا نے علم و تحقیق اور تاریخ و تہذیب کے کتنے دفتر کھنگالے ہوں گے۔ تب اس بحرِ ذخائر سے وہ موتی چُنے ہیں۔ جو کتاب کے صفحات پر پڑے دمک رہے ہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ آئینہ احوال پر ضعیف الاعتقادی، توہم اور تشکیک کا جو زنگ آ گیا تھا اور

کا نقش اور ایک کی ذات سے دوسرے کا تشخّص اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ خُدا ان دونوں کو زندہ سلامت رکھے۔ کہ یہ دونوں ہماری ثقافت کے آئینہ دار اور ہماری قومی نجابت کے امین ہیں۔

جناب طاؔہر غنی

تمام اہلِ علم حضرات کا اِس اَمر پر اتّفاق ہے کہ ملتان عظیم بھی ہے اور قدیم بھی، اور یہ کہ ملتان تاریخ کے ہر دَور میں اپنی شاندار روایات کی بدولت برِصغیر پاک وہند کے دوسرے شہروں سے ممتاز و منفرد رہا ہے۔ نیز اسلامی تہذیب کا اوّلین گہوارہ، اور اولیاء اللہ کی نگری ہونے کے سبب کروڑوں مسلمانوں کی عقیدتوں کا مرکز بھی ہے۔ ہم اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ملتان کے چپّے چپّے میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی صدیاں آباد ہیں۔ مگر جب ہم اس عظیم ورثے کی تلاش میں نکلتے تھے۔ تو ہمیں مایوسی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہزار ہا سال قدیم شہر کی کوئی ایسی جامع اور مفصّل تاریخ نہیں تھی۔ جسے اسناد کا درجہ دیا جا سکتا۔ مولانا نور احمد خان فریدی بڑے دُکھ سے ایک ایک کے آگے اس اَمر کا اظہار کرتے تھے۔ کہ ملتان کے تاریخی اور تہذیبی آثار مٹتے جا رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عظیم اور تاریخی ورثہ مرورِ ایّام کے ساتھ خاک ہی میں مل جائے اور آنے والی نسلیں اپنے شہر کی شوکتِ رفتہ کی بابت کچھ بھی نہ جان سکیں۔ اس لیئے آیئے ملتان کی تاریخ پر کام کریں۔ مگر کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ بالآخر وہ تنہا اس کام میں لگ گئے۔ اور اس اسّی ۸۰ سالہ بوڑھے دانشور نے وہ کارنامہ کر دکھایا۔ جو جوانوں سے انجام نہ پا سکا تھا۔

مولانا نے تین سال کی جہد مسلسل سے ۱۹۷۲ء میں تاریخ ملتان کی پہلی جلد

شائع کی اور آج دوسری جلد کی رسمِ افتتاح ہے۔ اب اہلِ ملتان کو کوئی یہ طعنہ نہیں دے سکے گا۔ کہ اس شہر کی کوئی مستند تاریخ نہیں ہے۔ مولانا فریدی کو اولیاء اللہ اور بالخصوص شیخ الاسلام حضرت بہاءالدّین زکریّا علیہ الرحمتہ سے دلی لگاؤ اور والہانہ عشق ہے۔ تذکرہ بہاء الدّین زکریّاؒ، صدرالدین عارفؒ اور تذکرہ شاہ رکنِ عالمؒ ایسی بلند پایہ کتابیں ان کے عشق صادق کی مظہر ہیں۔

شیخ الاسلام بہاءالدین زکریّاؒ نے ملتان کو "ملتانِ ما" کہہ کر اسے خصوصی شرف و مجد بخشا اور مولانا نے مبسوط تاریخ لکھ کر اسے زندۂ جاوید بنا دیا۔

مولانا کی تاریخ مستند بھی ہے اور مربوط بھی، دلچسپ بھی ہے اور دلآویز بھی۔ اس میں عہدِ قدیم سے عصرِ رواں تک کے خدوخال پوری طرح نمایاں ہیں۔ تاریخ کا جدید نظریہ کہ تاریخ صرف بادشاہوں کے تذکرے کا نام نہیں۔ بلکہ اس دور کے علمی، ادبی تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور معاشی حالات کو اجاگر کرنے کا نام بھی ہے۔ جب ہم مولانا کے اس تاریخی شاہکار کا بنظرِ امعان جائزہ لیتے ہیں تو یہ تمام چیزیں اس میں شرح و بسط کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ بلاشبہ مولانا نے اس جدید نظریہ کے مطابق حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں کو بے نقاب کیا ہے اور زندگی کی ہر راہ کی پیمائش کی ہے۔ آپ نے ان علماء صلحاء اہلِ کمال، اُدباء، شعراء، حکماء اور ان بوریہ نشینوں کو بھی تصنیف کے اوراق میں شاہوں کے برابر جگہ دی ہے۔ جنہوں نے شرافت، نیکی اور وضعداری کی روایت کو قائم رکھا۔ بلاشبہ مولانا کی یہ تصنیف ہر لحاظ سے بلند پایہ اور مکمل ہے۔ اور ؏

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!

جناب ولی محمد صاحب واجد نے پیر حسّام الدّین راشدی کی مطبوعہ تقریظ پڑھ کر

سُنائی۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا۔ کہ مولانا فریدی صاحب نے یہ تاریخ لکھ کر صرف ملتان پر ہی احسان نہیں کیا۔ بلکہ سندھ کے سر بھی ان کی ہزار ہزار منتیں ہیں۔ کیونکہ پاکستان کے کسی حصّے سے سندھ کا اتنا گہرا رشتہ نہیں ہے۔ جتنا کہ ملتان سے ہے۔ پس ملتان پر جو کچھ لکھا جاتا ہے۔ در اصل وہ سندھ کی تاریخ کا ایک ورق ہوتا ہے۔

ابّا حضور نے اپنی عزت افزائی پر جناب سپیکر صاحب اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نیز ملتان کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر صاحبان کا بھی جنہوں نے اس کتاب کی طباعت میں گہری دلچسپی لی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے افتتاحی رسم ادا کرتے ہوئے ابّا حضور کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور فرمایا۔ کہ ملتان شہر کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے جیالے فرزندوں نے کبھی بھی سامراجی قوتوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔ رنجیت سنگھ سات بار عظیم لشکر کے ساتھ اس شہر پر چڑھ کر آیا۔ مگر اُسے ہر دفعہ مُنہ کی کھانا پڑی۔ اور ستّر سال کے شیر دل پیرِ مرد نواب مظفر خان نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ملتان کی چابیاں میرے پیٹ میں ہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ تم اس شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کہ وُہ بطلِ حریّت اپنے سرباز رفیقوں، بہادر بیٹوں، حتیٰ کہ اپنی ایک صاحبزادی سمیت پامردی سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ تب سکھ اس قلعے پر اپنا جھنڈا لہرا سکے۔ مولانا فریدی صاحب نے تاریخ کے حقائق کو اس اسلوب اور انداز سے لکھا ہے۔ کہ قاری کا قلب و دماغ اس عظیم شہر کی جلالت قدر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ حاضرین کی پُرجوش تالیوں کی گونج میں یہ علمی اور ادبی تقریب اختتام کو پہنچی۔

عمر علی خان بلوچ

فہرس

عروس البلاد ملتان

کا

محلِّ وقوع اور وجہِ تسمیہ

عروس البلاد ملتان دریائے چناب کے غربی کنارے ۴۷ طول بلد اور ۱۳ عرض بلد پر واقع ہے۔ ابتداً یہ شہر اس جگہ آباد تھا، جہاں اب مائی پاک دامن علیہا الرحمہ کا قبرستان ہے۔ دریائے راوی کی ایک شاخ قلعہ کے شمالی جانب اور دوسری شہر اور قلعہ کے درمیان بہتی تھی۔ ملتان کئی بار آباد اور ویران ہوا ہے۔ جب بھی دوبارہ یہ منظرِ عام پر ابھرا نئے نام سے موسوم ہوا۔ چنانچہ تاریخوں میں اس کے ہنس پور، کشپ پور سنب پور، بھاگ پور اور شام پور وغیرہ کئی نام ملتے ہیں۔ اس کا نام ملتان کیسے پڑا اس بارے میں بھی کئی روائتیں مشہور ہیں۔

ایک تنقیدی جائزہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ملتان پر ملھی قوم حکومت کرتی تھی، اسی نسبت سے یہ شہر پہلے ملّی استھان اور پھر ملتان مشہور ہوا۔ ہمارے معاصر مؤرخین اس روایت کی تکذیب کرتے ہیں۔ عتیق فکری صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"جن لوگوں نے ملتان کو ملھی قوم کی وجہ سے مولستھان کہا ہے وہ غلطی پر ہیں۔" [۱]

[۱] ملتان قدیم و جدید صفحہ ۲۳

شیخ اکرام الحق صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ :۔

"مالی قوم آج سے دو ہزار برس پہلے سکندر کے حملے کے وقت آباد ضرور تھی، مگر نام گیا دیتی ان کا زمانہ تو ملتان کی قدامت کا عشر عشیر بھی نہیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرح یہاں اُبھرے، بسے اور ناگوں میں مل گئے۔ البتہ یہ امکانات سے ہے کہ چونکہ مولا اور مالی صرف اصوات کا ہیر پھیر ہے اور مالی برسرِ اقتدار بھی تھے۔ ممکن ہے تعلّی میں آکر مولا استھان کو مالی استھان کہہ دیا کرتے ہوں[1]۔"

اکرام صاحب کی یہ توجیہہ قرینِ قیاس ہے۔ ہماری موجودگی میں چند مقامات کے باشندوں نے اپنی مرضی کے مطابق اصل نام میں تصرف کر لیا ہے اور کسی نے اعتراض تک نہیں کیا۔ مثال کے طور پر لاہور کا محسن پورہ، اسے نواب محسن خان نے آباد کیا تھا اور اسی کے نام کو زندہ کئے ہوئے تھا۔ جب ہندوؤں نے اس میں اپنے مکانات تعمیر کرائے تو محسن پورہ کو "موہن پورہ" میں تبدیل کر لیا۔ چنانچہ اب اگرچہ ہندو نہیں رہے، مسلمان آبادی ناواقفیت کی بنا پر اس محلہ کو موہن پورہ ہی کہتی ہے۔ لاہور کے ایک دروازے کو نواب ذکریا خان نے تعمیر کرایا تھا اور اس بازار میں ان کے مکانات اور دکانوں کا لامتناہی سلسلہ دور تک چلا جاتا تھا۔ برچھا گردی کے دوران ذکی دروازہ یکی دروازہ کہلانے لگا۔ اب یکی گیٹ سے موسوم ہے۔ شالامار باغ کے قریب باغبانوں کی آبادی تھی اور وہ باغبان پورہ کہلاتی تھی۔ ہندوؤں نے بڑی بے تکلفی سے اسے بھگوان پورہ بنا لیا۔ ان

[1] ملتان قدیم و جدید صفحہ ۷

حقائق سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ صوتی تصرّفات سے شہروں کے نام ضرور متأثر ہوتے ہیں۔

مول استھان

شیخ اکرام الحق صاحب کی عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ ملتان کا اصل نام مولا استھان تھا جو سورج مندر کی وجہ سے پڑا تھا اور اس میں ادتیہ دیوتا کا بُت رکھا ہوا تھا۔ اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں :-

"دھور کے دھندلکے میں ان یادوں میں سب سے نمایاں ادتیہ دیوتا کے اُس بُت کی یاد ہے جس کی وجہ سے مولتان نے نام پایا[1]۔"

سُورج کی پوجا کم وبیش ایشیا کے ہر ملک میں ہوتی تھی۔ بابل میں "بال" عرب میں "بعل" بھی، سورج دیوتا کے نام تھے۔ تمام قدیمی مذاہب میں، جن میں بُت پرستی رائج تھی سُورج کو بڑا تقدس حاصل تھا۔ وہ اسے قوّت، زمین کو روشنی بخشنے والا، زندگی اور حرارت دینے والا، بلکہ تخلیق کائنات کو بھی اسی سے منسوب کرتے تھے۔ ملتان میں سُورج دیوتا کا جو بُت تھا۔ اس کی بابت اہلِ ملتان کا یہ دعویٰ تھا کہ سُورج دیوتا کا اصلی بُت یہی ہے۔ شیخ اکرام الحق صاحب کی رائے ملاحظہ ہو :-

"سنسکرت میں مولا کے معنی اصل کے ہیں اور استھان جگہ کو کہتے ہیں۔ مولا کا ایک متبادل لفظ وردھنا ہے جو سورج کا ایک نام ہے۔ چونکہ تمام روشنی کی جائے اصل "قرص آفتاب" ہے۔ اس لئے اس نسبت سے "مول ستھان"

[1] ملتان قدیم وجدید ص۲

نام ہونا قرین قیاس ہے[1]۔"

صرف عہد حاضر ہی نہیں، بلکہ قدیم مؤرخین کا نظریہ بھی مولتان کے بارے میں یہی تھا۔ چنانچہ البیرونی (م ۱۰۴۸ء) "کتاب الہند" میں لکھتا ہے کہ :۔

"اس قدیم شہر کے بہت نام ہیں۔ آخری نام مول سھان ہوا۔ اس سے مولستھان اور پھر کثرتِ استعمال سے مولتان ہو گیا[2]۔"

جنرل کننگھم صاحب بھی اسی نظریئے کی تائید کرتے ہیں۔ مولوی بشیر احمد صاحب نے اپنی مشہور کتاب "دار الحکومت" میں ان کی عبارت کا ترجمہ اس طرح سے کیا ہے :۔

"ملتان کی وجہ تسمیہ سورج دیوتا کا مندر ہے۔ جس کے باعث یہ شہر مشہور رہا ہے"

سورج مندر کا تاریخی پس منظر

سورج مندر ملتان میں کب سے قائم تھا۔ تاریخیں اس بارے میں خاموش ہیں۔ البتہ اس پر جو انقلابات آئے ان کا سراغ متداول کہانیوں اور یونانی و عربی سیاحوں کے سفرناموں سے مل سکتا ہے۔

پہلا حادثہ جو سورج مندر پر گزرا وہ راجہ ہرناکشپ کا خود سورج دیوتا کہلانا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ میں ہی سورج دیوتا ہوں اور اس نے اپنی شکل کا طلائی بت تیار کرا کر سورج مندر میں رکھوا دیا۔ پہلی مورتی کو غتر بود کر دیا اور لوگوں سے جبراً پوجا کرائی۔

---

[1] ملتان قدیم و جدید صفحہ　[2] کتاب الہند صفحہ ۱۴۹

پرہلاد بھگت کو فروغ حاصل ہوا تو اس نے سورج مندر کی جس میں اس کے والد راجہ ہرناکشپ کی مورتی رکھی تھی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور خالص خدائے واحد کی پرستش ہونے لگی۔ دو صدی بعد جب پرہلاد کا پوتا تخت نشین ہوا تو اس کے حریف راجہ سنبہ نے اسے شکست دے کر ملتان پر قبضہ کر لیا۔ اس نے سورج دیوتا کی پوجا از سر نو شروع کرائی اور سورج دیوتا کا سونے کا ایک خوبصورت بُت بنوایا اور اسے جلوس کی صورت میں لے جا کر ادتیہ استھان نامی مندر میں رکھوا دیا۔ یہی معبد بعد میں مولا استھان کے نام سے مشہور ہوا۔ یعنی ہرناکشپ کا مندر نقلی تھا، یہ اصلی ہے۔ ہزاروں سال تک ملتان میں سورج دیوتا کی پوجا ہوتی رہی، یہ تمام ہندوستان کا مذہبی مرکز بن گیا اور سورج و ستاروں کی پرستش عروج پر پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ معمولی صنعت کار بھی جب کوئی چیز بناتے تھے تو اس پر سورج اور ستاروں کو دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ قدیم قلعہ کی کھدائی سے جو برتن برآمد ہوئے ہیں ان سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔ عتیق فکری صاحب قدیم ملتانی حروف اور علم ہیئت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"علم ہیئت :☉: یہ علم کواکب میں آفتاب کی قدیم ترین علامت ہے اور جدید علم ہیئت میں اس طرح استعمال ہوتی ہے ☉ قدیم نقش کار نے دو قوسوں کے گرداگرد حلقہ نقاط سے آفتاب کی کرنوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، اسے مصوری کی سادہ شکل نہ سمجھئے بلکہ یوں سمجھئے کہ ملتان کے کمہاروں نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ جس طرح قوموں میں ستارہ پرستی رائج تھی اور جس ستارہ کو پوجا کرتے تھے یا جس قسم کی

فطرتی قوتوں کی نسبت ان کی طرف منسوب تھی۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے مٹی کے برتنوں پر نشان کھینچ دیتے۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں مشرقی لوگوں کا اعتقاد ستاروں پر بطورِ صفات خالق تھا۔ یعنی فلکی ستارے صفاتِ خداوندی کا حقیقی پرتو یا حقیقی مظہر خیال کئے جاتے تھے۔ ملتان کے سنالی حروف سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہاں کے لوگ اس علم میں خاصا درک رکھتے تھے۔ پاک و ہند میں علم نجوم کے ایسے ماہر دیکھنے میں آئے تھے کہ انگلیوں پر حساب لگا کر سورج اور چاند گرہن بتا دیتے تھے۔ غرض اہلِ ملتان نجوم وغیرہ میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔

ایک اور شہادت بھی ہمیں اس سلسلے میں مہیا ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ مصر سے ایک کتاب علم طب کی شائع ہوئی تھی۔ اس کا نام "رجوع الشیخ الی الصباح" تھا اس میں چند فلکی اثرات اور ان کے نقوش بھی دیئے ہیں۔ سب سے بڑی تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ نقش جو مصری کتاب میں تھے ان میں ملتان سے ملتے ہوئے نقش بھی تھے جن کا تعلق علم نجوم سے تھا، وہ نقش یہ ہیں

ان حروف کی تاثیر بھی کتاب مذکورہ میں بیان کی گئی تھی۔ ان حروف کے علاوہ کئی حروف اس کتاب میں موجود تھے۔ یہ حروف جن پر ہم نے نمبر دیئے ہیں ملتانی حروف سے ملتے ہیں۔

غرض ملتان سے نکلے ہوئے حروف میں سے سورج اور ستاروں وغیرہ کی علامتیں موجود ہیں ☼ یہ نشان بہت سی چیزوں کی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔ مرحوم وحید اختر کی رائے ہے کہ درمیان کا نقطہ سورج کی علامت

ہے اور دونوں قوسیں مل کر جو گول دائرہ کی صورت بناتی ہیں، عطارد، قمر اور مریخ وغیرہ کی علامت ہیں، جو سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں اور دیگر نقطے تمام ستاروں کی علامت ہیں۔" [1]

سُورج مندر سے سُورج دیوتا کا اخراج

۲۷۲ قم میں مہاراجہ اشوک تخت نشین ہوا۔ اس کی سلطنت کابل تک پھیلی ہوئی تھی اور ملتان ایک صوبے کی حیثیت سے اس کے تابع تھا۔ ۱۸۵ قم تک ملتان پر اس خاندان کا طوطی بولتا رہا۔ چونکہ مہاراجہ بُدھ مذہب کا زبردست پرچارک تھا۔ اس لئے اکثر لوگوں نے اس شاہی مذہب کو جو بہ نسبت ہندو دھرم کے زیادہ مفید تھا قبول کر لیا۔ نیاز فتح پوری "اسلامی ہند" میں لکھتے ہیں کہ اشوک نے سورج مندر سے سورج دیوتا کی مورتی ہٹا کر اس کی جگہ مہاتما بدھ کی مورتی رکھوا دی تھی اور اسی کی پوجا ہوتی تھی۔

عرب سیاحوں کے مشاہدات

ملتان میں جو عرب سیّاح آئے ہیں انہوں نے مختلف مندروں اور بُتوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر ایک بات سب میں مشترک ہے کہ ہر مورتی مہاتما بُدھ کی ہے۔ یعنی پالتی مارے، دونوں ہاتھ گھٹنے کی طرف لمبے کئے ہوئے انگلیاں ایسے کھلی ہوئیں، گویا وہ حساب کر رہا ہے۔ صرف ابنِ رستہ نے چوکھی مورتی کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] ملتان قدیم و جدید ص ۱۵ و ۱۶

ابن مہلہل کی شہادت

ابن مہلہل ۳۳۱ھ کے بعد ملتان میں آیا ہے۔ سورج مندر کی نسبت لکھتا ہے :-

"وہاں ایک بڑا قبہ ہے اور اسی کے نزدیک مسلمانوں کی جامع مسجد ہے یہ قبہ تین سو ہاتھ بلند اور بیس ہاتھ چوڑا ہے۔ قبہ کے ارد گرد خدام پجاریوں کے مکانات ہیں۔ وہ انسانی شکل کا اونچے چبوترے پر چار زانو بیٹھا ہے اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ہیں، اور سر پر سونے کا تاج ہے۔ آنکھوں میں دو لعل ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لکڑی کا ہے اور بعض کسی اور چیز کا بتاتے ہیں۔ سوائے آنکھوں کے باقی تمام بدن کو سرخ چمڑے جیسا لباس پہنا رکھا ہے اور انگلیاں اس طرح ہیں جیسا حساب کرنے والا ہتھیلی میں جمع کر لیتا ہے۔"

قبہ سے مراد سٹوپہ ہے، اور جامع مسجد وہی ہے جسے محمد بن قاسم نے تعمیر کرایا تھا۔

مقناطیسی مندر

ابن ندیم یعقوب بن اسحٰق کندی کے حوالے سے سورج مندر کے ایک ذیلی بت خانے کا ذکر کرتا ہے کہ یہ ان سات مندروں میں سے ایک ہے جو ہندوستان کے مختلف مقامات میں واقع ہیں۔ اس مندر میں لوہے کا ایک بُت ہے، جس کا طول سات ہاتھ ہے۔ یہ سٹوپہ کے بیچ میں معلق ہے کیونکہ اس کو چاروں طرف سے مقناطیس اپنی کشش میں لئے ہوئے ہے۔ یہ مندر

قلعے کی فصیل کے نیچے واقع ہے۔ اس کی بلندی ۱۸۰ ہاتھ ہے۔ ہندوستان سے عام یاتری خشکی اور تری ہر طرف سے اس کے درشنوں کے لیے آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا کہ لوگ اس کے درشنوں کے لئے نہ آئے ہوئے ہوں۔

درشنی مورتیاں

سورج مندر میں داخلی دروازے پر ایک اور مندر تھا۔ اس کے گیٹ پر دو عظیم بُت بنے ہوئے تھے جو سالم پتھر کے تھے اور ایک چٹان کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ اور تقریباً اسّی اسّی گز اونچے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام جنکبت اور دوسرے کا نام زنکبت تھا۔ یہ دونوں بُت دُور دُور سے نظر آتے تھے۔ گویا سُورج مندر کے پاسبان تھے۔ درشن کرنے والے جب باہر سے آتے تھے تو سب سے پہلے ان کی نظر ان دو بُتوں پر پڑتی تھی، اور دیکھتے ہی سجدے میں گر جاتے تھے۔ اس امر میں یہاں تک اہتمام تھا کہ اگر کوئی اتفاقاً سجدہ کرنا بھول گیا تو اس کا فرض تھا کہ واپس جائے اور اس مقام پر پہنچ کر جہاں سے یہ بت نظر آتے تھے سجدہ کر کے پھر ملتان میں داخل ہو۔

ابن ندیم نیز تحریر کرتا ہے کہ جب یاتری ان بتوں کے درشنوں کے لئے ملتان آتے ہیں تو ان کی خوشنودی کے لئے جانیں بھی قربان کی جاتی ہیں، اور یہ صرف ایک دو نہیں، دس بیس نہیں، بلکہ کبھی کبھی تو پچاس ہزار تک ان کی تعداد پہنچ جاتی ہے[1]۔

---

[1] الفہرست لابن ندیم صہ ۴۸۴ تا ۴۸۷ طبع مصر

ہمارے خیال میں یہ تعداد بہت زیادہ ہے۔ مولانا سید ابوظفر ندوی نے ابن ندیم کے حوالے سے لکھ دیا ہے، مگر اس پر کچھ تبصرہ نہیں کیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اتنی بڑی تعداد ایک ہی تقریب میں بُتوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہو۔

سورج مندر کا خاتمہ

سُورج مندر سے ملتان شہر کی عظمت وابستہ تھی۔ غازی محمد بن قاسم نے اسے صرف اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ ملتان شہر کی رونق اسی سے تھی۔[1] جلیم بن شیبان قرامطی نے ملتان پر قابض ہو کر ملتان کے اس قدیم مندر کو توڑ ڈالا جو فتح ملتان کے وقت سے آج تک محفوظ چلا آتا تھا اور جس کے باعث ملتان کے حکام کو سیاسی اور مالی فوائد حاصل ہوتے تھے۔ اس کی جگہ ایک جامع مسجد بنوائی اور محمد بن قاسم کی مسجد کو بنو امیہ کی یادگار قرار دے کر بند کرا دیا۔ یہ واقعہ ۳۷۵ھ کے قریب وقوع میں آیا۔[2]

اِس وقت وہ عظیم مندر جس سے موسوم ہو کر یہ شہر ملتان کہلایا، نابود ہو چکا ہے۔ ۷۳-۱۸۷۲ء میں جنرل کننگھم نے قلعے پر پرہلاد مندر کے قریب متعدد جگہ عمیق کھدائی کرائی۔ جہاں سے مختلف سطحوں پر مختلف سکّے برآمد ہوئے۔ جن کا زمانہ ۵۰۰ء پایا گیا۔ اور ان پر ادیتہ دیوتا کی تصویر منقش تھی۔ جس سے ادیتہ ستھان اور اس کی ہمہ گیر پرستش کی تصدیق بھی ہو گئی۔[3]

ملتان کے دُوسرے بُت خانے

سورج مندر کے علاوہ ملتان میں کئی اور مندر بھی تھے۔ جو ہندوؤں

---

[1] تاریخ سندھ از مولانا سید ابوظفر ندوی ص ۲۵۱ [2] کتاب الہند از البیرونی ص ۱۰۵ لیڈن [3] ملتان قدیم و جدید ص ۱۰

کے نزدیک بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ سوائے شیوجی کی چومکھی مورتی کے باقی تمام مورتیاں مندروں سے نکال دی گئیں اور ان کی جگہ مہاتما بدھ کے بت رکھ دیئے گئے۔ عرب سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں ان بتوں کا کچھ اس طرح سے ذکر کیا ہے جیسے وہ سورج دیوتا کے بت ہوں حالانکہ ان کا سورج دیوتا سے کچھ تعلق نہ تھا۔

ملتان کا دُوسرا عظیم معبد

شیوجی کا مندر

اس بت خانے کا ذکر ابن رستہ نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ یہ عرب سیاح تقریباً ۲۹۰ھ میں ملتان آیا۔ اُس وقت بنو سامہ کا خاندان حکمران تھا شیوجی کے مندر کو اس نے خود دیکھا۔ اور واقف کار لوگوں سے اس کے حالات معلوم کر کے اپنے سفرنامے میں درج کئے۔ مرحلہ وقوع درج نہیں کیا۔ اس لئے پتہ نہیں چلتا کہ یہ مندر قلعے میں تھا یا شہر میں۔ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی نے تاریخ سندھ میں اور جناب عتیق فکری صاحب نے اپنے مقالہ "ملتان کا سیاسی اور ثقافتی ارتقاء" میں ابن رستہ کی عبارت کا ترجمہ من وعن شائع کیا ہے۔ جو خاصہ دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ چونکہ مؤخر الذکر کی عبارت زیادہ سلیس اور عام فہم ہے ہم اسے ناظرین کرام کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کرتے ہیں۔

بت

"یہ بت آدمی کی شکل و صورت کا ہے۔ ایسے کمرے میں ہے جس کے اوپر

مضبوط چھت ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس کا بنانے والا کون ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دو ہزار سال پہلے کی تعمیر ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے۔ کہ یہ بُت آسمان سے اُترا ہے اور انہیں اس کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بُت کے کئی پجاری بھی ہیں جو اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور مصارف بُت کے چڑھاووں سے چلتے ہیں۔ یہ مصارف ان وظائف کے علاوہ ہیں جو ان پجاریوں کو ملتے ہیں اور جس سے وہ اپنے کھانے پینے کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ تمام ہندوستان سے ہندو اس بت کی یاترا کو آتے ہیں اور جب کوئی امیر آدمی مرنے لگتا ہے تو وہ بُت سے تقرّب حاصل کرنے کے لئے اپنا آدھا یا کل مال اس بُت کے نام وصیت کر جاتا ہے۔ لوگ سال بھر یا اس سے بھی زیادہ کی مسافت طے کر کے اس بُت کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور یہاں اپنا سر منڈواتے ہیں۔ بائیں جانب سے سات بار طواف کرتے ہیں۔ اور یہ سب بُت کے تقرب اور خوشنودی کے خیال سے کرتے ہیں۔ اس کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہیں۔ زمین پہ لوٹتے اور خشوع و خضوع کا اظہار کرتے ہیں۔ بُت کے چار چہرے ہیں۔ اس لئے آدمی جس طرف بھی رُخ کرے وہ اس کے سامنے ہی رہے گا غرض بُت کا ہر طرف چہرہ اور سامنا ہی ہے پشت نہیں ہے۔ جدھر دیکھو اس کا چہرہ تمہارے سامنے ہوگا اور وہ لوگ طواف کرتے ہوئے ہر ہر رُخ کی طرف مڑتے ہیں تو سجدہ کرتے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو اپنی آنکھیں نکال کر اس کی آستین میں رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

"اے بھگوان! میں نے تیری رضا جوئی کے لئے اپنی آنکھیں تیرے حضور میں پیش کی ہیں، پس میری عمر دراز کر، مجھے روزی دے، میرے یہ کام اور

نذرمنتیں پوری کر دے۔"

بعض ایسے لوگوں نے مجھے بتایا ہے، جنہوں نے بچشم خود ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو ایک ایک سال کی مسافت طے کرتے ہیں اور ان کے کندھوں پر سُرخ صندل کے دو اتنے بڑے بُوٹے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ہر بُوٹا ایک آدمی کے وزن کے برابر ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح لاتے ہیں کہ پہلے تین میل ایک ٹکڑا لاتے ہیں اور اسے یہاں رکھ کر واپس جاتے ہیں اور دُوسرے ٹکڑے کو اُٹھا لاتے ہیں۔ اور پھر اسے یہاں رکھ کر پہلے ٹکڑے کو اُٹھا کر آگے بڑھتے ہیں اور اسی طرح ٹکڑوں کو بالترتیب آگے پیچھے اُٹھا کر بُت کے پاس ملتان پہنچ جاتے ہیں۔

قربانی

بعض لوگ بُت سے اپنی جان بھینٹ چڑھانے کی اجازت طلب کرتے ہیں اور ایک لمبی لکڑی لے کر اس کا سرا انتہائی تیز اور نوکیلا بنا دیتے ہیں پھر اسے زمین پر گاڑ کر خود اس کے اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ لکڑی کا تیز اور نوکیلا سرا اپنے پیٹ میں چبھو دیتے ہیں کہ وہ پیٹھ سے باہر نکل آتا ہے اور اس طرح اپنی جان دے دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے بُت کی رضا جوئی اور قربت حاصل ہوئی ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے، جو بہت سامان و دولت از قسم نقد و جنس لا کر بُت کے سامنے رکھ دیتے اور کہتے۔ اے خداوند! میرا یہ حقیر نذرانہ قبول فرما۔

پجاری

اس بُت کے پجاری نہ عورتوں کے پاس جاتے ہیں، نہ گوشت کھاتے اور نہ کوئی جانور ذبح کرتے ہیں اور نہ گندے میلے کپڑے پہنتے ہیں۔ اور بتوں کے

حضور جاتے وقت خوشبو لگا لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرا شخص نہ تو بتوں کو خوشبو لگا سکتا ہے، اور نہ انہیں چھو سکتا ہے۔

جب لوگ بتوں کے حضور جاتے ہیں تو گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرتے ہیں کہ "ہماری طرف نظر کرم ہو، ہم پر رحم کیجیو!" روتے اور انتہائی عاجزی سے دعا مانگتے ہیں۔

باورچی خانہ

اس بت کا باورچی خانہ بھی ہے جس میں سفید بہترین قسم کے چاول اور بت کے لئے عمدہ مچھلیوں اور سبزیوں کے کھانے پکائے جاتے ہیں اور ان میں خوشبو ڈالی جاتی ہے۔

بت کھانا کھاتا ہے

جب کھانا تیار ہو جاتا ہے تو مندر کا بڑا پجاری بت کو کھانا کھلانے کے لئے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ کیلے کا لمبا چوڑا پتہ جس میں ایک دو آدمی لیپٹے جا سکیں بت کے سامنے بچھایا جاتا ہے اور اس پر نصف قد آدم کی بلندی سے چاول گرائے جاتے ہیں۔ بڑا پجاری کیلے کے پتے سے اس پر پنکھا کرتا ہے اور چاول کے بخارات بت کے چہرے تک جاتے ہیں۔ کھانا کھلانے سے پہلے بت کے کمرے کے گرد چنگ، طنبور اور ڈھول بجتے ہیں اور سو سو داسیاں جو اس کام کیلئے مخصوص ہوتی ہیں بت کے گرد رقص کرتی ہیں۔ پھر دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں جب چاولوں کے بخارات ختم ہو جاتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ بت نے چاول کھا لئے۔ پھر دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور کھانا جوں کا توں پڑا ہوتا ہے۔ بت کے سامنے سے اٹھا لیا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ بت کا پس انداز

ہے، اور اس نے خیرات کر دیا ہے۔ پھر یہ متبرک کھانا بُت کے پاس سے گزرنے والے انسان، جانور اور پرندے کھاتے ہیں۔ اور چڑیوں اور کتوں تک کو بھی روکا نہیں جاتا اور کہتے ہیں کہ یہ بُت کی روزمرہ کی خیرات ہے۔

بُت غسل کرتا ہے

بُت کو کبھی دودھ سے اور کبھی گھی سے غسل دیتے ہیں۔ پھر اس کے استعمال شدہ دودھ اور گھی سے مریضوں کو شفایابی کی غرض سے نہلاتے ہیں۔"[1]

بُت کے خدّام

بلاذری کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ سورج مندر اچھی خاصی کالونی تھی۔ مہنتوں، پجاریوں کے علاوہ ہزاروں خدام ایسے تھے جو بُت خانہ میں ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ جس وقت محمد بن قاسم نے شہر پر حملہ کیا، چھ ہزار خدام جنہیں منڈے کہتے تھے گرفتار ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس افراتفری کے عالم میں کافی تعداد مندر سے بھاگ بھی گئی ہو گی۔

مُرلیاں

مولانا عبدالحلیم شررؔ تاریخ سندھ میں ملتان کے اس عظیم الشان مندر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دستور تھا کہ سندھ کے عقیدتمند امراء اپنی پیاری بیٹیوں کو دیوتاؤں کی نذر کرنے میں اپنی عزّت خیال کرتے تھے۔ ہزارہا لڑکیاں ان بُتوں کے لئے وقف تھیں۔ جنسی تعلقات استوار کرنے میں وہ آزاد تھیں۔ یہ لڑکیاں مُرلیاں کہلاتی تھیں۔ ان کے لئے زنا عیب نہ تھا، بلکہ فخر سمجھ کر کرتی تھیں۔ ان کی زناکاری کی اُجرت پر مندر

---

[1] اخذ و اقتباس از ملتان قدیم و جدید ص ۳۵ تا ۳۸

کے اکثر خدام اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور در اصل یہ لڑکیاں مندر کی آمدنی کا ایک وسیع ذریعہ تھیں۔ یہ لڑکیاں آفتِ روزگار تھیں اور صدہا آدمی ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر اپنی صحت اور دولت کھو بیٹھتے تھے۔ محمد بن قاسم نے اس مندر کو تو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا صرف مُرلیوں کا رواج ختم کر دیا۔

طلسمی مورتیاں

اس مندر میں ایک جانب دو اور مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک سونے کی اور دُوسری چاندی کی تھی۔ اہل ہند کا اعتقاد تھا کہ ان مُورتیوں سے جو دُعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ مشہور یہ تھا کہ ان کے بنانے میں کسی طلسمی قوت سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ عام اعتقاد میں کوئی ان مورتیوں کو چھو نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی ان پر ہاتھ رکھ دیتا تو پتہ نہیں چلتا تھا۔ یعنی دیکھنے میں تو نظر آتی تھیں، مگر ہاتھ لگانے اور ٹٹولنے پر ان کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ گویا ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے وقت قوّتِ لامسہ سلب ہو جاتی تھی۔

سرد چشمہ

اس مندر کے متصل ایک چھوٹا سا چشمہ تھا، جس سے زنگاری رنگ کا پانی جاری رہتا تھا۔ وہ نہایت سرد ہوتا تھا، اور جو پتھر اس چشمے کے پاس تھے، ان کی نسبت عوام کو پختہ یقین تھا کہ یہ پتھر زخموں کے لئے اکسیر کی خاصیت رکھتے ہیں۔

راجہ جے بادین کا تعمیر کردہ سُورج مندر

قدیم زمانے میں جبکہ بنکوں کا رواج نہیں تھا، راجے، مہاراجے، امراء اور سلاطین وقت اپنے خزائن کو محفوظ کرنے کے لئے مختلف صُورتیں اختیار کرتے تھے۔ بعض مکانات کے مجوف شہتیروں میں، کئی چھتوں میں، کئی دیواروں میں اور کئی تہ خانوں میں اشرفیاں اور جواہرات چھپا کر رکھتے تھے اکبرِ اعظم کے زمانے میں چند قبروں سے بھی سونے کی اینٹیں برآمد ہوئیں۔ اسی طرح ہندوستان کے راجے مہاراجے مندر کی مورتیوں اور اس کے زیرِ زمین تہ خانوں میں خزائن دفن کرتے تھے۔ مسلم سلاطین، بالخصوص سلطان محمود غزنوی پر جو بُت شکنی کا الزام ہے، وہ بُت دراصل خزانوں [illegible] ہے۔ حملہ آور خزانے کو کب چھوڑتا ہے، خواہ وہ مسجد میں [illegible] یا مندر میں۔ راجوں نے مجوف بتوں کو اشرفیوں سے بھر رکھا تھا۔ سومنات میں جو حفاظتی فوج مقرر تھی وہ بتوں کے لئے نہیں بلکہ ان خزائن کے لئے تھی جو بتوں کی صورت میں منتقل کر دیئے گئے تھے۔ لیکن ایسے بُت جو پتھر کے تھے۔ جن کے مجوف ہونے کا گمان نہیں تھا، وہ صحیح سالم رہے۔ اور ہندوستان کے طول و عرض میں ایسے بے شمار مندر اور بُت صحیح حالت میں ملتے ہیں، خاص کر ایلورا کی غاروں میں جہاں شاہانِ ہند کا کئی بار گزر ہُوا، مگر کسی نے کسی بُت کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

ملتان کا عظیم بُت خانہ بھی دراصل ایک راجے کا بہت بڑا خزانہ تھا۔

بعد میں آنے والے راجے مہاراجے مختلف صورتوں میں اس خزانے میں اضافے کرتے رہے۔ اس مندر کی عظمت مذہبی طور پر مسلّم لیکن اس کی اتنی کڑی حفاظت کا راز محض وہ بے بہا خزانہ تھا جو بتوں میں، اور بتوں کے نیچے مدفون تھا۔ اس امر کا انکشاف اُس وقت ہوا جب غازی محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا۔

بلاذری کا بیان ہے کہ حجاج بن یوسف نے سندھ کی مہم کی تیاری کے وقت خلیفہ ولید بن عبد الملک سے اقرار کیا تھا کہ جتنا روپیہ خزانے کا اس مہم پہ خرچ ہوگا میں اس کا دگنا داخل کروں گا۔ اور اس کام کو میں اپنی ذمہ داری پر شروع کرتا ہوں۔ ملتان فتح کرنے پر جو روپیہ پیسہ غنیمت میں ملا، غازی محمد بن قاسم نے وہ اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ اب اُسے یہ فکر ہوئی کہ دار الخلافت کو روپیہ کہاں سے بھیجا جائے۔ وہ اسی تردّد میں تھا کہ اچانک ایک برہمن حاضر ہوا اور اس نے غازی سے مخاطب ہو کر کہا کہ اب جبکہ اسلام غالب آچکا ہے اور مندر و شوالے ویران ہوتے جارہے ہیں۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر اقبال مند ولی نعمت کی خدمت کروں۔

برہمن نے دست بستہ کہنا شروع کیا۔

اے فتح مند سردار! میں نے سُنا ہے کہ قدیم زمانے میں جے بادین ایک بہت بڑا راجہ ہو گزرا ہے۔ وہ کشمیر کے شاہی خاندان کی نسل سے تھا اور ذات کا برہمن تھا۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں اُسے دُنیا سے کچھ ایسی نفرت ہو گئی کہ ساری دولت و حشمت چھوڑ کر جوگی ہو گیا۔ وہ اپنے

مذہبی عقائد اور اعمال کا سختی سے پابند تھا۔ اس کے لیل و نہار زیادہ تر پوجا پاٹ میں گزرتے تھے۔ چونکہ اس میں دینی اور دُنیاوی دونوں طاقتیں جمع ہو گئی تھیں۔ اس لئے کسی راجے کو اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

جب ایک مدت تک اس راجے کی سلطنت میں امن و امان قائم رہا اور رعایا فارغ البالی سے ہمکنار رہی۔ تو خدا نے اس کے خزانے میں برکت دی۔ اور اس کے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی کہ ہندوستان کے کسی دُوسرے راجے مہاراجے کو نصیب نہ تھی۔ جب خزانہ بہت زیادہ ہو گیا تو راجے کو اس کے تحفظ کی فکر ہوئی۔ اس نے شہر کے مشرق کی طرف ایک حوض بنوایا۔ جس کا دَور سو گز کا تھا۔ پھر اس حوض کے اندر ایک خوبصورت مندر تعمیر کرایا، جو پچاس گز کے دَور میں تھا۔ اس مندر میں اس نے ایک کمرہ بنوایا۔ اور اس میں سونے کی خاک کے چالیس مسی مٹکے رکھوا دیئے، اور ان کے علاوہ دو سو تیس من سونا رکھوا کر اوپر سے پٹوا دیا۔ اس خزانہ پر ایک مندر ہے اور اس میں ایک مورت رکھی ہے۔ حوض کے گرداگرد راجہ نے درخت لگوا دیئے تھے، جو اس وقت تک بدستور قائم ہیں۔

برہمن کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی محمد بن قاسم باغ و بہار ہو گیا اُسی وقت اپنے احباب کو ہمراہ لے کر برہمن کے پیچھے پیچھے روانہ ہُوا۔ برہمن انہیں ایک مندر میں لے گیا جس میں گھپ اندھیرا تھا۔ صرف وہ لعل منوّر چمک چمک کر ایک عجیب قسم کی روشنی کر رہے تھے جو ایک مورتی کی آنکھوں میں نصب تھے۔

کہتے ہیں کہ محمد بن قاسم کو تاریکی میں اس مورت پر کسی زندہ انسان کا دھوکہ ہوا، چنانچہ اس نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور وار کرنے کو تھا کہ برہمن نے لپک کر روکا، اور عرض کیا۔ حضور یہی وہ بُت ہے جسے راجہ بادین نے بنوا کر اپنے خزانے کی چھت پر نصب کرایا تھا، اور خود دُنیا سے کوچ کر گیا۔

محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ مورت اپنی جگہ سے ہٹائی جائے۔ فوراً اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ مورت کے ہٹاتے ہی لوگوں کو خزانے کا دروازہ نظر آیا کل خزانہ نکلوا لیا گیا۔ دو سو تیس من سونا اور جو طلائی خاک تانبے کے مٹکوں سے برآمد ہوئی اس کا اندازہ کیا گیا تو تیرہ ہزار دو سو من نکلی۔ محمد بن قاسم نے اس سونے اور بُت کو خزانے میں داخل کرنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ مالِ غنیمت میں جتنے مروارید اور جواہرات ملے تھے وہ بھی داخلِ خزانہ کئے گئے۔

خزانہ کے ماسوا مندر کی اور تمام چیزیں اپنی جگہ بجنسہ رہنے دی گئیں۔ یہ مندر مدتوں تک قائم رہا اور دُور دُور سے لوگ اس کے درشن کو آیا کرتے تھے۔ اس مندر میں بھی راجہ اشوک نے تصرف کر کے پہلی مورتی کو نکال باہر کیا اور اس کی جگہ مہاتما بُدھ کو لا بٹھایا۔ علامہ بشاری اور اصطخری کے درج ذیل بیانات سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

علامہ بشاری مقدسی کا بیان

اِس بُت کا ذکر کرتے ہوئے علامہ بشاری لکھتے ہیں کہ :-

وہ بت خانہ جس سے خزانہ برآمد ہوا، مندر کا ہے کو تھا، ایک پُر شکوہ

قصر تھا۔ نہایت گنجان آبادی کے درمیان واقع تھا اور اس کا بلند گنبد آسمان سے باتیں کرتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ خوبصورت گنبد درمیان میں تھا۔ اور اس کے گرداگرد پجاریوں کے مکانات تھے۔ اس درمیانی گنبد میں ایک مرتفع چبوترے پر مورتی گویا چار زانو بیٹھی تھی۔ اسے سُرخ لباس پہنایا گیا تھا۔ سوائے آنکھوں کے اس مورتی کا کوئی حصّہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو جواہر جڑے تھے، جو چمک چمک کر گرد و پیش کو روشن کرتے تھے۔ اس مورتی کے سر پر سونے کا تاج تھا۔ مُٹھیاں کسی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ زانو پر دھرے تھے۔"

اصطخری کا مشاہدہ

اصطخری ملتان میں ۳۴۰ھ میں آتا ہے۔ وہ جس مندر کا ذکر کرتا ہے اس کا محل وقوع مندر جے بادین جیسا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ یہ بُت خانہ ایک شاندار محل ہے، جو ملتان کے بازار میں ایک بڑے آباد اور بارونق مقام پر ٹھٹھیروں اور ہاتھی دانت والے بازار کے درمیان تعمیر کیا گیا ہے محل کے وسط میں ایک گنبد ہے جس میں بُت نصب ہے۔ اس کے گرد پُجاریوں کے مکانات ہیں۔ یہ مُورتی انسانی شکل کی ہے اور اینٹ اور گچ کی مٹی سے بنی ہوئی ہے اور کرسی پر پالتی مارے بیٹھی ہوئی ہے۔ الخ

اِس عبارت سے ظاہر ہے کہ یہ وہی مندر ہے جس پر غازی محمد بن قاسم نے تصرف کیا تھا۔ جواہرات سے بھرا ہوا مجوف بت خزانے میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اور یہاں اسی شکل و صُورت کی خشت و آہک کی مورتی بنا دی گئی۔

اصطخری نیز لکھتا ہے کہ ملتان کا نام اس بُت کی وجہ سے پڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ راجہ جے بادین نے اپنے تعمیر کردہ مندر کو بھی سورج دیوتا کی

مورتی سے مزین کیا ہوگا اور ہندو اس کا بھی وہی احترام کرتے ہوں گے جو سورج مندر کا کیا جاتا ہوگا۔ دُوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ معبد جدید سورج مندر تھا۔ ایک راجہ سنبہ کا تعمیر کردہ تھا، اور دُوسرا راجہ جے بادین کا۔ ایک قلعے پر واقعہ تھا، دُوسرا شہر میں۔ مگر اکثر سیاحوں نے ان کے حالات اس طرح لکھے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس مندر کے حالات ہیں۔ بعد میں آنے والے اکثر مؤرخین نے ہر سیاح کے بیان سے قلعہ قدیم کا سورج مندر مراد لیا ہے حالانکہ ابن حوقل نے صاف لکھا ہے کہ یہ مندر ملتان کے پُر رونق حصے میں ہے جو ٹھٹھیروں اور ہاتھی دانت والے بازار کے درمیان واقع ہے۔

میگھستینز چوتھی صدی قبل مسیح میں آیا۔ اس وقت دونوں مندروں میں ادیتہ دیوتا کی مورتی نصب تھی، مگر ہیون تسانگ اور ان کے بعد آنے والے سیاحوں کے وقت بجائے سورج دیوتا کے مہاتما بُدھ کی مورتی جگہ لے چکی تھی۔ لیکن وہ سورج دیوتا ہی سمجھتے رہے۔

عرب مؤرخین میں سب سے پہلے ابوزید حسن سیرانی نے سورج مندر کا ذکر کیا ہے۔ یہ سیاح ۲۶۴ھ میں ملتان آیا تھا۔

ابن رستہ ۲۹۰ھ میں آیا۔ لیکن اس نے جو مورتی دیکھی تھی وہ شیوجی کی تھی۔ اصطخری ۳۴۰ھ میں اور ابن حوقل ۳۶۷ھ میں ملتان آئے ہیں۔ ان دونوں نے قلعہ کے قدیم سورج مندر کا حال لکھا ہے اور جو حلیہ مورتی کا دیا ہے، وہ مہاتما بدھ کا ہے۔

ابن جہلہل اور بشاری مقدسی نے جس مندر کا حال لکھا ہے وہ جے بادین کا تھا، مگر اس میں بھی مورتی بُدھ کی رکھی ہوئی تھی۔ زکریا قزوینی ۳۷۵ھ

کے بعد ملتان میں آیا۔ اس کے سامنے حلم بن شیبان قرامطی نے سورج مندر کو نذرِ آتش کرا دیا۔ چنانچہ جب بیرونی آیا تو اس نے ان مندروں کا نشان تک نہ پایا۔

مسلمان حکمرانوں میں سے کسی نے مندروں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ قرامطیوں کو مسلمان سمجھنا اور سورج مندر کی تباہی اور بربادی کا ذمہ دار مسلمان قوم کو ٹھہرانا واقعات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

لہ زکریا بن محمود قزوینی لکھتا ہے کہ "کوئی شخص اس بت کے لئے تاج اور انگشتانہ بطور نذر کے لایا۔ اس کے اندر روئی بھری ہوئی تھی، جو تیل سے تر کر لی گئی تھی۔ اس نے موقع پا کر آہستہ سے اس میں آگ لگا دی اور خود دُور جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس طرح وہ بُت جل گیا۔

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بت سنگین نہیں تھا، بلکہ لکڑی ہی کا تھا اور اسی سبب سے جلدی جل گیا۔ دُوسرا یہ کہ حلم بن شیبان نے غالباً فتنہ کے خیال سے علی الاعلان جلانا پسند نہ کیا۔ بلکہ کسی کو بھیج کر اس تدبیر سے جلوایا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ (تاریخ سندھ از مولانا سید ابوظفر ندوی صفحہ ۲۵۱)

معرکۂ حق و باطل

کہتے ہیں کہ ابھی طوفانِ نوحؑ کا پانی اچھی طرح سوکھا بھی نہ تھا کہ لوگوں نے خدائے واحد کو چھوڑ کر سورج کی پُوجا شروع کر دی۔ بابل اور ملتان میں "آدتیہ" دیوتا کے بڑے معبد تھے۔ اور لوگ بتوں کو پوجتے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں ملتان پر جو راجہ راج کرتا تھا۔ اس کا نام ہرنا کشپ تھا۔ اگرچہ ملتان اس کا مستقل پایۂ تخت تھا، مگر موسمِ گرما وہ کشمیر میں بسر کرتا تھا۔ جس کا نام اُس زمانے میں "ستی سر" تھا۔ طوفانِ نوحؑ کے بعد کشمیر کی وادی جھیل بن کر رہ گئی تھی۔ کیونکہ اس کی شکل پیالے جیسی تھی۔ اور پانی کے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ جو لوگ اِس جانب آئے، انہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہی بسیرا کرنا پڑا۔ چنانچہ ان پہاڑوں پر اب تک اس قسم کے نشانات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ گھاٹ کے موقعوں پر کشتیوں کو باندھنے کے لئے بڑے بڑے پتھروں میں چھید کئے گئے تھے۔ علاقہ شوپیان اور بعض دیگر مقامات میں ایسے سوراخ ملتے ہیں جو "ناؤ کے بندن" سے موسوم ہیں۔ جب تک وادیٔ کشمیر زیرِ آب رہی لوگ انہی کشتیوں پر سوار ہو کر اِدھر اُدھر سفر کرتے تھے۔

راجہ ہرنا کشپ موسمِ گرما میں جب، سیر و تفریح کے لئے اِس وادی میں گیا تو اس نے دیکھا کہ بارہ مولا کے مقام پر پہاڑ کی ایک بڑی چٹان نے ستی سر کے پانی کو روک رکھا ہے۔ راجہ نے چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیئے

چٹان کا کٹنا تھا کہ پانی کی بہت بڑی دھارا ملتان کی جانب بہہ نکلی۔ اور اس نواح کی زمین کو سیراب کرتی ہوئی چناب سے مل گئی۔ جب ستی سر کا پانی خشک ہو گیا، اور قابلِ کاشت زمین نکل آئی تو مہاراجہ نے اس وادی میں لوگ آباد کئے اور یہ جنّت نشان خطہ راجہ سے موسوم ہو کر کشپ میر اور پھر کشمیر کہلایا[1]۔ اسی طرح راجہ ہرناکشپ نے اپنی ریاست کے جنوبی حصے میں ایک شہر اپنے نام سے آباد کیا، جو اَب "کشموز" کہلاتا ہے۔

بارہ مولا کی چٹان کا کاٹنا عام آدمیوں کا کام نہیں تھا۔ اس لئے اس قابلِ فخر کارنامے نے راجہ ہرناکشپ کو کشمیریوں کی نظریں دیوتا بنا دیا اور جب جہلم کا پانی وادیٔ پنجاب کو سیراب کرتا ہُوا ملتان سے گزرا تو اہلِ ملتان کے دل میں بھی راجہ کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ اسے مافوق الفطرت ہستی خیال کرنے لگے۔

سُورج دیوتا

مسلسل کامیابیوں اور کامرانیوں نے ہرناکشپ کے قلب و دماغ میں یہ سودائے خام پیدا کر دیا کہ واقعی وہ عام انسانوں کی مانند نہیں ہے، بلکہ وہ دیوتاؤں جیسی طاقتوں کا مالک ہے۔ چنانچہ اس نے نہ صرف دیوتا ہونے کا دعویٰ کیا، بلکہ یہ کہا کہ وہ بارہ سورج دیوتاؤں کا باپ ہے۔ اُس نے اپنی شکل کا ایک طلائی بُت تیار کرایا، اور لوگوں کو اس کی پُوجا کا حکم دیا۔ اکثر لوگ فوراً جُھک گئے، مگر جن کا ضمیر زندہ تھا

[1] راہنمائے کشمیر از مولانا محمد دین صاحب فوق صہ ۶۱ تا ۶۴

انہوں نے انکار کر دیا۔ ہزاروں آدمی قید ہوئے اور بے شمار موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

پرہلاد بھگت

راجکمار پرہلاد راجہ ہرناکشپ کا سب سے چھوٹا بچہ تھا۔ یہ پاٹھ شالہ پڑھنے جایا کرتا تھا۔ راستے میں کمہار کا آوا پڑتا تھا۔ ایک دن جب وہ یہاں سے گزرا اُس نے دیکھا کہ کمہار بھٹی کھول کر برتن نکال رہے ہیں۔ پرہلاد تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا۔ دفعتًہ جب کمہاروں نے درمیانی برتن نکالا تو اس میں سے ایک بلی اور اس کے بچے برآمد ہوئے۔ پرہلاد بڑا حیران ہوُا کہ تین دن تک بھٹی برابر جلتی رہی پھر یہ بلی اور اس کے بچے کیسے بچ گئے۔ اس کے دل میں یہ خیال پختہ ہوگیا کہ مہاراج ہرناکشپ کے سوا کوئی اور طاقت ضرور موجود ہے، جو اپنی مخلوق کی اس طرح حفاظت کرتی ہے۔ اس نے پاٹھ شالے جاکر اپنے گرُو سے یہ ماجرا بیان کیا مگر وہ ٹال گئے۔ پھر یہ ہونہار بچہ محل میں واپس آیا اور مہاراج سے برملا کہہ دیا کہ آپ خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔ خدا تو وہ ہے جس نے کمہار کی بھٹی میں بلی اور اس کے بچوں کو جلنے سے بچایا ہے۔ راجہ سخت جھنجھلایا، اس نے حکم دیا کہ اس گستاخ کو قلعہ کی فصیل سے نیچے گرا دیا جائے۔ نوکر چاکر راجکمار کو پکڑکر قلعہ کی بلند و بالا فصیل پر لے گئے اور اسے وہاں سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن حافظ حقیقی نے اس معصوم مؤحد کو بال بال بچا لیا۔ گرم تیل کے کڑھاؤ میں پھینکوایا، مگر اسے کچھ آنچ نہ آئی۔ دریا میں غرق کرنے کی

کوششیں کی گئیں، مگر بے سُود۔ راجہ کی بہن رانی ہولکا جو راجہ کی ہمخیال تھی، اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ریاضت کر کے آگ کو مسخّر کر چکی ہے، وہ اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ راجکمار پرہلاد کو گود میں لے کر چتا پر بیٹھی۔ فضلِ ایزدی سے پرہلاد تو صحیح سالم بچ نکلا مگر رانی ہولکا جل بھسم کر راکھ ہو گئی۔ چنانچہ اس عبرتناک واقعہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہندو اب تک ہولی کا تہوار مناتے ہیں اور وہ مقام جہاں پر پرہلاد کو جلانے کی کوشش کی گئی تھی، ایک مختصر سے کمرے کی شکل میں اب تک موجود ہے۔

راجہ کو جب اس دفعہ بھی کامیابی نہ ہوئی تو وہ بوکھلا اُٹھا۔ اُس نے حکم دیا کہ لوہے کے ستون کو آگ سے گرم کر کے پرہلاد کو اس سے باندھ دیا جائے۔ چنانچہ سارا دن یہ ستون گرم ہوتا رہا اور شام کو جب پرہلاد کو اس ستون سے باندھنے لگے تو وہ شق ہو گیا اور اس میں سے وشنو جی شیر نر کی شکل میں ظاہر ہوئے اور راجے کو اپنے گھٹنوں میں دبا کر مار ڈالا۔ اُس روز سے راجکمار پرہلاد "پرہلاد بھگت" کے نام سے مشہور ہوئے، اور ایک مندر آپ کی یادگار کے طور پر تعمیر ہوا جو اب تک پرانے قلعے پر موجود ہے۔

پرہلاد نگر

ہرناکشپ کے خاتمے کے ساتھ ہی سورج دیوتا کی پوجا بھی بند ہو گئی پرہلاد جی کی تعلیم کے مطابق اہلِ ملتان خالصتہً خدائے واحد کی پرستش کرنے لگے اور کشپ پور کا نام بھی پرہلاد نگر پڑ گیا۔ اگر بعد میں ملتان نے

کئی نام اختیار کیئے، مگر اس نام کو اس نے کبھی فراموش نہ کیا۔ اب بھی متھرا اور کانشی کی طرف ہندو رشی اسے پرہلاد نگری کہتے ہیں[1]۔

دو صدیوں تک ملتان پر اہلِ توحید کا غلبہ رہا، مگر جب پرہلاد کا پوتا باتا گدی پر بیٹھا تو اس کے حریف راجہ سبنہ نے اُسے شکست دے کر ملتان پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کا نام بھی اپنے نام پر سنب پور رکھا سورج کی پوجا کو جو پرہلاد کے دور میں ختم ہو گئی تھی دوبارہ رائج کیا۔ اُس نے "آدیتہ" کے نام سے سورج دیوتا کا ایک خوبصورت بُت بنوایا اور اسے جلوس کی صورت میں لے جاکر آدیتہ استھان نامی مندر میں رکھوا دیا۔ یہی بُت بعد میں مولا استھان کے نام سے مشہور ہُوا۔

---

[1] پرہلاد مندر کی حیثیت ہر زمانے میں ہندو یونیورسٹی کی رہی ہے۔ دُور دُور سے ہندو طالبانِ علم و ادب ملتان آکر اس عظیم درس گاہ سے تحصیلِ علم کرتے تھے۔ اس یونیورسٹی نے بڑے بڑے ودیادان پیدا کیئے۔ یہاں تک کہ ایک محقق کا خیال ہے کہ منو جی بھی اس درس گاہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ مَنّاں بھگت کے نام سے برلب چناب جو استھان واقع ہے۔ اُسی میں منو جی نے "شاستر" مدوّن کئے تھے۔

جب شیخ الہند معین الدین اجمیری علیہ الرحمۃ لاہور سے اجمیر کے ارادہ سے روانہ ہونے لگے تو خواب میں حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ نے آپ سے فرمایا کہ پہلے آپ ملتان جاکر سنسکرت کی تعلیم حاصل کریں، پھر منزلِ مقصود کو روانہ ہوں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند نے پانچسال ملتان میں قیام کر کے سنسکرت کا علم حاصل کیا اور پھر اپنے احباب کے ہمراہ اجمیر کو روانہ ہوئے اندازہ یہی ہے کہ حضرت نے پرہلاد یونیورسٹی سے ہی استفادہ کیا ہوگا۔

مُلتان کا عہدِ قدیم

آج سے ہزاروں سال پہلے ایک اور قوم پہاڑی دروں سے گزر کر وادیٔ سندھ میں داخل ہوئی۔ یہ لوگ آرین تھے اور وسطِ ایشیا سے اپنے جانوروں کے لئے چراگاہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ آرین وادیٔ سندھ کے اصل باشندوں سے مقابلتاً قدآور، بہادر اور جفاکش تھے۔ انہوں نے اصل باشندوں کو لڑ جھگڑ کر جنوبی دکن کی طرف دھکیل دیا، اور خود پنجاب اور گنگا جمنا کے زرخیز میدانوں سے گزر کر بنگال تک پھیل گئے۔ افسوس ہے کہ اس عہد کے بارے میں ہمارے پاس کوئی مستند مواد نہیں ہے۔ ہندوؤں نے اپنے ملک کی خاطر سب کچھ کیا مگر وہ اس کی تاریخ مدوّن نہ کر سکے۔ گمنام قوموں کے حالات کا اتہ پتہ بھی مل جاتا ہے، مگر ہندوؤں سے متعلق ہمیں ایسے کتبے بھی کم ملتے ہیں جن پر سے قدامت کا غبار ہٹا کر کوئی تحقیقی بات معلوم کی جا سکے۔ پہلے تو اس قوم نے اپنی تاریخ مدوّن کرانے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ اور اگر تھوڑے بہت واقعات بتانے کی کوشش ہوئی بھی ہے تو ان پر شاعرانہ مبالغوں اور اپنے مذہبی معتقدات کا رنگ روغن چڑھا کر دیو مالا بنا دیا گیا ہے۔ رامائن اور مہابھارت اگرچہ ایک محدود زمانے کی عکاسی کرتی ہیں مگر انہیں حکایت و روایت سے زیادہ درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ بایں ہمہ ہم ان پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ سوائے ان کے ہمارے پاس اس دور کا اور کوئی ماخذ نہیں ہے۔

راجہ اسواپتی

رامائن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جن دنوں اجودھیا پر راجہ دشرتھ راج کرتا تھا۔ سندھ کی وادی "کیکیا" نام ایک سلطنت کے زیر نگیں تھی۔ راجہ دشرتھ کی حسین وجمیل رانی، جس کی تریا ہٹ نے رام چندرجی کو چودہ سال کے لئے بن باس لینے پر مجبور کر دیا تھا اسی ملک کے راجہ کی بہن تھی اور اسی وجہ سے کیکئی یعنی ملک کیکیا والی کہلاتی تھی۔ دوسرے معنوں میں یوں سمجھئے کہ اُن دنوں ملتان اور اس کے ملحقات پر راجہ دشرتھ کے نسبتی بھائی کی حکومت تھی۔ اس راجے کا نام اسواپتی بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہی نام مہابھارت میں بھی ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ اس مملکت کا ہر راجہ اسواپتی کہلاتا تھا۔ یعنی گھوڑوں کا مالک، لامحالہ یہ ملک گھوڑوں کی کثرت اور عمدگی کی وجہ سے مشہور ہوگا اور اب بھی پنجاب کے گھوڑے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ "نگر" کے علاقے میں تانبے کی ایک تختی برآمد ہوئی ہے۔ اس کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ اسواپتی کو ہستناپور کے مہاراجہ جناجیا نے قتل کیا تھا۔ اس تختی میں علمِ نجوم کی رو سے جو زمانہ بتایا گیا ہے اگر اس کا حساب لگایا جائے تو یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ۲۹۹۰ برس پیشتر کا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں وادیٔ سندھ کا راجہ جس کی مملکت میں ملتان بھی شامل تھا، اتنا زبردست تھا کہ اسے شکست دینے میں پانڈو خاندان بھی فخر محسوس کرتا تھا۔

ملتان اور اس کے ملحقات کو رانی کیکئی سے جو تقرّب حاصل ہے

اس کا ثبوت رام چوترہ اور مندر رام تیرتھ سے ملتا ہے۔ عام طور پر مشہور یہ ہے کہ مہاراجہ رام چندر جی بحالتِ بن باس اس جانب تشریف لائے تھے۔ مگر یہ امر قرینِ قیاس نہیں کیونکہ بن باس کے دوران رامچندر جی کا سارا وقت جنوبی ہند میں گزرا ہے۔ اغلب گمان یہ ہے کہ مہاراجہ رام چندر جی رانی سیتا سے شادی کرنے کے بعد بغرضِ سیر و تفریح اپنی چھوٹی ماں کے وطن میں تشریف لے آئے ہوں گے۔ رام چوترہ اور بالخصوص مندر رام تیرتھ اس امر کا بڑا ثبوت ہے کہ ملتان ہی رانی کیکئی کے باپ کا دارالسلطنت تھا۔ کیونکہ کشمیر اور شمالی پنجاب میں کوئی مقام ایسا نہیں ملتا، جہاں مہاراجہ رام چندر کا جانا ثابت ہو۔ یا کوئی مقام ان سے موسوم ہو۔ یہ شرف صرف ملتان کی پوتر بھومی کو ہی حاصل ہے۔

مندر رام چوترہ

یہ مقام سرائے سدھو سے شمال مشرق کی جانب دریائے راوی کے پار واقع ہے اور اس کے محاذ میں دریا کے اس پار لچھمن چوترہ ہے۔ اور اس مقام سے آٹھ میل مشرق کو سیتا کنڈ واقع ہے۔ دریا سیتا کنڈ سے رام چوترہ تک تیر کی طرح سیدھا بہتا ہے۔ ہزاروں سال سے یہ صورتِ حال چلی آتی ہے۔ اور دریا نے کبھی ان دو مقامات کے درمیان بے اعتدالی نہیں کی۔ آج بھی سیتا کنڈ سے رام چوترہ نظر آتا ہے۔ حالانکہ ان کے مابین آٹھ میلوں کا فاصلہ ہے۔

بیان کرتے ہیں کہ مہاراجہ رام چندر اپنی اہلیہ محترمہ رانی سیتا اور پیارے بھائی لچھمن کے ہمراہ بغرض سیر و تفریح تشریف لائے تو ان

سب نے سیتا کنڈ کے مقام پر قیام کیا۔ پھر رام چندر اور لچھمن جی دونو کپڑے اتار اشنان کی غرض سے دریا میں کود پڑے۔ اور نہاتے تیرتے سیتا جی سے آٹھ میل دور چلے آئے۔ مگر مہارانی سیتا برابر انہیں دیکھتی رہی۔ اور یہ بھی پیچھے مڑ کر رانی کو دیکھ لیتے تھے۔ جب اس مقام پر پہنچے جو اب اُن کے نام سے مشہور ہے تو مہاراجہ رام چندر دریا سے نکل کر ایک اونچی جگہ پر عبادت میں مصروف ہو گئے اور لچھمن دریا کے اس پار ان کے عین سامنے ایک چبوترے پر بیٹھ کر پوجا کرنے لگے۔

ہندوؤں کا بیان ہے کہ پہلے دریا سیدھا نہیں بہتا تھا۔ رامچندر جی مہاراج کے اشنان اور سیتا جی کی توجہ سے سیدھا ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ جب رام چندر دس میل مغرب کو نکل آئے اور انہیں سیتا جی کا خیال آیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر سیتا جی کو دیکھا۔ ان کے دیکھنے سے تمام حجابات ہٹ گئے اور دریا تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ اِن تینوں مقامات پر مندر بنے ہوئے ہیں اور درمیانی دس میل میں دریا کے دونوں جانب کھجور، بڑ اور شیشم کے گھنے درخت ہیں۔ بساکھی کے موقع پر یہاں پر زبردست میلہ لگتا تھا، جس میں ہزاروں ہندو شرکت کرتے تھے۔

مندر رام تیرتھ

یہ مندر ملتان شہر سے بجانب شرق ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اب شہر کی حدود میں آگیا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ مہاراج رام چندر جب ملتان تشریف لائے تھے تو انہوں نے اس جگہ قیام فرمایا تھا اور انہوں نے یادگار کے طور پر ایک تالاب بنوایا اور اعلان کیا کہ جو شخص

اس تالاب میں نہائے گا۔ اسے تیرتھ اشنان کا ثواب ملے گا۔ انتقالِ آبادی سے پہلے بھادوں میں پورنماشی کے موقع پر یہاں ایک زبردست میلہ لگتا تھا، جس میں ملتان شہر کے تمام ہندو شرکت کرتے تھے۔

یہ مندر اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مہاراج رام چندر جی اپنی رانی اور بھائی کے ہمراہ دریائے راوی کے راستے ملتان تشریف لائے انہوں نے ملتان شہر کے باہر کھلی جگہ کو اپنی رہائش کے لئے پسند کیا، اور راوی کے کنارے ایک مینو سواد مقام میں قیام فرمایا۔ اِن تاریخی شواہد سے یہ گمان یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ رانی کیکئی کی جنم بھومی ملتان تھا۔

لاہور اور قصور کی وجہ تسمیہ

صرف مہاراج رام ہی نہیں، بلکہ ان کے راجکماروں کا بھی اِس جانب آنا ثابت ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رانی سیتا کے حادثہ فاجعہ کے بعد نہ صرف یہ کہ مہاراجہ رام چندر کی زندگی تلخ ہو گئی، بلکہ ان کے صاحبزادوں نے بھی اس ملک میں رہنا گوارا نہ کیا جہاں ان کی والدہ پر ایسی صبر آزما ساعتیں گزری تھیں۔ وہ پنجاب کی طرف منتقل ہو آئے۔ راجکمار لَو نے دریائے راوی کے کنارے اس جگہ قیام کیا جو اب ان کے نام پر لاہور مشہور ہے۔ اس کا اصل نام لوہور تھا۔ پُرانے تذکروں میں لوہور ہی ملتا ہے۔

دُوسرے راجکمار نے دریائے ستلج کے کنارے استھان بنایا جو ان کے نام پر پہلے "کش ہور"، پھر "کشہور" اور بعد میں "قصور" مشہور ہُوا۔

مید اور جاٹ

اسواپتی کے بعد وادئ پنجند میں مید اور جاٹ نام کی دو قوموں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دونوں قومیں بڑی بہادر اور جنگجو تھیں، اور دریائے سندھ کے کناروں پر آباد تھیں۔ موجودہ علم فیلالوجی اور انسانی خدوخال کی بصیرت سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دونوں وہی وحشی اور غارت گر قومیں ہیں جنہوں نے آرین کی نقل مکانی سے پہلے مختلف ملکوں میں تباہی مچا رکھی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ مید اسی مشہور قوم سے تعلق رکھتے ہوں جس نے اسیریا کی سلطنت سے پہلے وادئ فرات میں میدیا کی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ مید اور جاٹ دونوں ایک دوسرے کے زبردست حریف تھے اور ان میں ہمیشہ خوفناک جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب یہ سلسلہ طول اختیار کر گیا تو آئے دن کی لڑائیوں سے تنگ آکر انہوں نے اپنے وکیلوں کو راجہ دریودھن کے پاس دہلی بھیجا اور درخواست کی کہ ہم لوگ آپ کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ آپ اپنی طرف سے کوئی نائب بھیجیں، جو ہم پر حکومت کرے[1]

رانی دھسلہ کی حکومت

راجہ دریودھن نے اپنی شیر دل بہن رانی دھسلہ کو جو راجہ جیدارتھ کی رانی تھی، اپنا نائب مقرر کر کے وادئ سندھ کی طرف روانہ کیا۔ اس نے اپنا پایۂ تخت اُچ اور ملتان کے درمیان ایک شہر کو مقرر کیا جو بعد میں اسکلندہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس عظیم شہر کے کھنڈرات موضع ٹھٹھہ گھلواں

---

[1] اسلامی ہند از نیاز فتح پوری۔ حاشیہ ص ۳۷

تحصیل شجاع آباد میں ملتے ہیں۔ جو دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ چونکہ اس ملک میں تعلیم کی کمی تھی۔ اس لیے رانی نے اپنے بھائی کو خط لکھ کر تیس ہزار برہمن[۱] مع مال و اسباب درآمد کیے۔ جس سے ملک کے گوشے گوشے میں درس تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ بڑی اچھی حکومت تھی جو کم و بیش بیس سال تک رہی، مگر کوروں کی شکست سے یہ مُلک بھی اثر لیے بغیر نہ رہا اور برہمن نام ایک برہمن نہ صرف ملتان اور سندھ بلکہ پورے برِصغیر پاک و ہند پر قابض ہو گیا۔ اُس نے تمام پانڈوؤں کو نیست و نابود کر دیا اور ایک زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کی اولاد سے تقریباً پندرہ راجوں نے اس برصغیر پر حکومت کی، لیکن انجام کار اپنے ظلم و ستم کی پاداش میں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔

۱؎ اسلامی ہند از نیاز فتحپوری۔ حاشیہ بحوالہ مجمل التواریخ ص۳۷

ایرانی حملے

پانڈووں سے ایرانیوں کے حملے تک ملتان کی تاریخ خاموش ہے۔ وقت کے دبیز پردوں نے خدا معلوم کتنے قہرمان تاجداروں کی سطوت و شوکت کو اپنی آغوش میں چھپا رکھا ہے۔ ایرانی تاریخ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ جب شہنشاہ گشتاسپ کے بہادر جرنیل بہمن نے وادیٔ پنجاب پر حملہ کیا ان دنوں یہاں راجہ کفند کی حکومت تھی۔ اس نے ایرانی افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور نہ صرف اپنے مقبوضات کو ایرانی دست برد سے بچا لیا، بلکہ سیوستان تک کے وسیع علاقے کو چھین کر اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ اس کے بعد راجہ ایند گدی پر بیٹھا۔ اس کے زمانے میں ملتان ریاست اسکلندہ کا بہت بڑا شہر تھا۔

اسکلندہ ملتان سے پچاس میل جنوب کو واقع تھا۔ اس کے جنوب میں بانبیہ اور بھاٹیہ کے شہر آباد تھے۔ راجہ ایند کے بعد اس کا بیٹا راجہ راسل تخت پر بیٹھا، لیکن ابھی اسے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایک زبردست غنیم نے حملہ کر کے اس سے راج پاٹ چھین لیا، مگر اس کا بیٹا راجکمار برکمارِیس بڑا صاحبِ اقبال اور بخت بیدار ثابت ہوا۔ اس نے نہ صرف باپ کے مقبوضات دشمن سے واپس لئے، بلکہ تمام ہند کا مطلق العنان فرمانروا بن بیٹھا۔

اسائرس کا حملہ

سید محمد لطیف پنجاب کی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ مصریوں کا بادشاہ جیسے

عہدِ عتیق کے مؤرخ اسائرس بھی کہتے ہیں۔ عرب اور یمن کو پامال کرتا ہوا وادیٔ پنجاب پر حملہ آور ہوا، اور دریائے گنگا تک بغیر کسی مزاحمت کے بڑھتا چلا گیا۔ اس نے برصغیر ہند کی ترقی کے لئے بڑا کام کیا۔ اس نے ہندوؤں کو تہذیب اور شائستگی سکھائی۔ زراعت اور فنونِ جنگ کے نئے طریقوں سے آگاہ کیا۔ بونے جوتنے کی نئی نئی تدبیریں بتائیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے اور بطورِ دیوتا اس کی پوجا کرنے لگے۔ وہ تو تین سال رہ کر واپس چلا گیا مگر یہاں اپنے اخلاقِ فاضلہ کی مستقل یادگار چھوڑ گیا۔

ایشور ــــ گائے کی پوجا

محققین کا خیال ہے کہ ہندوؤں میں ایشور کے نام سے جو دیوتا مشہور ہے اُس سے یہی مصری شہنشاہ مراد ہے۔ کیونکہ عوام میں اسائرس سے ایسور اور ایسور سے ایشور مشہور ہو گیا تھا۔ نیز گائے کی پوجا بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ کیونکہ مصر میں ہی سامری نے گوسالہ پرستی کی بنیاد رکھی تھی۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے اِس ملک میں بھی بہت سے گئو شالے موجود تھے۔ بھارت میں ایسا کونسا شہر ہے جس میں گئو شالہ نہ ہو۔

مصریوں کا دُوسرا حملہ

مصریوں کا دُوسرا حملہ فرعون سیاسترلیس نے کیا۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی فاتح مصر سے گنگا کی زمین تک پامال کر ڈالے، لیکن ملتان اور اس کے مضافات اس سے متاثر نہ ہوں۔ مصریوں کے بعد اہلِ بابل اور اہلِ تاتار نے اِس سرزمین کو جولانگاہ بنایا۔ شاہنامہ کے مندرجات سے پتہ چلتا ہے کہ دارائے ایران فریدوں نے پنجاب پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ ملک تقریباً ۵۲۹ ق م تک ایرانیوں کے قبضہ میں رہا۔

سورج دیوتا

سلطان محمود غزنوی

سکندرِ اعظم

ملتان اور اس کے مضافات پر سکندرِ اعظم کا حملہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے اور اس کی تفصیلات بھی یونانی مؤرخین کے طفیل میسّر آسکتی ہیں۔ اس دَور میں پہنچ کر مؤرخ یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ گویا حکایات و روایات اور افسون و افسانہ کی وادی سے گزر کر اب تاریخ کی دُنیا میں داخل ہُوا ہے۔ سرزمینِ پاک اُن دنوں اپنے تموّل کے سبب دُنیا میں مشہور تھی اور لوگ اسے "سونے کی چڑیا" کہتے تھے۔ سوداگر لوگ جب پاک و ہند سے مالِ تجارت لے کر مغربی ممالک میں پہنچتے تو اس سرزمین کے قصّے کچھ اِس انداز سے بیان کرتے کہ مغربی بادشاہوں کو اس ملک پر حملہ کرنے کا شوق دامنگیر ہوتا۔ خدا معلوم کتنے تاجدار یہ شوق اپنی قبروں میں لے گئے، اور کتنے جنگ کا خاکہ بناتے بناتے رہ گئے۔ یہ کھچڑی عرصے تک مغرب کی بساطِ سیاست پر پکتی رہی۔ انجام کار یونان کے ایک بلند اقبال تاجدار کو اس کی اولوالعزمی سونے چاندی اور جواہرات کی اس سرزمین میں لے آئی۔ یہ بہادر کجکلاہ سکندرِ اعظم تھا۔ جو ۳۲۵ سال قبل مسیح میں مقدونیہ کے افق سے طوفان کی طرح اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب کے مطلع سیاست پر چھا گیا۔ اس کی عالی ہمّتی اور عسکری طاقت کے آگے جب دارائے ایران نہ ٹھہر سکا، کابل اور پنجاب کے حکمرانوں کی کیا بساط تھی۔ ٹیکسلا کے راجہ نے جب سکندر کی آمد آمد سنی تو آگے بڑھ کر بمقام کابل فاتح ایران کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ یہاں سے سکندر راجہ پورس کی طرف بڑھا اور دریائے جہلم کے غربی کنارے پر خیمہ زن ہو گیا۔

راجہ پورس سے جنگ

دریا کے دُوسری جانب پورس نے ہاتھیوں کا ایسا زنجیرہ قائم کیا کہ وہ سب کے سب یونانی لشکر کی طرف مُنہ کئے کھڑے تھے۔ سکندر نے جب دیکھا کہ اس طرف سے دریا عبور کرنا مشکل ہے۔ تو اُس نے دُوسری جگہ سے دریا پار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ایک رات جبکہ شدید طوفان سے آسمان دُھواں دھار ہو رہا تھا اور ہر طرف کاجل سی سیاہی پھیلی ہوئی تھی سکندر نے فوج کا کچھ حصہ اپنے ساتھ لیا اور چودہ میل کا چکر کاٹ، جہلم کو عبور کر کے قضائے مبرم کی طرح پورس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ ایک یونانی سکندر کے دریا عبور کرنے کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

اتفاق کی بات ہے ایک روز رات کو طوفان آیا۔ تاریکی اتنی بڑھ گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سکندر نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور چپ چاپ فوج کا ایک حِصہ اپنے ساتھ لیا اور کنارے کنارے دُور جا کر ایک مقام پر کشتیاں دریا میں ڈال دیں۔ ہر چند طوفان سے جہلم اُبلا پڑتا تھا، لیکن یہ جوں توں کر کے دریا کے درمیان ایک ٹاپو میں پہنچ گیا۔ اُس وقت طوفان کا وہ زور ہُوا کہ بہادروں کے دل بھی دہل گئے۔ بادل یوں گرج رہے تھے، گویا لاکھوں توپیں ایک ساتھ چھوٹ رہی ہوں۔ مینہہ دھائیں دھائیں پڑ رہا تھا۔ زنّاٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ چڑھا ہُوا دریا شائیں شائیں بہہ رہا تھا۔ لیکن سکندر نے حوصلہ نہ ہارا، اور پھر فوج کو لے کر دریا میں اُتر آیا کشتیاں ڈانواں ڈول ہو رہی تھیں مگر یہ ہمّت کا دھنی گھٹا ٹوپ اندھیرے اور طوفان کے جوش و خروش میں اپنے ساتھیوں کو ساتھ لئے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ کنارے کی زمین ایسی نرم اور پھسلواں ہو رہی تھی کہ قدم جمائے نہ جمتے تھے۔ اُس وقت سکندر کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ میرے یونانی رفیقو! تمہیں کس طرح یقین آئے گا، کہ

میں تمہاری داد حاصل کرنے کے لئے کیسی جان جوکھوں سے گزر رہا ہوں۔

جنگ

پورس کی فوج کے درمیانی حصے میں سامنے کے رُخ ہاتھی بڑھے چلے آرہے تھے سکندر نے سوچا، ہاتھیوں سے نبٹنا مشکل ہے، چنانچہ اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا کہ ہاتھیوں سے بچ کر ایک دائیں طرف سے دھاوا بولے اور دوسری بائیں طرف سے۔ جسٹینس لکھتا ہے کہ

جب پورس نے یونانی لشکر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس نے اپنی فوج کو دشمن لشکر پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور سکندر کو مقابلے کے لئے للکارا۔ سکندر نے لڑائی میں شرکت کرنے میں پھرتی کی اور کوئی وقت ضائع نہ ہونے دیا۔ جنگ کے دوران اس کا گھوڑا تیروں کی بارش سے زخمی ہو گیا جس پر سکندر سر کے بل نیچے گر پڑا، لیکن محافظین جلد امداد کو پہنچ گئے اور وہ بچ گیا۔

اب سکندر نے پورس کی فوج کے بائیں حصے پر حملہ کیا۔ اور کوئنوز کو حکم دیا کہ وہ اس کے خلاف دائیں پہلو پر حملہ کرے۔ اس طرح فوج کے دونوں بازو توڑ دیئے گئے اور پورس کا لشکر اپنی جگہ سے ہٹ کر قلب میں آکر جمع ہو گیا جہاں ہاتھی کھڑے کئے گئے تھے۔ اور اب ایسی خوفناک دست بدست لڑائی شروع ہوئی کہ جہلم کا کنارہ میدانِ حشر کا نمونہ بن گیا۔ ہتھیاروں کی چمک سے آنکھیں مچی جاتی تھیں لڑنے اور مرنے والوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بے بس ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ زخمی اور بے تاب گھوڑوں کی ہنہناہٹ نے شورِ قیامت برپا کر رکھا تھا۔ جدھر نظر پڑتی تھی تلواریں ہی تلواریں چمکتی نظر آتی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے ہزاروں بجلیاں ٹوٹ کر آپس میں الجھ گئی ہیں۔ تیز موسلا دھار مینہہ کی طرح

فولادی تیر برس رہے تھے۔ سر دھڑ سے جدا ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اپنی اپنی عزت اور حرمت کے سوا اور کوئی خیال پیشِ نظر نہ تھا اور اس خیال پر بے دھڑک کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے۔ بہت سے مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ پورس کا قد چار ہاتھ اور ایک بالشت تھا۔ اور یہ کہ وہ اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے اس ہاتھی سے کچھ کم نہ تھا جس پر وہ سوار تھا۔ وہ صرف ایک جنرل کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک بہادر سپاہی کی حیثیت سے لڑ رہا تھا حالانکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے سوار قتل ہو گئے ہیں۔ اس کے بے شمار ہاتھی بھی کٹ کٹا چکے ہیں اور اس کی پیدل فوج کا بڑا حصہ تہ تیغ ہو چکا ہے۔ مگر اس نے دارا کی طرح میدانِ جنگ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اور اپنے سپاہیوں کے آگے راہِ فرار اختیار کرنے کی مثال قائم نہیں کی، بلکہ اخیر دم تک پوری قوت سے ڈٹ کر لڑتا رہا، تا اینکہ ایک تیر اس کے دائیں کندھے پر اس شدت سے آ کر لگا کہ وہ غش کھا کر ہودج میں گر پڑا۔ کریٹیس روفس لکھتا ہے کہ سکندر نے یہ محسوس کر کے کہ وہ بہادر اور دلیر شخص ہے۔ اس کی جان بچانے کے لئے بہت متردد تھا۔ اور اس مقصد سے اس نے راجہ ٹازیلیس کے بھائی ٹیک ہلز کو بھیجا۔ ٹیک ہلز گھوڑے پر سوار تھا ہاتھی کے اتنا قریب پہنچ گیا، جتنا قریب کہ وہ اپنے تئیں پورے طور پر محفوظ کرنے کے بعد پہنچ سکتا تھا اور اس سے منت درخواست کی کہ چونکہ اس کے لئے اب بھاگنا ناممکن ہے۔ اس لئے رُک کر سکندر کا پیغام سُن لینا چاہئے۔ اگرچہ پورس کی طاقت زائل ہو چکی تھی اور اس کا خون بھی بہت کچھ نکل چکا تھا۔ لیکن اس آواز نے اس کی حمیت کو بیدار کر دیا اور کہا۔

"میں ٹازیلیس کے بھائی کو پہچانتا ہوں جس نے اپنی سلطنت اور تاج

سے دستبرداری حاصل کرلی ہے۔"

یہ کہتے ہی اُس پر اپنے ترکش کا آخری تیر پھینکا اور ایسی تیزی کے ساتھ چلایا کہ وہ پیٹھ میں لگ کر اس کے سینہ سے پار ہوگیا۔ سکندر اب قریب پہنچ چکا تھا اور یہ معلوم کر کے کہ پورس اپنے ارادے کا کس قدر پکّا ہے اُس نے یہ حکم دے دیا کہ مقابلہ کرنے والوں کو امن نہ دیا جائے۔ اس لئے پورس اور اس کی پیدل فوج پر چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہونے لگی۔ اور چونکہ اب اس میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ لہٰذا اس نے ہاتھی سے اترنا چاہا۔ مہاوت نے راجہ کے ارادہ کو بھانپ کر ہاتھی کو حسب معمول طریقہ سے بٹھا دیا۔ اسے دیکھ کر باقی ہاتھی بھی بیٹھ گئے۔ اس لئے کہ انہیں یہ تربیت دی گئی تھی کہ جب شاہی ہاتھی بیٹھے تو وہ بھی بیٹھ جایا کریں۔ پلوٹارک سوانح سکندر کے باب ششم میں لکھتا ہے کہ اس ہاتھی نے اپنے معزز آقا کی حفاظت اور غور و پرداخت میں غیر معمولی اور حیرت انگیز دانشمندی کا اظہار کیا، جب اس نے دیکھا کہ اس کا آقا تیروں کے زخموں اور دیگر صدمات کی وجہ سے بیہوش ہوا چاہتا ہے، وہ آہستگی سے زمین پر بیٹھ گیا اور گھٹنے ٹیکنے کے بعد اپنی سونڈ سے اس کے جسم میں سے تیر نکالے۔

مسٹر کرینٹس روفس کا بیان ہے کہ سکندر نے یہ خیال کرکے کہ پورس قتل ہو گیا ہے، حکم دیا کہ اس کی لاش کو اپنی حفاظت میں لے لیں۔ لیکن ہاتھی نے جوں ہی انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو اپنے آقا کی حفاظت میں ان پر حملہ کردیا اور پورس کو پھر ایک مرتبہ اُٹھا کر ہودج میں بٹھا دیا۔

اس واقعہ کے بعد ہاتھی پر چاروں طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی اور جب وہ زخم کھاتا کھاتا مر گیا تو پورس کو ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ لیکن سکندر

یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی آنکھیں آسمان کی طرف کئے ہوئے ہے۔ دشمنی کی ساری باتیں بھول گیا اور جذبۂ رحم سے متأثر ہو کر اس سے کہا کہ

"یہ کیا نادانی ہے کہ آپ نے مجھ ایسے شخص سے نبرد آزما ہونا چاہا ہے جس کے کارناموں کی دھاک آپ نے بھی سن رکھی ہے۔ اور بالخصوص جبکہ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ جو لوگ میرے مطیع ہو جاتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ کس قدر رحم و رعایت کا سلوک کرتا ہوں۔"

پورس نے جواب دیا کہ

"میں یہ خیال کیا کرتا تھا کہ مجھ سے زیادہ شجاع اور کوئی نہیں۔ جنگ کے نتیجہ نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ مجھ سے زیادہ بہادر ہیں۔"

فاتح اور مفتوح کی ملاقات

انابیس اپنی کتاب سکندر اعظم کے باب ۱۸-۱۹ میں پورس اور سکندر کی ملاقات کا ذکر اس طرح سے کرتا ہے۔

جب سکندر کو معلوم ہوا کہ پورس معززین کے ہمراہ اس کے پاس آرہا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر چند ہمراہیوں کی معیت میں اپنے خیمہ سے اس لئے روانہ ہوا کہ پورس سے ملاقات کرے۔ تب اس نے اپنے گھوڑے کی باگ روکی اور پورس کی وجاہت اور شاندار قد کا حیرت سے معائنہ کیا جو پانچ فٹ سے قدرے زیادہ تھا۔ اس نے اس امر میں بھی اظہار تعجب کیا کہ اس کی شجاعت میں سرمو فرق پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ کہ وہ اس سے اس طرح مل رہا ہے جس طرح سے کہ ایک بہادر آدمی دوسرے بہادر آدمی سے اپنی سلطنت کی حفاظت میں ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے شجاعانہ طریقہ سے لڑنے کے بعد مل رہا ہے۔ سکندر نے ازاں بعد خود ہی سلسلۂ کلام کا آغاز کیا کہ اس

کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔

پورس نے جواب میں کہا کہ اے سکندر! مجھ سے وہ سلوک کر جو بادشاہ کے شایانِ شان ہو۔ سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا اور پورس کو نہ صرف اس کی سلطنت واپس کر دی بلکہ اس طرف جو اور علاقے فتح کئے تھے، وہ بھی اس کے حوالے کر دیئے۔

یہاں سے سکندر آگے بڑھا، مگر بیاس[1] پہنچ کر آگے بڑھنے سے اس کی فوجوں نے انکار کر دیا۔ سکندر نے ہزار ہمت دلائی اور دل بڑھایا مگر کسی نے قدم آگے بڑھانے کی حامی نہ بھری۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اب واپس پلٹنا ناگزیر ہو چکا ہے تو اس نے عین اس مقام پر جہاں بیاس سے دریائے ستلج ملا ہے، بارہ قربان گاہیں قائم کیں۔ ان میں مذہبی دیوتاؤں کے نام کی قربانیاں چڑھائیں۔ پھر راوی اور چناب کے راستے واپس لوٹا۔ اور شورکوٹ کے قلعہ کو فتح کرنے کے بعد ملتان کی جانب کوچ کیا۔

سکندر قلعہ ملتان میں کود پڑا!

اہلِ ملتان کو جوں ہی سکندر کے آنے کی اطلاع ملی۔ انہوں نے شہر کے پھاٹک بند کرا دیئے اور تن بہ تقدیر دُشمن کا انتظار کرنے لگے۔ سکندر نے اپنی فوج کے دو حصّے کر دیئے۔ ایک کی کمان اس نے خود سنبھالی دوسری پر جنرل پرڈکاس

---

[1] اکثر یونانی مؤرخین نے قربان گاہیں قائم کرنے کا مقام دریائے بیاس اور ستلج کا سنگم بیان کیا ہے اس سے باور کرنا پڑتا ہے کہ دریائے بیاس اُن دنوں دو شاخوں میں بہتا ہوگا۔ ایک وہ جو ضلع ملتان میں سکہ کے قریب سے ہوتی ہوئی دریائے چناب [illegible] اور دوسری وہی جو ستلج میں ہری کا پتن پر ملتی ہے۔ بعد میں سالم دریا کا رُخ اُس طرف ہو گیا۔

کو افسر مقرر کیا۔ اس کے بعد سکندر نے شہر پر حملہ[1] کر دیا۔ اور لڑ بھڑ کر شہر کا ایک پھاٹک کھول لیا۔ جب لوگ شہر کی طرف سے مایوس ہو گئے تو قلعے میں محصور ہو بیٹھے۔

یہ سر بفلک قلعہ بے حد مضبوط اور ناقابلِ تسخیر تھا۔ اس کے چاروں طرف دریائے راوی بہتا تھا۔ سکندر نے حکم دیا کہ سیڑھیاں لگا کر اوپر چڑھ جاؤ۔ اس موقع پر جتنی چستی اور ہنر مندی سکندر چاہتا تھا، فوج سے ظاہر نہ ہوئی اس پر برہم ہو کر سکندر نے ایک سپاہی سے سیڑھی چھین لی اور فصیل سے لگا کر ڈھال کی آڑ میں اوپر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تین غدا کار، جاں سپار افسر اور بھی چڑھ گئے۔ ملتان کے راجہ نے سکندر کا ابدار خود اور اس کے چمکتے ہوئے ہتھیاروں کو دیکھا تو اس نے معلوم کر لیا کہ یہی سکندر ہے۔ اس نے تیر اندازوں کو جو فصیل پر پھیلے ہوئے تھے۔ ادھر متوجہ کیا۔ بس پھر کیا تھا۔ تیروں کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔ یونانیوں نے اس نازک موقع پر سیڑھیاں لگا کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ مگر اہل قلعہ نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ بہت سے جانباز تیروں کی زد میں آکر اپنے آقا پر سے تصدّق ہو گئے۔ سکندر بہرحال سکندر تھا۔ تیروں کی بوچھاڑ کا تن تنہا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا۔ اس نے بہت سے آدمیوں کو مار گرایا اور بعضوں کو اپنی ٹھوکر سے نیچے گرا دیا۔ اس کے باوجود وہ دیکھ رہا تھا کہ میری فوج اوپر نہیں چڑھ سکی۔ میں اکیلا فصیل پر کھڑا ہوں، دشمن کو بھی میرا علم ہو چکا ہے اور وہ اپنی تمام فوج میری طرف دھکیل رہا ہے۔ یہاں نہ میں جم کر لڑ سکتا ہوں اور نہ دشمن کی زد سے بچ سکتا ہوں۔ پیچھے ہٹنا اس کی شان کے خلاف تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کچھ سوچا۔ پھر عجب مردانگی اور بہادری سے قلعہ میں کود پڑا۔ اس کے ساتھ اس کے تینوں ساتھی بھی

[1] سکندر کے زمانے کا شہر اس موقعہ پر تھا جہاں اب مائی پاکدامن کا قبرستان ہے۔ اس نے سورج کنڈ کی سمت سے شہر پر حملہ کیا تھا۔ موجودہ شہر شیخ الاسلام شاہ محمد یوسف گردیزیؒ کے زمانہ میں آباد ہوا۔

کود سے۔ اب یونانیوں کے ہوش جاتے رہے۔ جان توڑ توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے، مگر ناکام رہتے تھے۔ اندر سکندر تن تنہا دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہُوا دادِ مردانگی دے رہا تھا۔ گویا اس نے تہیّہ کر لیا تھا کہ یا تو قلعہ فتح کروں گا، یا بہادروں کی طرح لڑتا ہُوا جان دے دوں گا۔ ملتان کے راجہ نے ایک سردار کو آگے بڑھایا۔ وہ سینہ تان کر سکندر کے مقابلے میں آیا، مگر اس بخت بیدار نے ایک ہی وار میں اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے بعد کئی منچلے سردار اور بڑھے مگر سب مارے گئے۔ دیر تک یہ نقشہ قائم رہا کہ سکندر اور اس کے تینوں جاں سپار ساتھی دیوار سے ٹیک لگائے بہادرانہ وار قدم جمائے کھڑے تھے۔ جو قریب آتا یا تو مارا جاتا، یا زخمی ہو کر بھاگ جاتا۔ اب فرطِ جوش سے سکندر کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور کوئی آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اسی اثناء میں ایک تیر ایسا آیا کہ سکندر کا بہادر ساتھی ایریاس زخمی ہو کر گر پڑا۔ اور گرتے ہی جاں بحق ہو گیا۔ دوسرا گز بھر کا لمبا تیر خود سکندر کے سینے میں پڑا اور فولادی زرہ کو توڑ کر اندر اُتر گیا۔ تاہم سکندر دل کو مضبوط کئے کھڑا رہا۔ بہت سا خُون نکل چکا تھا۔ کمزوری بڑھتی جا رہی تھی اور بدن میں لڑنے کی سکت نہیں رہی تھی لیکن اولوالعزم تاجدار ایسے ہی موقعوں پر اپنی غیر معمولی استقامت اور خداداد شجاعت کے جوہر دکھایا کرتے ہیں سکندر نے سوچا کہ جب مرنا ہی ہے تو بہادروں کی طرح کیوں نہ مروں۔ چنانچہ پہلے سے زیادہ مستعدی اور بہادری سے لڑنے لگا۔ انجام کار جب طاقت نے بالکل جواب دے دیا تو وہ اپنی ڈھال پر غش کھا کر گر پڑا۔ دونوں یونانی جانباز جو ابھی تک دُشمنوں سے لڑ رہے تھے۔ لپک کر آگے بڑھے اور اپنے سردار کو ڈھالوں کی آڑ میں لے کر دشمن کے حملوں کو رد کرنے لگے۔

اگرچہ وہ خود زخموں سے چُور تھے۔ مگر اپنے آقا کی حالت دیکھ کر اپنی مصیبت کو بھُول گئے۔

یونانیوں کا عجیب عزم

اہلِ لشکر کو قطعاً علم نہیں تھا کہ قلعہ میں کیا ہو رہا ہے۔ انہیں ہزاروں قسم کے وَسوسے اور اندیشے لاحق ہو رہے تھے۔ جب سیڑھیوں کے ذریعے وہ اوپر چڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو بازیگروں کی طرح ایک دُوسرے پر چڑھ کر دیوار پر پہنچ گئے۔ لیکن آگے ایک اور مصیبت پیش آئی۔ کہ اہلِ شہر نے فصیل پر چاروں طرف گوکھرو بچھا رکھے تھے۔ بہرحال جس طرح بھی ممکن ہُوا، یہ جان پر کھیل کر دیوانہ وار اِدھر اُدھر جھانکتے پھرتے تھے کہ ایک جگہ سکندر کو دیوار کے نیچے پڑا ہوا، اور رفیقوں کو اس کی حفاظت کرتے دیکھا تو ان کے جوش اور غضب کی انتہا نہ رہی وہ شور کرتے اور نعرے لگاتے نیچے اُترے اور لپک کر انہیں اپنے حلقے میں لے لیا۔ چند فدا کاروں نے بڑھ کر دروازہ کھول، جس پر یونانی لشکر سیلاب کی طرح اندر اُمنڈ آیا۔ اور قلعے میں ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ غصے میں بھرے ہوئے یونانی سپاہیوں نے دو دستی تلوار چلانا شروع کی اور جو آگے آیا بے دریغ کٹ گیا۔ سکندر کے بارے میں سارے لشکر میں تردّد کی خوفناک لہر پھیل گئی تھی۔ جب دشمنوں سے میدان صاف ہُوا تو لوگ اسے ڈھال پر ڈال کر خیمے میں لے آئے۔ اور یہ دیکھ کر کہ شہنشاہ زندہ ہے، یونانیوں کی جان میں جان آئی۔ کری ٹوڈس طبیب نے بڑی ہوشیاری اور ہنرمندی کے ساتھ سکندر کے سینے سے تیر نکالا۔ تیر نکلنے پر لوگوں میں اس کے مرنے کی خبر اُڑ گئی۔ جس سے سارا لشکر گھبرا گیا۔ اور کسی کے ہوش بجا نہ رہے۔ لیکن سکندر اب اچھا تھا

لوگوں کی پریشانی کا حال سُنا تو خود ہی خیمے سے نکل کر باہر آیا۔ اور اپنے جانبازوں کے اطمینان کے لئے دایاں ہاتھ اٹھا کر ان کو سلام کیا۔ پھر گھوڑا منگوا کر اس پر سوار ہوا اور آہستہ آہستہ یونانی لشکر کے سامنے سے گزرا، اُس وقت کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ پورے لشکر نے ایک ساتھ اتنے جوش سے نعرہ ہائے مسرت بلند کئے کہ گرد و پیش کے در و دیوار گونج اُٹھے۔ سب کی زبان پر تھا، سکندر کی عمر دراز' ایشیا کا فاتح اعظم ہمیشہ تندرست اور بامراد رہے۔

جب ملتان فتح ہو گیا تو سکندر نے فلپ نامی ایک یونانی سردار کو اس شہر کا حاکم مقرر کیا۔ یہیں اُچ کا وفد باریاب ہوا اور اس نے ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ بطورِ ضمانت پیش کر کے حلفِ اطاعت اُٹھایا۔ ابھی تک اس کے زخموں کا علاج ہو رہا تھا اور اس کے ہمراہی راوی اور چناب کے سنگھم پر بڑے جہازوں کا ایک بیڑا تیار کر رہے تھے۔ جب جہاز تیار ہو گئے تو سکندر سوار ہو کر فتح و مسرت کے شادیانوں میں سندھ کو روانہ ہوا۔

اہلِ ملتان باغی ہو گئے

ملتان کے لوگ یونانیوں کی حکومت پر راضی نہ تھے، کیونکہ یونانی مذہب اور تمدن میں اہلِ ملتان سے بہت مختلف تھے۔ اس لئے جونہی انہیں یقین ہو گیا کہ اب سکندر کافی دُور جا چکا ہے اور اس کا واپس لوٹنا ناممکن ہے تو انہوں نے بغاوت کر دی۔ اور یونانی گورنر کو قتل کر دیا۔ سکندر ارضِ مکران سے ہوتا ہوا ارضِ مغرب کو جا رہا تھا کہ اسے اہلِ ملتان کے باغی ہونے کی اطلاع ملی۔ اس نے بلا توقف مقتول گورنر کی جگہ ایک اور گورنر کا تقرر کیا۔ جو ملتان پر دوبارہ حملہ آور ہو کر اس پر قابض ہو گیا۔

ہندوؤں کے عروج واقبال کا زمانہ

چندر گپت موریا

پنجاب کی سرزمین میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا کہ مشرقی ہند کا زبردست راجہ چندر گپت آ پہنچا۔ یہ ایک دفعہ پہلے بھیس بدل کر سکندر اور اس کی فوج کو دیکھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دُور کا حملہ آور یہاں زیادہ عرصہ تک اپنی حکومت قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس نے جونہی سکندر کی روانگی اور وادیٔ پنجند میں قتل و غارت کی خبریں سنیں۔ وہ متوقع پروگرام کے مطابق بڑھتا چلا آیا اور یونانی افواج کو نکال کر ان تمام ریاستوں کا مالک بن بیٹھا۔[1]

[1] چندر گپت کی کامرانیوں میں چانکیہ پنڈت کا بڑا دخل ہے۔ یہ ٹیکسلا میں بطور ٹیچر کے کام کرتا تھا۔ اس نے اپنے دیش کی غلامی کو محسوس کیا۔ ٹیکسلا کے راجہ کی غداری کو دیکھ کر اسے بہت دُکھ ہُوا۔ وہ ملازمت چھوڑ کر سکندر کے آگے آگے روانہ ہُوا۔ اُن سب ہندو قبائل کو جو سکندر کے راستے میں پڑتے تھے۔ سکندر کے مقابلے کیلئے تیار کرتا رہا۔ جب سکندر پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے واپس روانہ ہو گیا تو چانکیہ کو اپنی جنم بھومی کو بدیشی حکمرانوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی فکر ہوئی۔ جو راجدھانیاں پنجاب میں تھیں وہ سب ہار چکی تھیں۔ اس لئے وہ چل کر پاٹلی پتر پہنچا اور کوشش کرنے لگا کہ راجہ فوج کشی کر کے بدیشی حکمرانوں کو پنجاب سے نکال دے، لیکن راجہ نند کو عیاشی سے فرصت ہی نہیں تھی۔ اس لئے اس نے چندر گپت کو حملہ کے لئے اُبھارا۔ چنانچہ نند کو شکست ہوئی اور چندر گپت پاٹلی پتر کا راجہ بن گیا اور چانکیہ اس کا وزیر اعظم۔ راجہ زبردست فوج لے کر یونانی فوج پر حملہ آور ہُوا اور سارا علاقہ اس سے واپس لے لیا۔ چانکیہ نے سیاست پر ایک کتاب "کوٹلیہ کا ارتھ شاستر" لکھی تھی۔ یہ پالیٹکس پر سب سے پہلی کتاب سمجھی گئی ہے، اب اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک دلچسپ اور مفید کتاب ہے (مصنف)

سکندر ۳۲۶ ق م میں بمقام بابل فوت ہو چکا تھا۔ اس کے جانشین سلیوکس نے بلا توقف ملتان کا رُخ کیا اور تمام شہر چندر گپت کے قبضۂ اقتدار سے نکال لئے اس کے بعد وہ دہلی کی طرف متوجہ ہُوا۔ ممکن ہے وہ پاٹلی پتر تک فتح و نصرت کے شادیانے بجواتا ہوا اپہنچ جاتا، مگر افسوس ہے کہ بابل سے بغاوت پھوٹنے کی اتنی وحشتناک اطلاعات ملیں کہ اسے سرعت سے واپس لوٹنا پڑا۔ چلتے وقت اس نے پنجاب کے راجاؤں سے صلح کر لی۔ چندر گپت کی بہادری سے وہ اتنا متاثر ہُوا کہ اسے دامادی[1] میں لے لیا۔ میگھستینیز[2] نامی ایک یونانی عالم کو سفیر کی حیثیت سے اس کے دربار میں چھوڑا اور چند یونانی گھرانے اپنی لڑکی کی دلبستگی کے لئے پاٹلی پتر میں آباد کئے، تاکہ جب لڑکی کو وطن کی یاد ستائے تو یہ لوگ اس کا غم غلط کر سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ نون، لانگ اور جویہ خاندان بھی انہی یونانی الاصل گھرانوں میں سے ہیں۔ جو پاٹلی پتر سے تھانہ بھون اور وہاں سے ملتان کی طرف منتقل ہو آئے۔ میگھستینیز نے یہاں رہ کر ملک کے حالات پر وہ مشہور کتاب لکھی جو قدیم ہندوستان کے حالات میں ایک زبردست سند تصوّر کی جاتی ہے۔ سلیوکس کے بعد چندر گپت نے افغانستان تک اپنا حاکمانہ اقتدار قائم کر لیا۔ اس کے پاس چھ لاکھ پیادے، تیس ہزار سوار اور نو ہزار جنگی ہاتھی تھے۔ اس نے تقریباً چوبیس برس تک حکومت کی[3]۔

۲۹۸ ق م میں اس کا لڑکا بندوسار تخت نشین ہُوا۔ ۲۷۲ ق م میں اشوک اعظم اپنے باپ کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اس کی سلطنت بھی کابل تک پھیلی

[1] تاریخ ہند از مولانا ابوظفر ندوی ص۱۸ [2] تاریخ ہندوستان از پنڈت وشوناتھ بی اے ص۲۲
[3] تاریخ پنجاب از سید عبداللطیف ص۲۵

ہوئی تھی، اور ملتان ایک صوبے کی حیثیت سے اس کے تابع تھا۔ ۱۸۵ سنہ ق م
تک ملتان پر اس خاندان کا طوطی بولتا رہا۔ چونکہ اشوک اعظم بدھ مذہب
کا زبردست پرچارک تھا۔ اس لئے اکثر لوگوں نے اس شاہی مذہب کو
جو بہ نسبت ہندو دھرم کے عام فہم اور نوع انسانی کے لئے زیادہ مفید تھا
قبول کر لیا۔ نیاز فتحپوری اپنی کتاب اسلامی ہند میں لکھتے ہیں کہ اشوک نے
سورج مندر میں بجائے سورج دیوتا کے مہاتما بدھ کی مورتی رکھوا دی تھی
اور اسی کی پوجا ہوتی رہی۔ بلاذری نے ملتان میں سورج مندر کا ذکر کرتے
ہوئے اس کا نام بد لکھا ہے۔ اس سے مراد بت نہیں بلکہ مہاتما بدھ ہے۔
دیبل میں جو مندر تھا وہ بھی بدھ ہی کا تھا۔ ان تمام مندروں پر ٹوپ تھا
جسے عرب مؤرخ قبہ یا گنبد لکھتے ہیں۔[1]

راجہ بکرماجیت کا استبلا

۱۶۵ سنہ ق م میں باختر کے بادشاہ انراڈی ٹس نے پنجاب پر حملہ کیا ۱۲۶ ق م
تک اس کے خاندان نے اس گل ریز وادی پر حکومت کی اس کے بعد اس سلطنت
سے نکلے اور بنائے ہوئے تاجدار پہلی صدی (ق م کی ابتدا تک) وادی سندھ
اور کابل پر قابض و متصرف رہے۔ ۲۲۰ سنہ ء تک یوچی اور کشان قبائل اس
ملک پر اپنا پرچم لہراتے رہے۔ ان کے بعد ایک نیا خاندان منظر عام پر
آیا، جس کا نام گپت خاندان تھا۔ اس نے ایک زبردست اور مضبوط سلطنت
قائم کی۔ اور تقریباً دو سو سال تک بڑے طنطنہ اور دبدبہ سے حکومت کرتا
رہا۔ اس عہد میں متحدہ ہندوستان نے نہ صرف پولیٹیکل شان و شوکت حاصل

[1] اسلامی ہند صفحہ ۶۲

کر لی تھی۔ بلکہ علم و فن میں بھی وہ ترقی کی کہ پوری ہندو قوم آج تک اس پر فخر کرتی ہے۔ اس وجہ سے اس عہد کو ہندی تاریخ کا زرّین دور کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کا بانی چندر گپت تھا۔ لیکن سب سے زیادہ مشہور فرمانروا سمندر گپت اور چندر گپت وکرما دتیہ تھے۔ چندر گپت کی سلطنت تو شمالی ہند میں صرف مگدھ تک محدود رہی۔ لیکن سمندر گپت نے تقریباً سارے ہندوستان کو فتح کر لیا تھا۔ سمندر گپت کے زمانے میں وسطِ ایشیا کی ایک وحشی اور خونخوار قوم نے پنجاب پر حملہ کیا، مگر سکندر گپت نے شکست دے کر اسے بھگا دیا۔ بایں ہمہ وہ قوم مایوس نہ ہوئی۔ وہ پے بہ پے اس ملک پر شدید حملے کرتی رہی۔ یہاں تک کہ چند سالوں کے بعد ان کے سردار تورمان نے ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد شمالی ہند پر قبضہ کر لیا۔

تورمان کے بعد اس کا لڑکا مہر گل تخت نشین ہوا۔ یہ بے حد ظالم اور بے رحم حاکم تھا۔[1] اس کے ظلم و ستم سے رعایا چیخ اٹھی۔ مہاراجہ بکرماجیت اسی انتظار میں تھا۔ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بڑھتا چلا آیا۔ یہاں تک کہ کہروڑ (پکا) اور لونی کے درمیان دریائے ستلج کے کنارے ایک شدید جنگ ہوئی۔ جس میں مہر گل کو شکست ہوئی اور وہ کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ لونی جسے اس تاریخی جنگ کے سبب خاص شہرت حاصل ہے، مجاہد آباد اسٹیشن سے دو میل جنوب کی طرف کاٹ گڈھ اور مانک کے مشرق میں واقع ہے۔

مہاراجہ بکرماجیت کے بعد کوئی ایسا طاقتور راجہ پیدا نہ ہوا جو اس کی عظیم فتوحات کو سنبھال سکتا۔ چنانچہ اس کے مرتے ہی ختا کا ایک نیا ٹڈی دل شمال مغربی

[1] تاریخ ہند از مولانا سید ابوظفر ندوی ص ۲۳

گوشے سے غصّا کی طرح اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب کے مطلع پر چھا گیا جس وقت چین کا مشہور سیاح ہیون تسانگ[1] ملتان سے ہو کر گزر رہا ہے۔ اُس وقت یہ سرزمین اسی خاندان کے زیرِ نگیں تھی۔ پانچویں صدی کے آغاز میں سفید ہن اس ملک پر حملہ آور ہوئے مگر ۵۵۵ء میں ترکوں نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

عرب مؤرخین و سیاحوں کی تحقیقات اور مشاہدات کا دَور شروع ہونے سے پہلے تک کے اتنے حالات ہمیں بیرونی اقوام سے معلوم ہو سکے ہیں۔ چونکہ ان واقعات کا آپس میں کوئی ربط نہیں اس لیے انہیں تاریخ کی صورت میں ترتیب دینا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اب وہ شاندار دَور شروع ہوتا ہے جس کے حالات ہمیں عرب مؤرخین کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں۔ پہلے اس شاہی خاندان کے حالات پیش کیے جاتے ہیں، جسے عرب مجاہدین نے پامال کر کے اپنی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔

رائے چچ کا عروج

چھٹی صدی عیسوی میں ملتان ایک صوبہ کی حیثیت سے مملکت سندھ کے تابع تھا۔ اس سلطنت کی راجدھانی کا نام "الرور" اور "الوبہ" بتایا جاتا ہے۔ اس کے کھنڈر روہڑی جنکشن اور خیرپور کے مابین ملتے ہیں۔ خود روہڑی "رور" یا "الرور" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جب رور کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور قصر و ایوان گرا کر زمین کے برابر کر دیئے گئے تو بھکر کے قریب ایک اور آبادی نے جنم لیا جو

---

[1] تاریخ ہند از مولانا سید ابوظفر ندوی ص ۲۴-۲۵

رُوڑ سے موسوم ہوئی۔ اور پھر امتدادِ زمانہ سے روہڑی بن گئی۔ المختصر پہلے رُوڑ پر ساہسی رائے نامی ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے انتقال پر راجہ شری ہریش مسند نشین ہوا اور اس نے اپنی سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کیا[1]

۱۔ برہمن آباد

۲۔ سیوستان

۳۔ اسکلندہ (اس کے کھنڈرات ٹھٹھہ گھلواں کے قریب ملتے ہیں)

۴۔ ملتان۔

اسکلندہ میں تین مشہور قلعے شامل تھے۔

۱۔ تلواریہ۔ اس کے کھنڈرات لودھراں سے جانب شرق دو میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔

۲۔ چاچ پور۔ اس شہر کے کھنڈرات واہی سلامت رائے اور مانک کے درمیان ملتے ہیں۔ چونکہ اب اس پر حضرت پیر اجمل سلطان کا مزارِ پُرانوار ہے اس لیے اس کھنڈر کا نام بھی پیر اجمل سلطان پڑ گیا ہے۔

پہلے دریائے ستلج کی گزرگاہ اس شہر کے قریب تھی اور یہ کافی بارونق شہر تھا۔ مگر جب دریا نے رُخ تبدیل کر لیا تو یہ شہر ویران ہو گیا۔ عوام نے اس کی نسبت جو قصے مشہور کر رکھے ہیں ان میں کوئی صداقت نہیں۔

۳۔ شہر بانبیہ۔ یہ شہر اسکلندہ سے تین میل جنوب کو ستلج کی غربی شاخ کے کنارے پر آباد تھا۔ اس کے کھنڈرات کافی دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر کسی زمانے میں بہت لمبا چوڑا اور خاصہ بارونق ہوگا۔ مگر اب

---

[1] تاریخ سندھ از مولانا ابو ظفر ندوی صہ ۱۲

کھنڈرات کے قریب ہی غربی جانب ایک چھوٹی سی بستی "بمب" نام سے ملتی ہے اس کے نواح میں بمب نام کی ایک قوم بھی آباد ہے۔

صوبہ ملتان میں سکہ، برہما پور، کروڑ، اشہار اور کمبھ وغیرہ شامل تھے۔ سکہ کو اب سرور شکوٹ کہتے ہیں۔ کہروڑ ضلع ملتان کی سب تحصیل ہے۔ اشہار اور کمبھ سے شاید تلمبہ اور دُنیا پور ہی مُراد ہوں۔

راجہ بنفس نفیس "الروڑ" میں رہتا تھا اور کروان، قیقان اور نیر ہاس براہ راست اس کی اپنی نگرانی میں تھے۔ راجہ کی آخری عمر میں شاہ نیمروز نے اس پر حملہ کیا۔ جس میں سی ہرش لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے مرنے پر امراء نے اس کے بیٹے ساہسی رائے ثانی کو تخت نشین کیا۔ اس کے زمانے میں سیلاج پنڈت کا لڑکا چچ معمولی کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہوا۔ اور ترقی کرتے کرتے راجہ کا پرائیویٹ سیکرٹری بن گیا[1] راجہ کی رانی سوبھن دیوی اس پر سو جان سے فدا تھی۔ جب راجے کا انتقال ہوا تو اس نے چچ کو سندھ کے تخت پر بٹھا دیا۔ آنجہانی راجہ کے ایک قریبی رشتہ دار راجہ مہرت نے اس پر حملہ کیا۔ مگر روڑ کے قریب لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد راجہ چچ نے ملتان کا رُخ کیا۔ پہلے شہر بابیہ کو فتح کیا۔ اس کے بعد اسکلندہ پر اپنا پرچم لہراتے ہوئے سکہ[2] پہنچا۔ معمولی جھڑپ کے بعد سکہ کے حاکم نے شکست کھائی اور قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔

---

[1] تاریخ سندھ از مولانا ابو ظفر ندوی صفحہ ۱۳۱ دہم ایضاً [2] مولانا عبدالحلیم شرر تاریخ سندھ میں سکہ سے شہر سکھر مراد لیتے ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ ملتان کے ممتاز ادیب اور مشہور قانون دان شیخ اکرام الحق بھی شہر سکہ کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور اپنے مقالہ میں اسے ماڑی سیتل کے قریب بتاتے ہیں حالانکہ سکہ اب سرور شکوٹ سے موسوم ہے۔ یعنی سرور شاہ کا کوٹ۔ ملتان سے جو سڑک بہاول پور کو جاتی ہے اس پر لاڑ نام سے ایک چوک آتا ہے۔ یہاں سے سکہ صرف تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ (فریدی)

ملتان کا راجہ بجے راؤ زبردست لشکر لے کر نکلا۔ اس نے پوری شدت سے چچ پر حملہ کیا، مگر اُسے شکست نہ دے سکا اور قلعہ بند ہو بیٹھا۔ اسے کشمیر سے کمک ملنے کی توقع تھی۔ جب اُدھر سے کوئی امداد نہ ملی تو اس نے چچ سے صلح کر لی، اور اپنے متعلقین سمیت قلعہ سے نکل گیا اور چچ فتح و نصرت کے پھریرے لہراتا ملتان میں داخل ہوا۔

چچ نے مندر میں داخل ہو کر دیوتا کے[1] آگے سر ارادت جھکایا۔ نذرانے چڑھائے۔ ایک ٹھاکر کو شہر کا حاکم مقرر کیا۔ اور اس کے بعد کشمیر کی طرف قدم بڑھایا بجے راؤ کے مغلوب ہونے سے چچ کا ایسا رعب بیٹھ چکا تھا کہ ہر طرف کے حکام خود بخود مطیع ہو گئے۔ برہماپور، کروڑ اور اشہار کے حکمرانوں نے بھی سر اطاعت جھکا دیا۔ اب راجہ چچ کمبھ اور کشمیر کی طرف بڑھا اور ان ممالک کو فتح کرنے کے بعد واپس ارور لوٹ گیا۔ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد ۶۶۸ھ میں راجہ چچ نے انتقال کیا۔

---

[1] اگرچہ چچ نسلاً برہمن تھا۔ لیکن بت پرستی کے لحاظ سے برہمن قوم ایسی نہیں ہے جو بدھ کی پرستش کو منع کرتی یا خود اس طرف مائل نہ ہو جاتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ ملتان کا معبد بدھ کا عظیم مندر ہو اور چچ و داہر نے بدھ مذہب اپنا لیا ہو۔ اس امر کا ثبوت کہ عربوں سے پہلے سندھ و ملتان کا سرکاری مذہب بدھ تھا اس سے ملتا ہے کہ اس وقت کی تاریخوں میں کہیں گائے کی پوجا یا ستی وغیرہ کا ذکر نہیں ہے جو ہندوؤں کے ساتھ مخصوص ہے۔ نیز مندر کے پجاریوں کو سمنی کہتے تھے۔ سمنی سنسکرت لفظ سرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مذہبی بھکاری۔ مذہبی بھکاری خصوصیت کے ساتھ بدھ مذہب ہی میں زیادہ پائے جاتے ہیں ــــ یہ ہر صبح اٹھ کر ہاتھوں میں کاسہ گدائی لئے بھیک مانگا کرتے تھے اور یہ طریقہ بدھ مذہب والوں کا ہی ہے۔

(اسلامی سندھ ۶۳)

راجہ داہر

رائے چچ کے بعد اس کا چھوٹا بھائی رائے چندر تخت نشین ہوا۔ یہ راجہ بُدھ مت کا پیرو تھا۔ اس کے زمانے میں بُدھ ازم کو بڑا فروغ ہوا۔ ہر شہر میں اس تحریک نے از سرِ نو زندگی پائی۔ تبلیغ و ارشاد کے لئے بُدھ پرچارک مقرر ہوئے۔ خود راجہ سارا دن درویشوں اور فقیروں کی مجلس میں بیٹھا مذہبی گفتگو کرتا رہتا۔ آٹھ سال بڑے جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد یہ نیک نام راجہ دارِ فانی سے عالمِ باقی کو رخصت ہو گیا۔

رائے چچ کے بعد اگرچہ تخت کے بہت سے دعویدار اُٹھے، مگر رائے چچ کا چھوٹا لڑکا داہر ان سب پر غالب آیا۔ اس نے باپ کے تخت پر بیٹھتے ہی مکران تک تمام قلمرو کا دورہ کیا۔ کچھ عرصہ اس نے برہمن آباد میں گزارا۔ اس کے بعد "رور" میں شاندار عمارتیں بنوا کر اسے گرمائی صدر مقام قرار دیا۔ اس طرح اس نے اپنی حکومت کے ابتدائی آٹھ سال بڑے ٹھاٹھ سے بسر کئے۔

رائے رمل کا حملہ

جب داہر عروج و اقبال کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا تو ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کو اس کی قوت اور طاقت سے خوف پیدا ہوا۔ انہوں نے متفقہ طور پر ایک بڑا لشکر مرتب کر کے رائے رمل کی سرداری میں روانہ کیا، جو شب و روز یلغار کرتا رور کی فصیلوں تک پہنچ گیا۔ اُن دنوں ایک عرب سردار محمد علافی عبدالرحمٰن بن اشعث کو قتل کر کے سندھ میں آچھپا تھا۔ تقریباً پانچ سو سپاہیوں کا ایک مضبوط دستہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ بقولِ مرزا محمد ناظم برلاس راجہ

خود سوار ہو کر اس کے پاس گیا[1]۔ محمد علافی نے راجہ کا حوصلہ بڑھایا۔ دشمن کے مقابلے میں لشکر کو مرتب کرنے کے مفید مشورے[2] دیئے۔ اور ایک رات اپنے پانچ سو رفقا کے ساتھ رائے مدنلی پر ایسا شبخون مارا کہ ان سب کو کاٹ کر رکھ دیا راجہ کو علافی کی اس بہادری سے بڑی خوشی ہوئی اور اس نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی[3]۔ اس کے بعد داہر کو ہند کے راجاؤں سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ تقریباً پچیس برس اُس نے بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ آخری دَور میں اس کے دماغ میں نخوت و تکبّر نے گھر کر لیا، جو اس کے زوال کا سبب بنا اور اس کے ساتھ ہی سرزمینِ سندھ سے ہندو سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

یا حجّاج! اغثنی!!

عربوں کا سندھ پر حملہ حقیقتہً ایک تاریخی رومان ہے۔ چونکہ یہ علاقہ مرکزِ خلافت سے بہت دُور تھا اور درمیان میں کوہستانوں، صحراؤں اور دریاؤں کا لامتناہی سلسلہ حائل تھا۔ آبادی جنگجو اور اپنے معتقدات میں سخت متشدد تھی۔ اس لیے عرب ادھر متوجہ نہ ہو سکے۔ جب محمد بن علافی مسلمان سپہ سالار کو قتل کر کے اس سرزمین کی طرف بھاگا تو پہلی دفعہ خلافت کو صفحۂ ارض پر یہ ملک بھی نظر آیا۔ حجاج نے مجاع بن سعید کو مکران کا گورنر مقرر کر کے علافیوں کی گرفتاری پر مامور کیا۔ مگر وہ اسی سال مر گیا اس کے بعد محمد بن ہارون کا تقرر ہوا۔ وہ پانچ سال تک متعدد شہروں پر حملہ کرتا رہا۔

---

[1] تاریخ سندھ از مرزا محمد کاظم برلاس [2] تاریخ سندھ از مولانا سید ابوظفر ندوی [3] ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۳۰۸

اسے صرف ایک علافی مل سکا۔ جسے قتل کر کے اس کا سر حجاج کے پاس بھجوا دیا۔[1] ابھی یہ چھیڑ جاری تھی کہ اتفاق سے ان دنوں سراندیپ (لنکا) کے راجہ نے حجاج کے پاس آٹھ جہاز تحائف سے بھرے ہوئے روانہ کئے۔ ان میں لونڈی غلام بھی تھے، اور کچھ مسلمان عورتیں اور بچے بھی تھے۔ جب وہ جہاز دیبل سے گزرے تو بحری قزاقوں نے انہیں لوٹ لیا اور عورتوں کو پکڑ لے گئے۔ دفعتًہ ایک لڑکی بے تحاشا چلا اٹھی

"یا حجاج! اغثنی!!" (اے حجاج فریاد کو پہنچ!)

حجاج عصر کی نماز پڑھ کر بصرہ کی مسجد سے نکل رہا تھا کہ ایک اجنبی ہانپتا کانپتا حاضرِ خدمت ہوا اور بولا۔ میں سندھ سے آ رہا ہوں۔ سمندری لٹیروں نے آپ کے آٹھ جہاز لوٹ لئے اور مسلمان عورتوں و بچوں کو گرفتار کر لیا۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو ایک لڑکی کی یہ آواز برابر میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ "یا حجاج اغثنی!"

حجاج کے دل پر اس واقعہ کا ایسا اثر ہوا کہ بے اختیار پکار اٹھا "لبیک یا اختی" ہاں بہن! میں آیا۔

حکم دیا کہ جب تک میں اس مہم پر فوج روانہ نہ کر دوں، مؤذن ہر نماز کے بعد تین بار پکارا کرے۔ "یا حجاج اغثنی!"

چونکہ اتنی بڑی لڑائی خلیفہ کی منظوری کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی تھی اس لئے خلیفہ ولید سے درخواست کی کہ مجھے ملکِ سندھ پر مستقل فوج کشی کی اجازت دی جائے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ خزانہ سے جتنا روپیہ اس مہم پر صرف ہو گا، میں اس کا دوگنا داخلِ خزانہ کروں گا۔ ساتھ ہی داہر کو لکھا کہ ان گرفتار شدہ مردوں اور عورتوں کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ لیکن داہر نے کچھ پرواہ نہ کی اور لکھا کہ یہ حرکت بحری قزاقوں

[1] چچ نامہ صہ ۳۹

کی ہے اور وہ میرے قبضہ سے باہر ہیں۔ خلیفہ سے اجازت ملتے ہی حجاج نے عبداللہ کو اس مہم پر مامور کیا، مگر وہ مارا گیا۔ اس کے بعد بدیل بن طہفتہ البجلی کا تقرر عمل میں آیا۔ وہ اس وقت عمان میں تھے۔ حکم پاتے ہی روانہ ہوئے۔ عین معرکے میں گھوڑا بدکا، اور اسے لے کر دشمنوں کی صف میں جا گھسا۔ چنانچہ یہ بھی شہید ہو گئے[1] اس کے بعد حجاج نے بڑے سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد اپنے چچا زاد بھائی اور داماد محمد بن قاسم کو اس مہم پر مامور کیا۔

محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ

محمد بن قاسم سترہ سال کا نوجوان تھا، وہ چھ ہزار فوج کے ساتھ سندھ کو روانہ ہوا۔ اور چھ ہزار فوج مقدمتہ الجیش کے طور پر ابو الاسود کی زیر کمان حدود سندھ میں مل گئی۔ اس نے ۹۳ھ میں دیبل کو فتح کر کے ان عورتوں اور بچوں کو آزاد کرایا جن کی فریاد نے حجاج کو اس مہم کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کے بعد نیرون کو فتح کیا۔ یہاں سے آگے بڑھ کر اس نے "رور" کے مقام پر راجہ داہر سے خونریز جنگ کی۔ جس میں وہ بہادر راجہ داد شجاعت دیتا ہوا مارا گیا۔ اس عظیم الشان فتح کے بعد محمد بن قاسم دریا کے کنارے کنارے ملتان کی طرف بڑھا۔ راستے میں جو شہر آئے، ان پر اپنی ظفر مندی کے جھنڈے لہرائے۔ یہاں تک کہ قشون قاہرہ دریائے بیاس تک آ پہنچا۔

قلعہ بانبیہ کی تسخیر

دریائے بیاس کے کنارے پر ایک پرانا قلعہ چلا آتا تھا۔ جسے بانبیہ سے موسوم

---

[1] البلاذری صہ ۱۸۴

کرتے تھے۔ اس پر راجہ داہر کا چچازاد بھائی راجہ کسکا حکومت کرتا تھا۔ یہ روسکی لڑائی میں موجود تھا۔ جب اسلامی لشکر اس کے سامنے خیمہ زن ہوا تو اس کی نگاہوں میں روڑ کا نقشہ پھر گیا۔ اس کو مقابلے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اُس نے محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ غازی نے اس کی بڑی عزت کی اور مبارک مشیر کا لقب دے کر اسے اپنے مقبوضات کے سیاہ و سفید کا مختار بنا دیا۔

قلعہ اسکلندہ[1] کا محاصرہ

قلعہ بابنیہ پر قبضہ کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے دریا[3] کو عبور کیا تو سامنے اسکلندہ کا مضبوط قلعہ نظر آیا۔ یہ شہر خاصا بڑا تھا اور اسے ہزاروں سال تک صوبے کے صدر مقام کی حیثیت حاصل رہی تھی۔ اس کے باشندوں کو جب مسلمانوں کی آمد کا حال معلوم ہوا تو وہ قلعہ سے باہر نکلے۔ اور فوجیں آراستہ کر کے مقابلے کو بڑھے۔

اسلامی فوج کے مقدمۃ الجیش کی سرداری اعوَرہ بن عمیر طائی اور کسکا کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن کی فوجیں بالکل سامنے آگئی ہیں تو مردانہ وار حملہ کیا۔

---

[1] موجودہ بمب۔ جو ایک بڑے کھنڈر کی صورت میں دُور تک پھیلا پڑا ہے۔ بعض اسے بابنیہ سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن اکثر مؤرخین اسے بھاٹیہ کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک اور شہر تھا۔ سُلطان محمود غزنوی نے بھی اُس پر حملہ کیا تھا [2] اس شہر کے کھنڈرات ٹھٹھہ گھلواں کے قریب دیکھے جا سکتے ہیں۔

[3] مولانا عبد الحلیم شرر کو اس موقع پر بیاس کا نام پڑھ کر حیرت ہوئی ہے اور انہوں نے بڑا دلچسپ نوٹ دیا ہے کہ جہاں محمد بن قاسم اترا ہے، وہاں کے دریا کو پنجاب کے جس دریا سے تعبیر کریں جائز ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ اس زمانے میں اس دریا کو بیاس کہتے ہوں حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دریائے بیاس کی ایک شاخ اس راستے سے گزرا کرتی تھی اور دوسری دریائے ستلج میں جا کر ملتی تھی۔

دن بھر خوفناک جنگ جاری رہی، مگر عربوں کے ریلے کو روکنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ شکست کھا کر پیچھے ہٹے۔ ان کے افسروں نے سنبھالنے کی ہر چند کوشش کی مگر سپاہیوں کے قدم اکھڑ چکے تھے۔ رجعت قہقری کرتے قلعے میں گھس گئے اور مسلمانوں نے لپک کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ قلعہ نے شہر کے پھاٹک مضبوطی سے بند کر دیئے اور فصیل پر چڑھ کر تیر برسانے لگے اور نیز جگہ جگہ منجنیقیں کھڑی کر دیں۔ سات دن تک مسلسل لڑائی جاری رہی۔ جب انہیں کامیابی نظر نہ آئی تو آٹھ دنوں کے بعد رات کے سناٹے میں قلعے کا حاکم سکہ کی طرف بھاگ گیا اور اہلِ شہر نے اپنے آپ کو عربوں کے حوالے کر دیا۔ محمد بن قاسم نے عتبہ بن سلمہ تمیمی کو اس قلعے کا حاکم مقرر کیا اور خود فوج لے کر سکہ کی طرف روانہ ہوا[1]

سکہ کا محاصرہ

سکہ پر بجے راؤ کا نواسہ حکمران تھا۔ یہ بڑا بہادر شخص تھا۔ اس کے دل میں اپنے خاندان کی سلطنت مٹنے کا اتنا غم تھا کہ وہ سترہ روز تک دیوانہ وار عربوں سے لڑتا رہا۔ اہلِ سکہ کی طرح مسلمانوں کے بھی بہت سے بہادر اور سرفروش سپاہی کام آئے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم کے ہمراہیوں میں سے دو سو پندرہ بہادران اسلام اور پچیس ممتاز افسر اس جنگ میں شہید ہوئے تھے۔ روز روز کی جنگ نے انجام کار بجے راؤ

[1] جہاں غازی محمد بن قاسم نے اسکلندہ کی جنگ کے دوران کیمپ لگایا تھا۔ وہ مقام ابتک، روم شام سے موسوم ہے۔ پاس ہی دو وسیع و عریض کھنڈر اسکلندہ کے محل وقوع کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اسکلندہ فتح کرنے کے بعد جس مقام پر عربوں کی چھاؤنی قائم ہوئی تھی، وہ جگہ ڈیرہ عاربی کہلاتی ہے یعنی عربوں کا ڈیرہ۔ اس جگہ کے باشندے عاربی کہلاتے ہیں۔ جو یقیناً ان مجاہدین صف شکن کی اولاد ہیں۔ جن کی شمشیر خارا شگاف نے اسکلندہ کو مسخر و مطیع کیا تھا۔

کے نواسے کو مایوس کر دیا اور وہ دریائے بیاس عبور کر کے ملتان منتقل ہو گیا۔ محمد بن قاسم کے دل میں اپنے بہادر رفیقوں اور جانباز افسروں کے مارے جانے کا سخت صدمہ تھا سندھ کی ساری مہم میں صرف یہی ایک مقام ایسا نظر آتا ہے جس میں اس کی پیشانی پر شکن نظر آئی اور اس کے ہاتھوں ایسی کاروائی وقوع میں آئی جو اس کی طبیعت کے خلاف تھی۔ شہیدوں کے انتقام میں اس نے حکم دیا کہ شہر سکہ[1] کو مسمار اور برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ اس طرح مسمار کیا گیا کہ اب وہاں سوائے کھنڈرات کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ مقام شجاع آباد سے ملتان جانے والی پختہ سڑک پر لاڑ کے قریب واقع ہے۔ تین قلعوں کے کھنڈرات اور سید زین العابدینؒ کے مقبرہ نے اس مقام کی یاد کو تازہ کر رکھا ہے۔ محمد بن قاسم دریائے بیاس[2] عبور کر کے ملتان کی طرف متوجہ ہوا اور میدان میں خیمہ زن ہوا،

---

[1] بلاذری کے زمانے میں اس ویران شہر کے کچھ آثار باقی تھے۔ لیکن اب صرف اس جگہ قبرستان واقع ہے اور کہیں کہیں زمین کے تودے نظر آتے ہیں۔ البتہ سرور شکوٹ نام سے ایک بستی اس مقام کے قریب موجود ہے جو غالباً سکہ کی تباہی کے فوراً بعد وجود میں آگئی تھی۔

[2] دریائے بیاس کی طرح یہاں راوی کا نام مولانا شرر کو شدت سے کھٹکا ہے اور بیاس کے نوٹ سے بھی زیادہ عجیب و غریب تأثرات کا اظہار فرماتے ہیں جو اُن جیسے وسیع المطالعہ ادیب اور مؤرخ کی شان کے قطعاً منافی ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "جو شک دریائے بیاس کی نسبت واقع ہوا تھا۔ وہی اس موقع پر دریائے راوی کی نسبت وارد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ موجودہ نقشوں کی رو سے اس مقام پر جو دریا بہتا ہے اس کا نام چناب لکھا گیا ہے، حالانکہ وہ صرف چناب ہی نہیں بلکہ اوپر چڑھ کے اس کی تین شاخیں ہیں۔ راوی، چناب اور جہلم۔ ملتان کے نیچے جہاں تینوں دریا مل گئے ہیں۔ جس نام سے کہا جائے جائز ہے۔ اور گو اسے آج چناب کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن دنوں اسے راوی کہتے ہوں۔"

یہ جواز اور عدم جواز کا فتویٰ بھی خوب ہے کہ چاہے اسے راوی کہو یا چناب دونوں طرح جائز ہے، حالانکہ سکہ سے صرف بیاس گزرتا تھا نہ کہ چناب۔ ہم دریائے راوی کی گزرگاہ کا مکمل نقشہ؟ پیش کر رہے ہیں۔

جو اب ملتان چھاؤنی اور محمد پور گھوٹہ کے مابین واقع ہے اور قاسم بیلہ سے موسوم ہے۔

عرب ملتان کے دروازے پر

اہلِ ملتان کی طرف سے سب سے پہلے جو سردار مسلمانوں کے مقابلے میں نکلا وہ سکہ کا سابق حکمران بجے راؤ کا نواسہ تھا۔ جو شکست کھانے پر ملتان چلا آیا تھا۔ اگرچہ وہ عربوں کی بہادری اور شجاعت سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ مگر وہ ایک بار پھر قسمت آزمانے کے لئے ملتان والوں کو لے کر مقابلے میں نکلا۔ اور خوب جی توڑ کر لڑا۔ اور سچ یہ ہے کہ اس نے جوانمردی کا حق ادا کر دیا۔ دو یوم تک شدید جنگ ہوتی رہی۔ اس کے بعد اہلِ ملتان کو کھلے میدان میں لڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور وہ قلعہ بند ہو گئے۔

محمد بن قاسم نے جب یہ رنگ دیکھا تو اپنی فوج شہر کے چاروں طرف پھیلا دی اور سارے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ قلعہ بان، تیر اور پتھر برساتے تھے، اور عرب روغنِ نفت اور تیروں سے جواب دیتے تھے۔ الغرض یہ محاصرہ نہایت سخت تھا اگرچہ محمد بن قاسم بعض قلعوں کا چھ چھ ماہ سے زیادہ عرصہ تک محاصرہ کر چکا تھا لیکن یہاں دشواری یہ تھی کہ عرب لوگ بہت دور تک بڑھ آئے تھے اور ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں کے راستے بہت کم معلوم تھے۔ اور چونکہ چاروں طرف غیر مفتوح شہر تھے اس لئے رسد اور دانے چارے کے بہم پہنچنے میں بڑی دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ دو ہی مہینوں کے محاصرہ نے قحط[1] کی صورت پیدا کر دی۔

---

[1] مولانا سید ابوظفر ندوی تاریخ سندھ میں لکھتے ہیں کہ قحط کے سبب لوگ باربرداری کے گدھے ذبح کر کے کھانے لگے تھے۔ اور ان کی قیمت گھوڑوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک ایک گدھا پانچ پانچ سو درہم سے بھی زیادہ قیمت پر بکنے لگا تھا۔ (تاریخ سندھ صہ ۱۱۳)

بلاذری کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو کھانے کی ہی نہیں بلکہ پانی کی بھی تکلیف تھی آخر ایک سندھی نے مسلمانوں کو ایک نالے کا پتہ دیا، جس کے ذریعے ملتان شہر کے درمیانی تالاب میں پانی پہنچتا تھا اور ملتان کے شہری اس سے پانی پیتے تھے۔ یہ تالاب اس موقع پر تھا جہاں اب نواب علی محمد خاں کی مسجد اور تھانہ کپ واقع ہیں۔ یہ تالاب کافی گہرا اور عین درمیان میں تھا۔ لوگ سیڑھیوں کے ذریعے اس میں اترتے اور پانی بھرتے تھے۔ اس میں دریا سے پانی آتا تھا۔ مسلمانوں نے اس کے پانی کا رُخ بدل دیا، جس سے اہلِ ملتان پیاس سے مرنے لگے اور قلعہ سے باہر نکل کر لڑنے پر مجبور ہو گئے۔

ملتان کا صوبیدار داہر کا بھتیجا گور سنگھ تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ عربوں کے استقلال میں کسی طرح کا فرق ہی نہیں آیا اور یہ لوگ پہاڑ کی طرح ڈٹ چکے ہیں تو وہ سخت گھبرایا۔ اُسے کسی طرف سے امداد پہنچنے کی امید بھی نہ تھی۔ اُس نے طے کر لیا کہ کشمیر پہنچ کر راجہ سے خود امداد طلب کرے۔ امید کی ایک دُھندلی سی کرن نے اُسے فرار کا راستہ دکھایا۔ چنانچہ ایک رات وہ خاموشی کے ساتھ قلعہ سے نکلا اور کشمیر کو بھاگ گیا۔ مگر آفرین ہے اہلِ ملتان پر کہ حاکم نہ ہونے کے باوجود دُوسرے دن حسب دستور مقابلے پر نکل آئے اور عربوں پر تیر برسانے لگے۔

مسلمان شہر میں داخل ہو گئے

محاصرہ کی طوالت پکڑنے سے عرب بھی اب سخت تنگ آچکے تھے، روزانہ شہر کے گرداگرد پھیر کر فصیل کا جائزہ لیتے کہ اگر کوئی جگہ کمزور نظر آئے تو اسے گرا کر اندر داخل ہوں، اتفاق سے ایک دن ایک شخص قلعہ سے نکلتا ہوا پکڑا گیا۔ محمد بن قاسم نے اس کی مدد سے فصیل کا کمزور حصہ معلوم کر لیا اور دو تین دن کی سنگ باری

سوداگر، اہلِ حرفہ اور کاشتکاروں کو معمول کے مطابق پناہ دے دی گئی، مالِ غنیمت جمع ہوا اور وہ اس قدر زیادہ تھا کہ دیکھ کر اہلِ لشکر کی تھکاوٹ دور ہوگئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہر سوار کو غنیمت کے مال سے چار سو درہم اور پیدل کو اس کا تہائی حصہ ملا۔ اس زمانے کی قیمتوں کا خیال کرتے ہوئے اندازہ کیجیے کہ مسلمانوں کو ملتان کی لڑائی میں کیا کچھ ملا ہوگا۔

محمد بن قاسم کو ایک برہمن نے خفیہ خزانے کا پتہ بتا دیا۔ غازی نے برہمن کی راہنمائی میں راجہ جے بادین کے مندر کا مدفون خزانہ نکلوا کر عراق روانہ کر دیا۔ حجاج یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بے اختیار پکار اٹھا کہ اب ہمارا غصہ فرو ہوا۔ کیونکہ صرف شدہ رقم کا دوگنا داخلِ خزانہ ہوا۔ چھ کروڑ درہم اور داہر کا سر ہم کو نفع میں ملا[1]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کو اس مہم کے لئے چھ کروڑ درہم دیئے گئے تھے۔ محمد بن قاسم نے خزانے میں پورے بارہ کروڑ درہم داخل کیے جو موجودہ عہد کے تین کروڑ روپے کے برابر ہوتے ہیں۔

ابن خردادبہ کا بیان

ابن خردادبہ لکھتا ہے کہ جب ملتان کے خزانے کا یہ روپیہ دارالخلافت پہنچا تو اس کی بڑی شہرت ہوئی اور لوگ ملتان کو فرج بیت الذہب یعنی "سونے کی سرحد" کہنے لگے۔ کیونکہ محمد بن قاسم بن یوسف نے جو حجاج بن یوسف کے بھائی کا لڑکا تھا، ایک مکان میں چالیس بار سونا پایا۔ اور بار ۳۳۳ من کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے کل بار میں ۱۳۳۲۰ من سونا ہوا جس کے ۲۲۹۷۶۰۰۰ مثقال، اور ۳۵۹۶۸۰۰ درہم ہوئے[3]۔

---

[1] فتوح البلدان مطبوعہ حیدرآباد دکن صفحہ ۱۹۱ [2] المسالک والممالک صفحہ ۵۶ لیدن [3] سفرنامہ بشاری مقدسی صفحہ ۴۸۴

ملتان اور اس کے ملحقات کا انتظام

ملتان فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے امیر داؤد نصر بن ولید یمانی کو اس کا حاکم مقرر کیا۔ حزیم بن عبدالملک تمیمی کو قلعہ برہماپور (شورکوٹ) میں متعین کیا۔ مضافات ملتان کی حکومت عکرمہ بن ریحان شامی کو تفویض ہوئی اور احمد بن حزیمہ بن عتبہ مدنی کو قلعہ جات اجتہاد اور کروڑ پر حاکم کیا۔ اور خود پچاس ہزار سواروں کے ساتھ کشمیر کو روانہ ہوا۔ جندرود (چنیوٹ) کو فتح کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچا۔ جہاں راجہ چچ نے اپنی سرحد کو نمایاں کرنے کے لئے درختوں کی ایک قطار لگائی تھی۔ محمد بن قاسم نے ان نشانات کو از سر نو تازہ کیا تاکہ مسلمانوں کو اپنی سلطنت کی حدود کا علم رہے یہاں سے پلٹ کر غازی محمد بن قاسم ملتان پہنچا، وہ قنوج پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ اسے حجاج کے مرنے کی اطلاع ملی۔ اس خبر نے غازی محمد بن قاسم کو گہرے فکر میں ڈال دیا۔ کیونکہ عین ممکن تھا کہ اس کے بعد ایسا شخص بصرے کا گورنر مقرر ہو جو اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرے۔ ابھی اس واقعہ کو آٹھ ماہ ہی گزرے تھے کہ ولید بن عبدالملک کی وفات اور سلیمان بن عبدالملک کے خلیفہ ہونے کی اطلاع ملی۔ یہ اور وحشت ناک خبر تھی۔ کیونکہ سلیمان ثقفی خاندان کا شدید ترین دشمن تھا اس نے حجاج کے دشمن یزید بن مہلب کو عراق کا گورنر مقرر کیا اور یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو سندھ کی حکومت کا پروانہ عطا کیا۔ ساتھ ہی محمد بن قاسم کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری کر دیئے۔ یزید نے ملتان پہنچ کر محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق روانہ کیا[1]۔ جہاں اسے دیگر اعزا و اقارب کے ساتھ واسط کے قید خانے میں بند کر دیا گیا۔ اور صالح بن عبدالرحمٰن حاکم واسط نے طرح طرح کا عذاب دے

[1] یعقوبی جلد اول ص ۲۵۶

کر اس مجاہد اعظم کو شہید کر دیا۔ محمد بن قاسم حسرت ناک لہجے میں کہتا ہے ؎

اضاعونی وای فتی اضاعوا
لیوم کریهة وسداد ثغر[۱]

"لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا، اور کس جوان کو ضائع کیا؟ وہ جوان، جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کی حفاظت کے لئے نہایت مناسب ہو!"

[۱] بلاذری صہ ۴۴۰
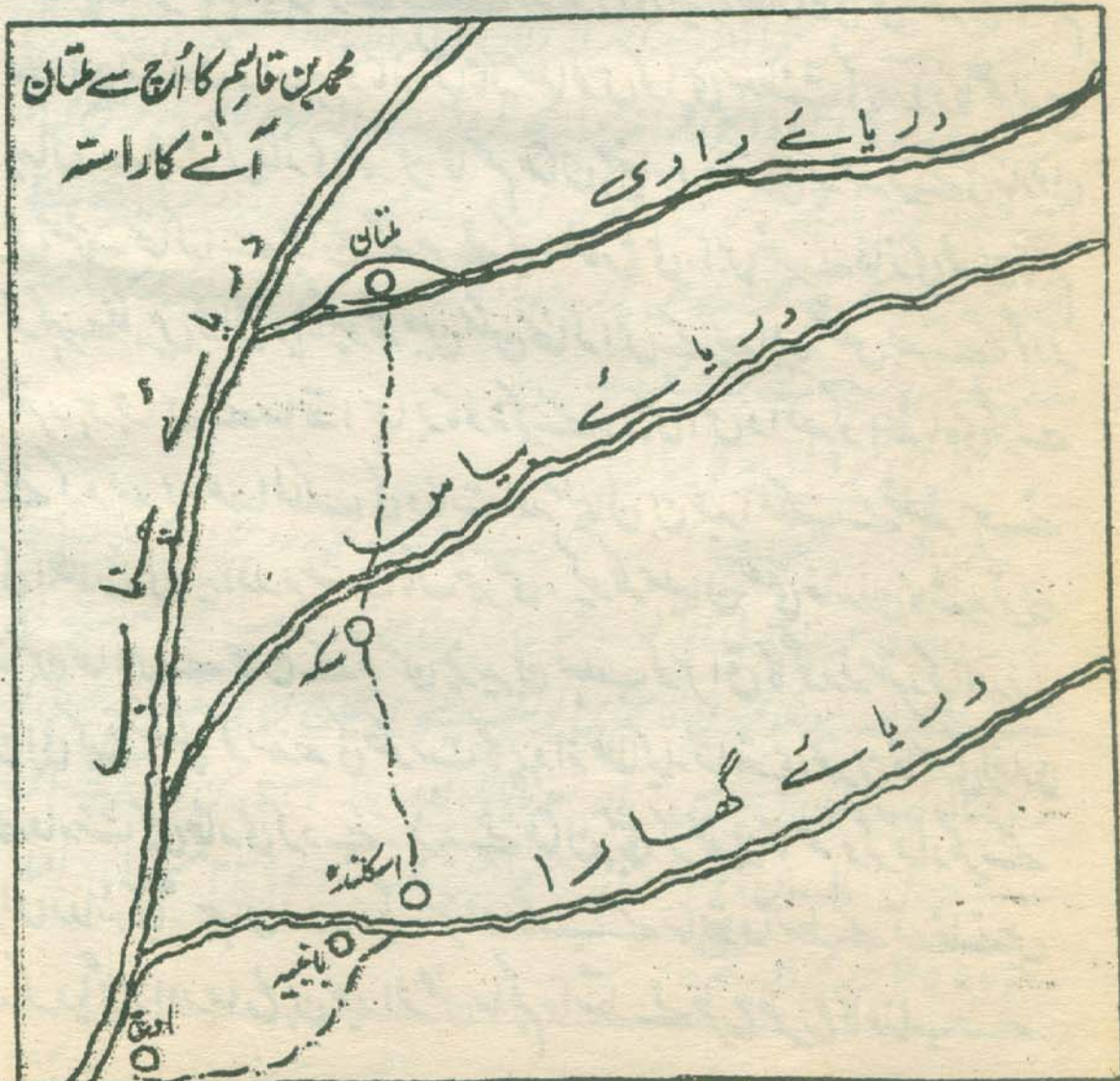
مُلتان کے مُسلمان گورنر

محمد بن قاسم کے بعد بہت سے امراء یکے بعد دیگرے سندھ کے والی مقرر ہو کر آئے۔ ان میں جنید[1] خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ ۱۰۷ھ میں سندھ کا عامل مقرر ہو۔ بڑا مدبّر اور بہادر شخص تھا۔ سندھ کے اندرونی خرخشوں سے مطمئن ہو کر گجرات کی طرف بڑھا۔ پہلے مرمد (ماروا‌ڑ) کو فتح کیا۔ پھر مانڈل (ویرم گام کے قریب) اور دھنج (پٹن)، پہنچا اور یہاں سے بھروچ (بندرگاہ) فتح کر کے سندھ واپس لوٹ آیا۔ اس کے ایک افسر حبیب نے اجین کی طرف کے چند شہر فتح کر لیے۔

جنید کے بعد تمیم، حکیم بن عوانہ، عمر بن محمد اور منصور بن جمہور اس ملک پر حاکم رہے یہاں تک کہ بنو امیہ کا ستارہ غروب ہو گیا۔ بنو عباس نے برسراقتدار آتے ہی سندھ کی طرف توجہ دی۔ ان کی طرف سے مغلس، موسیٰ بن کعب، تمیمی اور عتیبہ وغیرہ حاکم مقرر ہو کر آئے۔ مگر ان میں زیادہ قابلِ ذکر عمر بن حفص ہے۔ چونکہ یہ شخص سادات کا بڑا حامی تھا۔ اس لئے سندھ میں ان کا خاصہ اثر ہو گیا اور شیعیت کی بنیاد اسی وقت سے سندھ میں پڑی۔ محمد بن عبداللہ بن حسن نے اپنے صاحبزادے سید عبداللہ کو سندھ میں فاطمی سادات کے حق میں زمین ہموار کرنے کے لئے بھیجا۔ ابو حفص نے خفیہ طور پر سید عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور انہیں اپنے محل میں چھپا کر اہلِ سندھ کو متاثر کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ خلیفہ منصور کو اطلاع ہوئی تو اس نے عمر بن حفص کو افریقہ میں تبدیل کر دیا اور یہاں ہشام بن عمرو تغلبی کو گورنر مقرر کیا۔ یہ خود تو سید عبداللہ کے

[1] جنید کا نسب نامہ یہ ہے۔ جنید بن عبدالرحمٰن بن عمرو بن الحارث بن خارجہ بن سنان بن ابی حادثہ

خلاف کچھ کرنا نہ چاہتا تھا، مگر اس کے بدبخت بھائی سفیح نے عبداللہ بن زیاد کا کردار انجام دیتے ہوئے حضرت عبداللہ کو شہید کر ڈالا۔ حضرت عبداللہ کے ساتھ چند رفقا بھی تھے، ان کے مزارات سہوآن میں ہی ہیں۔

ملتان کے باشندے اپنے قلعے کی مضبوطی پر نازاں تھے۔ وہ طاقت کے آگے بصد مشکل جھکتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی کمزور حاکم اس طرف آتا، تو وہ اطاعت کا جُوا کندھے سے اُتار پھینکتے تھے۔ ہشام گورنر ہو کر آیا تو ملتان کا حاکم باغی ہو چکا تھا۔ کشمیر کی طرف بڑھتے وقت ہشام ملتان پر حملہ آور ہوا اور فوراً اسے قبضے میں کر لیا[1]۔

خلیفہ منصور کی زندگی تک ملتان بنو عباس کے قبضے میں رہا۔ مگر اس کی وفات پر جب مہدی سریر آرائے خلافت ہوا تو اس کی تلوّن مزاجی نے سندھ کی چولیں ڈھیلی کر ڈالیں اور ملتان شہر پھر باغی ہو گیا۔

خلیفہ ہارون رشید نے محمد بن عدی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ وہ چارج لیتے ہی بڑے جاہ و جلال کے ساتھ ملتان کو روانہ ہوا۔ اہلِ ملتان اس شخص کی فتنہ پردازیوں کا حال سُن چکے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ نتیجہ خواہ کچھ کیوں نہ نکلے اس شخص کی اطاعت ہرگز نہیں کریں گے۔

محمد بن عدی ملتان پہنچا تو اہلِ ملتان بڑے جوش و خروش اور ثابت قدمی سے اس کے مقابل ہوئے۔ خونریز جنگ کے بعد ابن عدی کو شکست ہوئی اور وہ چند ہمراہیوں کے جلو میں بھاگ نکلا۔ اہلِ ملتان نے اپنی کامیابی پر خوشی کے نعرے لگائے اور محمد بن عدی کا تمام مال و اسباب لوٹ کر خوشی کے نغمے گاتے ہوئے واپس شہر میں داخل ہوئے[2]۔

---

[1] و [2] یعقوبی جلد ۲ صہ ۴۹۴

محمد بن قاسم نے ملتان فتح کرنے کے بعد امیر داؤد نصر بن ولید عمانی کو اس علاقے کا حاکم مقرر کیا تھا۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص بنی سامہ سے تھا جو مدت ہائے دراز سے عمان میں آباد تھا معلوم ہوتا ہے کہ یکے بعد دیگرے نسلاً بعد نسل اس کی اولاد ملتان کی حکومت پر متصرف رہی[1]۔ چونکہ اس خاندان کی دارالخلافت تک رسائی تھی اور ملتان میں اس نے اپنی طاقت کافی بڑھالی تھی۔ نیز اہلِ ملتان بھی اچھے دِل گُردے کے لوگ تھے۔ اس لئے ایسے ویسے گورنر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اگرچہ خلافت دمشق سے بغداد کو منتقل ہو گئی اور سندھ پر لاتعداد حاکم مقرر ہو کر آئے اور بدل کر چلے گئے لیکن ملتان کی حکومت میں کوئی تغیّر نہ آیا۔ وہی ایک خاندان برسرِاقتدار رہا۔ چنانچہ جب مسعودی ملتان میں آیا تو اسے اپنے روزنامچہ میں لکھنا پڑا کہ

"حکومتِ ملتان ابتدائے زمانۂ فتح سے اس وقت تک اسی ایک خاندان کے تحتِ تصرف میں ہے۔"

مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر جب منصورہ میں ہباری خاندان نے خود مختاری کا اعلان کیا تو ملتان کا حاکم بھی خلافت کی برائے نام اطاعت سے آزاد ہو گیا۔

امیر ابواللباب المنبہ بن اسد القرشی السامی

علامہ مسعودی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف مروج الذہب میں لکھتے ہیں کہ امیر ابواللباب المنبہ بن اسد القرشی السامی جو ۳۰۳ھ میں ملتان پر حاکم تھا۔ ایک دولت مند فرمانروا

---

[1] ابن رستہ

تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار گاؤں اس کے تابع تھے۔ اس کی عسکری طاقت بھی خاصی مضبوط تھی۔ اس نے اسلامی ممالک سے گہرے روابط قائم کر رکھے تھے۔ خراسان سے قافلوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ جس سے مغربی ممالک کا مال یہاں آکر فروخت ہوتا تھا اور مغربی تجار اور سیاح بھی آسانی سے آتے جاتے رہتے تھے۔

ملتان کا مندر ہندوؤں کے نزدیک بڑا مقام رکھتا تھا۔ ہندوستان کے انتہائی جنوبی سواحل تک لاکھوں یاتری اس کے درشن کو آتے اور قیمتی چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ اس مندر کی آمدنی سے حکومت کو خاصہ حصہ ملتا تھا۔ جس سے خزانہ ہمیشہ معمور رہتا تھا۔ ہندوستان کے راجے اگرچہ فوجی طاقت میں امیر ملتان سے کہیں زیادہ تھے، مگر جب کبھی وہ اس شہر پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتے، امیر ملتان انہیں پیغام بھیجتا، کہ اگر تم نے میرے ملک کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو میں اس مندر کو توڑ پھوڑ کر زمین کے برابر کر دوں گا۔ چونکہ ہندو اس مندر کا بڑا احترام کرتے تھے، وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ مندر کو نقصان پہنچے، اس لئے وہ اس ارادے کو ترک کر دیتے۔

ہارون بن عبداللہ ملتانی

ہارون بن عبداللہ ملتانی بنی ازد کا غلام تھا۔ جو بڑا بہادر اور شاعر تھا۔ جب ایک راجہ ملتان پر حملہ آور ہوا تو اس کے ہمراہ جنگی ہاتھی بھی تھے۔ لڑائی شروع ہوئی تو کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ہاتھی کے سامنے جائے کیونکہ اس کی سونڈ میں تلوار بندھی تھی اور وہ ہر طرف گھما کر لوگوں پر وار کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہارون نے جلدی سے ایک جست لگائی، اور قبل اس کے کہ ہاتھی اس پر وار کرتا۔ وہ اس کے سینے سے چمٹ گیا۔ پھر اپنے دونوں پاؤں پیچھے لٹکا دیئے۔ فیلبان نے ہاتھی کو اس طرح سے پھیرا کہ قریب تھا کہ سونڈ سے ہارون کو نقصان پہنچے۔ لیکن ہارون بڑے دل گردے کا

انسان تھا، موقع ملتے ہی اس نے ہاتھی کے دانت پکڑ لئے اور زور سے کھینچا، جس سے ہاتھی کا ایک دانت اکھڑ آیا۔ دانت تو ہارون کے ہاتھ میں رہ گیا اور ہاتھی بھاگ نکلا۔ اس کے بھاگتے ہی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، اور مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی۔ ہارون نے اس موقع پر فخریہ انداز میں چند اشعار بھی کہے تھے، جس کا مطلع یہ ہے

مشیت الیہ راد عامتھملا
وقد وصلوا اخرطومہ بحسامٖ[1]

امیر ملتان کے بارے میں اصطخری کا بیان

ابن بہلہل کے دس سال بعد ۳۴۰ھ میں ایک اور عرب سیاح اس طرف آتا ہے، جو ابو اسحٰق اصطخری کے نام سے موسوم ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ملتان کا امیر ملتان سے ڈیڑھ میل پر ایک اور شہر میں رہتا ہے جس کو جندرور[2] کہتے ہیں۔ حقیقت میں یہ امیر ملتان کی چھاؤنی ہے، یہ اسی جگہ رہتا ہے۔ صرف جمعہ کی نماز پڑھنے ہاتھی پر سوار ہو کر ملتان جاتا ہے۔ یہ امیر قریشی ہے اور سامہ بن لوی کے خاندان سے ہے۔ اس نے ملتان پر قبضہ کر لیا ہے۔ امیر منصورہ کا مطیع نہیں ہے بلکہ خود مختار ہے، البتہ خلیفۂ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے

ابن حوقل کے مشاہدات

اصطخری کے بعد غالباً ۳۷۵ھ میں مشہور جغرافیہ نویس بشاری اس شہر میں وارد ہوا، وہ لکھتا ہے کہ یہ شہر منصورہ کی طرح ہے۔ لیکن منصورہ اس سے زیادہ آباد ہے

---

[1] میں اطمینان سے دھیرے دھیرے ہاتھی کی طرف چلا، حالانکہ انہوں نے اس کی سونڈ میں تلوار بھی تھما دی تھی

[2] اب یہ قصبہ سورہ میانی کہلاتا ہے۔ ڈاک خانہ کا نام علاقہ سورہ ہے اور موضع بھی اسی نام کا ہے جو المنصورہ کا بگڑا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یہ آبادی جو مسلمانوں کی چھاؤنی تھی المنصورہ سے موسوم ہو گئی تھی۔ اس میں خواجہ صدیقی، سید اور قریشی زیادہ آباد ہیں۔ ایک قوم سورہ بھی کہلاتی ہے جو منصورہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے

ملتان میں پھل بہت کم ہیں، مگر دیگر اشیاء بہت ارزاں ہیں۔ روٹی ایک درہم میں تیس
من ملتی ہے، اور فانیذ (حلوا، سفید شکر) ایک درہم کی تین من۔ یہاں کے مکانات
سیراف (بصرہ) کے مثل لکڑی (ساگوان) کے بنائے جاتے ہیں۔ یہ دو دو، چار
چار منزلے ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کی اخلاقی حالت بہت اچھی ہے۔ ان میں زنا اور شراب کا
مطلق رواج نہیں۔ اگر کوئی شخص اس جرم میں پکڑا جاتا ہے تو اسے یا تو قتل کر
ڈالتے ہیں، یا سخت سزا دیتے ہیں۔ تجارتی کاروبار میں یہ لوگ بڑے خوش
معاملہ ہیں۔ نہ تو یہ جھوٹ بولتے ہیں اور نہ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ مسافروں
سے محبت کرتے ہیں۔ اکثر باشندے مسافر (عرب) ہیں۔ شہری دریا سے پانی
پیتے ہیں۔

یہ بڑا آسودہ شہر ہے اور تجار خوشحال۔ فارغ البالی ہر جگہ نمایاں نظر
آتی ہے۔ یہاں کے بادشاہ عادل ہوتے ہیں۔ تمام بازار میں کسی عورت کو
بناؤ سنگار کئے ہوئے نہ دیکھ سکو گے۔ اور نہ کوئی کھلے طور پر ان سے باتیں
کرتا ہوا نظر آئے گا۔ یہاں کے لوگ عالی ظرف اور مروت والے ہیں۔ فارسی
زبان عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ تجارت کی گرم بازاری بھی خوب ہے۔
لوگ تندرست نظر آتے ہیں۔ لیکن یہاں کی زمین شور، مکانات تنگ اور
ہوا گرم و خشک ہے۔ خود ملتانی گندم گوں اور سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں[1]۔

ملتان کا بادشاہ مصر کے فاطمی خلفاء کا خطبہ پڑھتا ہے۔ اور کوئی کام
ان مصری فاطمی خلفاء کی اجازت کے بغیر نہیں کیا جاتا۔ اور ہمیشہ ان کو ملتان کا بادشاہ

---

[1] احسن التقاسیم ص۴۸۱، لیڈن

روپے اور تحائف بھیجا کرتا ہے۔ ملتان کا بادشاہ ایک عادل اور طاقتور حکمران ہے۔

اہلِ ملتان کا مذہب

بشاری نے اہلِ ملتان کے معتقدات پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔ لکھتا ہے۔ "اہلِ ملتان شیعہ ہیں۔ اذان میں "حی علیٰ خیر العمل" اور اقامت میں کلمات کو دو مرتبہ کہتے ہیں" ـــــ پھر لکھتا ہے کہ :-

"اس ملک کا کوئی قصبہ ایسا نہیں جہاں امام ابوحنیفہؒ کے مقلد نہ ہوں۔ یہاں نہ تو مالکی اور حنبلی ہیں اور نہ معتزلہ۔ یہ لوگ سیدھے راستے پر ہیں۔ پسندیدہ نیکی اور عفت کا مذہب رکھتے ہیں تعصب، غلو اور فتنہ سے اللہ نے ان کو نجات دی ہے[1]۔"

اس سے فرشتہ کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے جس میں ملتان میں شیعہ مذہب کا بانی میر شہاب الدین چاکر خان کو قرار دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک شیعہ مذہب کی بنیاد سندھ کے گورنر عمر بن حفص کے زمانے سے پڑی ہے جس نے سیّد عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن حسن (رضوان اللہ علیہم) کے ہاتھ پر خفیہ طور پر بیعت کر لی تھی۔ اور انہیں اپنے محل میں چھپا کر عوام کو اہلبیت کی امداد پر آمادہ کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو بنو عباس کے تسلط آزاد کرانا چاہتا تھا۔ کیونکہ جعفر عباسی نے سادات پر جو مظالم کئے تھے۔ ا سے عوام میں عباسیوں کے خلاف نفرت کی ایک شدید لہر سی پیدا ہو گئی تھی

[1] احسن التقاسیم ص ۴۸۱

اس لئے ممالکِ اسلامیہ کے اکثر حکمرانوں نے اپنے سیاسی تعلقات خلفاء مصر سے استوار کرنا شروع کر دیئے تھے۔

اہلِ ملتان کا تمدن

ابنِ حوقل اور علامہ بشاری مقدسی کے بیانات کافی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ چونکہ مقدسی کا بیان توضیحی تھا، ہم نے اسے ترجیح دی۔ اہلِ ملتان کے اخلاق و اطوار کے بارے میں مقدسی کا بیان جامع ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ

۱۔ ملتان میں عیاشی و فحاشی کا نام تک نہ تھا۔
۲۔ حکمران عادل اور رحمدل تھا۔
۳۔ اہل ملتان لین دین کے کھرے اور مہمان نواز تھے۔
۴۔ عورتوں کو کھلے بندوں بازاروں میں آنے کی اجازت نہ تھی۔
۵۔ ہندو بتوں کی پوجا کرتے تھے اور ملتان بت پرستی کا بہت بڑا مرکز تھا۔

ابن حوقل نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ ملتان میں عربی اور سندھی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس علاقے کا لباس اہلِ عراق سے ملتا جلتا تھا۔ بعض لوگ اپنے بال لمبے رکھتے تھے اور گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں کافی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی۔ بالخصوص امراء کی وضع قطع تو ہندو راجاؤں جیسی تھی۔

ملتان پر علویوں کی حکومت

جمال الدین احمد بن علی داؤدی نے اپنی مشہور تصنیف "عمدۃ المطالب" میں

ملتان پر علویوں کی حکومت کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ جب انہیں حجاز میں خطرہ نظر آیا تو وہ اپنے خاندان کے نیرہ افراد کے ہمراہ چند یوم تو گھروں میں چھپے رہے۔ پھر موقع ملنے پر ملتان کو فرار ہو آئے۔ ان کی آمد پر اہل ملتان نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ایک بڑی جماعت ان کے ہمراہ ہوگئی۔ آخر کار یہ لوگ شہر پر قابض ہوگئے، اور ان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ صاحب عمدۃ المطالب لکھتے ہیں کہ اب تک ملتان کی حکومت ان کے خاندان میں چلی آتی ہے۔ حتی ملکہ وخوطب بالملک وملك اولادہ هناك۔ عمدۃ المطالب کے مؤلف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی اولاد حد درجہ زیادہ ہوئی۔ اور بقول ابو الیقظان ان میں سے اکثر نے اسمٰعیلی مشرب اختیار کر لیا اور ان کی زبان ہندی ہوگئی تھی۔

منهم ملوك وامراء وعلماء ونسابون واكثرهم على
رَأْيِ الإِسْمٰعِيلِيَّةِ وَلِسَانُهم هندى

علامہ سید عبد الحی حسنی اپنی مشہور کتاب نزہتہ الخواطر میں لکھتے ہیں کہ پہلے علوی بزرگ جنہوں نے حجاز سے ہجرت فرما کر ملتان کو اپنا وطن بنایا وہ جعفر بن محمد بن عبد اللہ بن محمد بن عمر الاطرف بن علی بن ابی طالب تھے۔ انہوں نے ملتان پر قبضہ کیا، اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور پھر ان کی اولاد در اولاد ۳۶۴ھ تک ملتان پر حکمراں رہی۔ ان کی اولاد میں بقول ابن خداع ۴۸ صاحبزادے تھے۔ بقول بیہقی ۸۰ تھے، اور بقول شیخ مشرف آبادی یہ تعداد ۵۰، ۶۰ کے لگ بھگ تھی، ابو الیقظان اس بارے میں زیادہ صحیح معلومات رکھتے تھے، وہ ان کی تعداد بہت زیادہ بتاتے تھے۔ ان میں بادشاہ بھی تھے، علماء اور نسّاب بھی تھے۔ ان میں سے اکثر اسمٰعیلی مسلک کے پیرو تھے۔ (نزہتہ الخواطر اردو حصہ اول طبقہ ثالثہ صفحہ ۱۰۹)

جمال الدین احمد صاحب کی اس عبارت سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:۔
۱۔علوی خاندان سے سب سے پہلے جعفر بن محمد ملتان تشریف لائے۔
۲۔ اہل ملتان نے انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔
۳۔ ان کی اولاد ۳۶۴ھ تک ملتان پر حکومت کرتی رہی۔
۴۔ اُن میں سے اکثر اسمٰعیلی مسلک کے پیرو تھے۔

شجرے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جعفر مولائے کائنات حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی پانچویں پشت میں اولاد تھے۔ اور یہ زمانہ ہارون الرشید کا ہی ہو سکتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محمد بن عدی گورنر سندھ جب ملتان پر قبضہ کرنے کے لئے پہنچا تو یہاں حضرت جعفر بن محمد علوی اپنی پوزیشن مضبوط بنا چکے تھے۔ اہلِ ملتان نے محمد بن عدی کے مقابلے میں ان کی مدد کی اور یہ محمد بن عدی پر غالب آئے اور اس کے بعد بنو سامہ کے عروج تک یہ خاندان ملتان پر حکومت کرتا رہا۔ لیکن افسوس ہے سوائے جمال الدین احمد کے کسی مؤرخ نے علویوں کی حکومت کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ ضلع ملتان میں علویوں کا وجود اس دعویٰ کا مصدق اور مؤید ضرور ہے۔ دیہات میں علوی کافی تعداد میں آباد ہیں۔ کہیں یہ لفظ مسخ ہو کر آلوی بن گیا ہے۔

بعض قرائن اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ خود امیر ابوالّلباب المبنہ بن اسد ہی علوی قریشی تھے۔ یہ لفظ سامی نہیں بلکہ شامی ہے۔ بنو امیّہ کے ختم ہو جانے پر جب بنو عبّاس نے بغداد کو اپنی طاقت کا مرکز بنایا اور حجاز سادات کرام کے لئے جائے امن نہ رہا تو انہوں نے شام کا رُخ کیا۔ عین ممکن ہے حضرت محمد بن عبداللہ ارضِ پاک سے شام منتقل ہوئے ہوں اور پھر ان کی اولاد کرام نے یہاں بھی زندگی خطرے میں محسوس کرتے ہوئے ملتان کا رُخ کیا ہو!

مؤرخین خود بنو سامہ کے ابتدائی حالات سے بے خبر ہیں۔ چنانچہ سید ابوظفر ندوی تاریخ سندھ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"۲۹۰ھ میں ابن رستہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس وقت ملتان میں بنومنبہ کی حکومت ہے۔ پس سوال یہ ہے کہ بنو منبہ کی حکومت کب سے شروع ہوئی۔" (ص ۲۵۴)

پھر خود ہی تخمین و قیاس سے کام لے کر لکھتے ہیں کہ :۔

"میرا خیال ہے کہ محمد بن قاسم کے بعد سندھ میں جو ابتری پھیلی اس سے فائدہ اٹھا کر امیر داؤد نصر بن ولید عمانی نے خود مختار حکومت قائم کر لی۔" (ص ۲۵۴)

پھر امیر داؤد عمانی اور بنو سامہ کا ڈانڈا اس طرح سے ملایا ہے :۔

"امیر داؤد عمانی النسل تھا اور عمان میں بنو سامہ عرصہ سے مقیم تھے اس لئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ داؤد ہی کی نسل ۳۷۵ھ تک ملتان میں بنو منبہ کے نام سے حکومت کرتی رہی تو غیر موزوں بات نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کے خلاف کوئی دلیل میری نظر سے نہیں گزری۔" (ص ۲۵۴)

اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ مولانا سید عبدالحی حسنی نزہتہ الخواطر، جلد اوّل میں صاف طور پر لکھتے ہیں کہ

"جعفر بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن عمر الاطرف بن علی بن ابی طالب نے ملتان پر قبضہ کیا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور پھر ان کی اولاد، در اولاد ۳۶۲ھ تک ملتان پر حکمران رہی۔ ان میں سے اکثر اسمٰعیلی مشرب کے تھے۔"

ہماری تحقیق یہ ہے کہ ملتان کی پہلی حکومت جو بھی تھی، وہ ہشام بن عمرو تغلبی کے

حملہ پر ختم ہو گئی تھی۔ یہی زمانہ حضرت جعفر بن محمد علوی کی آمد کا ہے۔ اس نے ملتان پر قبضہ کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ محمد بن عدی آیا تو اُسے بھی مار پیٹ کر بھگا دیا اور پھر سنہ ۳۷۳ھ تک بلا شرکتِ غیرے اس ملک پہ حکومت کرتے رہے۔ سنہ ۱۵۲ھ سے ۳۷۳ھ تک ۲۲۱ برس ہوتے ہیں۔

مقدسی علویوں کے آخری دور میں ملتان آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہاں غلّہ سستا ہے، مکانات اچھے ہیں نہ زیادہ عمارتیں سا گوان کی لکڑی کی ہیں اور اکثر مکانات کئی منزلوں کے ہیں۔ ان لوگوں میں زنا نہیں ہے۔"

اسمٰعیلی

علوی اسمٰعیلی کیوں بنے۔ اس کی بھی وجہ ہے۔ حضرت امام جعفر صادق رحؒ کی وفات کے بعد شیعوں کے دو فرقے ہو گئے تھے۔ ایک نے سیدنا حضرت موسیٰ کاظم علیہ السّلام بن سیدنا امام جعفر صادق علیہ السلام کو امام اور جانشین تسلیم کیا اور دوسرے نے سیّدنا اسمعیل بن امام جعفر صادق علیہم السلام کو۔ حضرت سیدنا اسمٰعیل علیہ السّلام کے بعد ان کے لڑکے سیّدنا حضرت محمد پھر سیدنا حضرت احمد رضیؓ پھر سیدنا حضرت محمد تقی الحبیب، ان کے بعد سیدنا حسین المرضیٰؓ اور ان کے خلیفہ سیدنا امام عبداللہ (علیہ اللہ المہدی) ہوئے جنہوں نے افریقہ میں سلطنت فاطمیہ کی بنیاد ڈالی۔ یہی فرقہ اسمٰعیلیہ کہلاتا ہے۔ علوی بنو عباس سے خائف تھے۔ انہیں دوسری طاقت صرف اسمٰعیلیہ ہی نظر آئی جان و مال اور ناموس کے تحفظ کے لئے اسمٰعیلیوں کی طرف مائل ہو گئے۔ عبداللہ المہدی نے جہاں تمام ممالکِ اسلامیہ میں اپنے داعی بھیجے، وہاں سنہ ۲۷۰ھ میں بزمانہ عبداللہ بن عمر ہباری ایک داعی ہیثم نامی سندھ روانہ کیا۔ یہ سندھ میں اسمٰعیلیوں کا پہلا داعی ہے۔ ان کا مرکز اُس وقت شام کے

ایک مقام سلمیہ میں تھا۔ تمام احکامات اسی جگہ سے جاری ہوتے تھے۔ مہدی نے جب افریقہ پر تسلط حاصل کر لیا تو قیروان اور پھر مہدیہ مرکز ہو گیا۔ سندھ میں داعی یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ منصورہ میں تو یہ لوگ کامیاب نہ ہو سکے مگر اہلِ ملتان اس کے ہمنوا ہو گئے۔ اور جب مصر پر اسمٰعیلی امام معز الدین اللہ کا قبضہ مستحکم ہو گیا تو والیٔ مکران، والیٔ ملتان اور والیٔ خراسان اس کا خطبہ پڑھنے لگے۔

جعفر بن محمد علوی کے اعزّہ و اقارب

ابنِ خلدون کتاب ثانی جلد نہم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا چچا زاد بھائی عبد الرحمٰن اپنے اعزّا و اقارب سمیت یمن میں آباد ہو گیا تھا، اور وہ یہاں خاصی طاقت کا مالک بن چکا تھا۔ چنانچہ ۲۰۹ھ میں جب عبد الرحمٰن نے خلیفہ مامون الرشید کے خلاف بغاوت کی تو اہلِ یمن نے آلِ محمد کی حمایت میں اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مامون نے اپنے غلام دینار کو بہت بڑی فوج کے ساتھ اس مہم پر روانہ کیا۔ جب شاہی لشکر یمن پہنچا تو عبد الرحمٰن نے مقابلے کی طاقت اپنے اندر نہ پا کر امن کی درخواست کی اور مامون کی اطاعت قبول کر لی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں علویوں کی جمعیت کافی بڑھ چکی تھی۔ یمن اور ملتان کے علویوں کا نقشہ درج ذیل ہے:۔

حضرت علی علیہ السلام
|
عمر الاطرف
|
محمد
|
عبد اللہ
|
محمد — احمد [1]
|
جعفر — عبد الرحمٰن ۲۰۹ھ

[1] تاریخ ابن خلدون۔ کتاب ثانی جلد نہم ص ۲۴۴

ملتان قرامطیوں کی لپیٹ میں!

بعض لوگ شیعوں اور قرامطیوں میں فرق نہیں کرتے۔ حالانکہ شیعہ اور سُنی مسلمانوں کے دو گروہ ہیں اور قرامطہ ملحد اور بے دین ہیں۔ ان کا اسلام کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ شیعانِ اہلبیت وہ ہیں۔ جنہوں نے سلیمان بن حرد کی ماتحتی میں قاتلانِ امام حسین علیہ السّلام سے انتقام لیا۔

پھر شیعوں میں دربارۂ امامت و تعیّن امام اختلاف ہو گیا۔ انہوں نے زید بن علی بن حسین علیہ السّلام کو ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں بیعت کے لئے کوفہ بلا بھیجا۔ جب حضرت تشریف لے آئے تو انہوں نے آپ سے استدعا کی کہ قبل اس کے کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں، آپ اِس امر کا اعلان کریں کہ آپ حضرتِ علی بن ابی طالب علیہ السلام کو امام برحق اور وصی جانتے ہیں۔ اور شیخین (ابوبکر و عمر) سے بیزاری اور تبرّا کرتے ہیں۔ لیکن حضرت زید نے نہ تو شیخین سے بیزاری کی اور نہ تبرّا کیا۔ اِس پر ایک گروہ نے ان کی رفاقت ترک کر دی اور رافضی کہلائے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو امامتِ بنی فاطمہ کا قائل ہے اور حضرت علی اور ان کے صاحبزادگان سیدنا امام حسن و سیدنا امام حسین علیہما السلام کو کل صحابہ پر بچند شروط افضل جانتا ہے۔ شیخین کی امامت اس کے نزدیک صحیح ہے، باوجودے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کو سب صحابہ سے افضل جانتا ہے۔ یہ فرقہ زیدیہ کہلاتا ہے یہ مذہب زید شہید اور ان کے متبعین کا ہے۔ یہ فرقہ انحراف اور غلو سے بہت دُور اور جادۂ اعتدال سے بہ نسبت دُوسرے شیعوں کے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح اسمٰعیلیہ

جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اُن میں اور دوسرے مسلمانوں میں بنیادی طور پر کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے کہیں سُنّی حکمرانوں نے شیعہ مذہب کی بنا پر شیعہ حکام پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی شیعہ حکومت نے محض سُنّی ہونے کی بنا پر کسی مسلمان کو تنگ کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے بیجا پور، احمد نگر، یا گولکنڈہ کے بادشاہوں پر اس لئے حملے نہیں کئے تھے کہ وہ شیعہ تھے، بلکہ اس لئے کہ ان کی شاہ ایران کے ساتھ مغل حکومت کے خلاف سازش پکڑی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو انشائے طاہر وحید۔ شاہ ایران نے اُنہیں لکھا تھا کہ میں مغرب سے حملہ کرتا ہوں تم مشرق سے ان پر ٹوٹ پڑو، اور مغل سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ اودھ کے بادشاہ مذہباً شیعہ تھے۔ مگر واجد علی شاہ کے دور تک کبھی سُنّی شیعہ جھگڑا نہیں ہوا۔

لیکن

قرامطی ایسا بے دین فرقہ ہے۔ جس پر دوسرے مسلمان فرقوں کی طرح شیعہ حضرات نے بھی لعنت کی ہے۔ ذیل میں ہم قرامطیوں کے معتقدات پر اجمالاً روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ لوگ عبداللہ میمون ایرانی کے پیروکار تھے۔ جس نے ادیانِ عالم کو مٹانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس کے مذہب کا خلاصہ یہ تھا کہ سارے مذاہب بیہودہ ہیں۔ دُنیا اور عقبیٰ میں نہ نیک اعمال کی جزا ہے نہ بداعمال کی سزا۔ احمد قرمط اسی عبداللہ کا مرید تھا۔ اس نے وحشی اقوام کو جو عقل سے عاری، اور مذہب سے بیگانے تھے، اپنے دین کی طرف بلایا اور اعلان کیا کہ:۔

۱۔ نماز کی صرف ۲ رکعتیں ہیں۔ دو طلوعِ شمس سے پہلے اور دو غروبِ شمس سے پہلے ادا کی جائیں۔

۲۔ بجائے بیت اللہ کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی جائے یہی وجہ ہے کہ ابو طاہر سلیمان قرمطی نے ۳۱۹ھ میں مکہ پر حملہ کر کے حرم میں خونریزی کی۔ بیت اللہ کا دروازہ توڑ ڈالا۔ حجر اسود کو اکھڑوا کر اپنے مستقر ہجر کو بھجوا دیا۔ غلافِ کعبہ کو اتروا کر ٹکڑے ٹکڑے کیا، اور پھر اپنے ہمراہیوں میں بانٹ دیا۔ اہل مکہ کو لوٹ لیا۔ جو حجاج حرم کعبہ میں مصروف عبادت تھے، انہیں بے دریغ قتل کر دیا۔ اور ان کی لاشوں کو چاہِ زمزم میں پھینک دیا۔ باقیوں کو جہاں وہ مارے گئے تھے۔ وہیں بلا غسل و جنازہ و کفن دفن کر دیا۔ عبید اللہ المہدی کو جب ان کی ان ملعون حرکتوں کا علم ہوا تو انہیں لعنت و ملامت کی۔ اپنی سطوت و شوکت سے ڈرایا۔ جب کہیں جا کر انہوں نے حجرِ اسود واپس منگوا کر دیوارِ کعبہ میں پیوست کیا اور مکہ مکرمہ سے دفان ہوئے۔

جب جلم بن شیبان نے ۳۷۳ھ میں ملتان پر قبضہ کیا، تو محمد بن قاسم کی مسجد بند کرا دی۔ سورج مندر کو گرا کر نئی مسجد اس میں تعمیر کی اور اس کا رخ بیت المقدس کی طرف کیا۔ جو لوگ ایسے ملحدوں کو شیعہ یا اسمٰعیلی کہتے ہوئے نہیں تھکتے، دراصل وہ اس فرقہ کے مذموم معتقدات سے بے خبر ہیں۔

۳۔ قرامطیوں کے نزدیک سال بھر میں صرف دو روزے فرض ہیں یعنی مہرجان اور نیروز کے دن۔

۴۔ شراب حرام، خمر حلال

۵۔ جنابت سے غسل کرنا لازم نہیں۔

۶۔ جس جانور کے دانت اور پنجے ہوں ان کا کھانا درست ہے۔

۷۔ جمعہ کی جگہ اتوار یوم السبت ہے۔
اس فرقہ نے ۲۹۰ھ میں شام پر ہولناک حملہ کیا۔ ۳۱۱ھ میں کوفہ اور بصرہ کو لوٹا۔ اور ۳۱۹ھ میں مکہ مکرمہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بیس برس تک ایسے مقدس شہر کو جس کی شان میں بلدۃ طیبۃ ورب غفور آیا ہے اور جس کی خداوند کریم نے قرآن میں قسم کھائی ہے۔ اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے رکھا۔
قرامطی اسمٰعیلیوں کے لباس میں پورے سندھ پر چھا چکے تھے۔ ملتان کا حاکم چونکہ مذہباً اسمٰعیلی تھا۔ وہ ان کی سازشوں سے بے خبر رہا۔ جلم بن شیبان نامی ایک قرمطی سردار جو عرصہ سے موقع کا منتظر تھا اس نے ایک رات اپنے ہجوم سے دفعتہً علویوں پر حملہ کر دیا۔ بے خبری کے عالم میں وہ اپنے بچاؤ کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔ اور اپنے نام نہاد ہم مسلکوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔
سید ابوظفر ندوی مؤلف تاریخ سندھ لکھتے ہیں کہ:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلم بن شیبان نے ملتان پر کوئی حملہ باہر سے نہیں کیا۔ بلکہ اندرونِ شہر بغاوت کرا کے خود مددگار بنا اور پھر سردار ہو گیا[1]"

جلم بن شیبان ۳۶۷ھ

اس نے ملتان پر قبضہ کر کے بظاہر فاطمی خلیفہ کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔ حالانکہ اسے فاطمی حکومت سے نہ کوئی ربط تھا اور نہ تعلق۔ محض اس لئے کہ اگر بنو عباس کی طرف سے کوئی حملہ ہو تو فاطمی خلیفہ سے امداد لی جا سکے۔ ورنہ یہ اگر اسمٰعیلی ہوتا تو پہلی اسمٰعیلی سلطنت کو ختم نہ کرتا۔

---

[1] تاریخ سندھ ص ۲۵۶

اُس نے ملتان کے بڑے بُت (سورج مندر) کو توڑ ڈالا، جو محمد بن قاسم کے وقت سے اب تک محفوظ چلا آتا تھا۔ اور جس کے سبب ملتان کے حکمران مالی اور سیاسی مفادات حاصل کرتے تھے۔ محمد بن قاسم کی مسجد کو بند کرا دیا۔ اُس نے اپنے مذہب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ سلطنت کو بھی مضبوط بنانے کی ممکن حد تک کوشش کی۔ گرد و پیش کے راجوں مہاراجوں سے عہد نامے کئے اور ہمسایہ اسلامی سلطنتوں کے حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ کیونکہ تمام مسلمان حکمران مذہبی اور سیاسی طور پر خلافتِ بغداد سے منسلک تھے۔

شیخ حمید ۳۷۶-۸۰ھ

یہ طے شدہ بات ہے کہ ملتان کا عظیم بُت جلم بن شیبان نے توڑا تھا۔ بشاری مقدسی جب ۳۷۵ھ میں ملتان وارد ہوا تو بت صحیح سالم تھا لیکن ۳۷۷ھ میں ملتان کے تخت پر شیخ حمید نظر آتا ہے۔ اس لئے لامحالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جلم کا انتقال ۳۷۶ھ میں ہوا ہوگا!

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عباسی اور فاطمی سلطنتوں میں سخت رقابت تھی۔ امیرِ ملتان خوب جانتا تھا کہ اگر ان دونوں حکومتوں کی رقابت کے سبب ترکوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تو ہماری خیر نہیں۔ اس لئے جب سبکتگین نے ۳۸۰ھ میں راجہ جے پال سے دُوسری جنگ کی تو شیخ حمید نے جے پال کا ساتھ دیا۔ سبکتگین نے اس وجہ سے کہ شیخ نے جنگ میں اس کے حریف کا ساتھ دیا تھا، نیز یہ کہ اعتقاداً ملحد تھا۔ اس نے جے پال سے فارغ ہو کر ملتان کا رُخ کیا، مگر شیخ حمید نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ وہ اس وقت

سے یار و مددگار رہے۔ اس نے دب کر سلطان سے صلح کر لی اور سالانہ خراج پر معاملہ طے ہو گیا۔[1]

شیخ ابو الفتوح داؤد بن نصر

امیر سبکتگین اور شیخ حمید کا معاہدہ غالباً ۳۸۲ھ میں ہوا۔ اور اس کے بعد سبکتگین خراسان کے معاملات میں کچھ ایسا الجھا کہ اسے ہندوستان کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی۔ سلطان محمود غزنوی بھی ابتداءً خراسان کی دلدل میں پھنسا رہا۔ جب ادھر سے اطمینان ہو گیا تو اس نے ہندوستان کا رخ کیا، اور ۳۹۶ھ میں جب اس نے ملتان پر حملہ کیا تو اس وقت ملتان کے تخت پر شیخ داؤد بن نصر متمکن تھا۔ شیخ حمید سے داؤد بن نصر تک ۱۵۔۱۶ برس کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں ترکوں نے ملتان میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس دوران ملتان و اہل ملتان کی طرف سے ترکوں کے خلاف کوئی غیر وفادارانہ حرکت نہیں ہوئی۔ کسی تاریخ سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ جلم بن شیبان اور شیخ حمید کے درمیان کیا تعلق تھا۔ شیخ حمید جلم کا بیٹا تھا یا داعی!

شیخ حمید کے بعد اس کا بیٹا داؤد منظر عام پہ آتا ہے یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ داؤد کے باپ نصر بن حمید کو بھی حکومت کرنے کا موقع ملا ہے یا نہیں، ۳۹۵ھ تک داؤد بن نصر غزنی کے تخت کا وفادار رہا۔ لیکن اس سال اس سے ایسی حرکت ظہور میں آئی کہ غزنی کے تاجدار سلطان محمود غزنوی نے اس کی گوشمالی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

[1] تاریخ سندھ از مولانا سید ابو ظفر ندوی ص ۲۶۱

کوٹ بھاٹیہ پر محمود کا حملہ

کوٹ بھاٹیہ، جس کو عرب اور افغان مؤرخین نے "الباطیہ" سے موسوم کیا ہے، جلال پور پیروالہ اور لودھراں کے درمیان مشہور سڑک پر واقع ہے۔ برصغیر کے مؤرخین نے بھاٹیہ کے بارے میں عجیب شوشے چھوڑے ہیں۔ بعض نے بھیرہ کو بھاٹیہ لکھا ہے اور بعض نے اس کا محل وقوع جہلم کے قریب بنایا ہے۔ اور اسے بجائے بھاٹیہ کے بھٹنیر بنا دیا ہے۔ مولانا سید ابوظفر ندوی تاریخ سندھ میں اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ملتان کی سرحد سے متصل ایک مضبوط قلعہ مقام بھاٹیہ میں تھا۔ اگرچہ اس کا قلعہ لاہور کے تابع تھا۔ مگر اس کا حاکم بجے راؤ لاہور کے راجہ کی پروا نہیں کرتا تھا۔ تقریباً اپنے کو خود مختار سمجھتا تھا۔ انہی دنوں اپنی طاقت کے نشے میں چور ہو کر غزنہ کے حکام کے ساتھ کسی سرحدی معاملے پر بدعنوانی سے پیش آیا۔ سلطان محمود کو جب اس کی خبر ہوئی تو ۳۹۵ھ میں ایک جرار لشکر لے کر ملتان کی سرحد سے گزرتے ہوئے بھاٹیہ جا پہنچا۔ بجے راؤ نے اپنی شکست سے مایوس ہو کر خودکشی کر لی۔ قلعہ فتح ہو گیا۔ اور محمود مال غنیمت لے کر غزنہ واپس لوٹ گیا۔" (ص ۲۶۴)

نیاز فتحپوری کی گل فشانیاں

علامہ نیاز فتحپوری نے اس سلسلہ میں جو گل فشانیاں کی ہیں۔ وہ بے حد دلچسپ ہیں اور حد درجہ تعجب خیز بھی کہ جب مورخ لوگ ایک دفعہ پھسلتے ہیں تو پھر پھسلتے ہی جاتے ہیں اور ان کا سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

علامہ مرحوم بھاٹیہ کی جنگ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"۳۹۵ھ میں بھیرہ پر حملہ ہوا۔ جسے عام طور پر مؤرخین نے بھاٹیا، بھٹیا، بھٹنا تحریر کیا ہے۔ برگس نے تاریخ فرشتہ کا ترجمہ کرتے ہوئے اس مقام کی تعیین سے معذوری ظاہر کی ہے۔ مسٹر الفنسٹن نے ظاہر کیا ہے کہ

"یہ مقام صوبہ لاہور کے ماتحت ملتان کے جنوب میں واقع تھا"
برڈ نے اس کو بھٹینر سے تعبیر کیا ہے جو صحرائے بیکانیر کے انتہائی شمال میں واقع ہے ہمیر برگسٹال نے بہاول پور سمجھا ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی حدودِ ملتان سے گزر کر بھٹیا پہنچا۔ اور یہاں کا راجہ لاہور کے راجہ سے مختلف تھا۔ لیکن دوسری جگہ وہ ظاہر کرتا ہے کہ سلطنت لاہور کشمیر سے ملتان تک وسیع تھی۔ اور یہاں کا راجہ دریا کے سندھ کے ساحل پر جنگل میں چھپ گیا۔ عتبی کا بیان ہے کہ۔ محمود دریائے سندھ کو عبور کر کے بھٹیا پہنچا۔ اور یہاں کے راجہ نے بھاگ کر کسی پہاڑ میں پناہ لی۔"

اب ہم علامہ موصوف کے ان بیانات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

۱۔ ملتان کے جنوب میں کسی مقام کا لاہور سے متعلق ہونا بالکل خلافِ قیاس ہے، جبکہ ملتان آپ خود مختار تھا۔

۲۔ محمود کو کیا ضرورت تھی، کہ وہ پنجاب کے متعدد دریاؤں کو صرف اس لئے عبور کرتا کہ صحرائے بیکانیر کے ایک معمولی مقام پر قابض ہو جائے۔

۳۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ محمود اس قدر آسانی سے بہاول پور پہنچ جاتا،

جبکہ راستے میں سارا ملک جنگ آزما دشمنوں سے بھرا پڑا تھا۔
۴۔ راجہ بھٹیا کس طرح اپنے قلعے کو چھوڑ کر ایک صحرا میں پناہ لینا مناسب سمجھتا

یا

وہ پہاڑ میں کیونکر چھپ جاتا جبکہ اس کے چاروں طرف سو سو کوس سے زائد کہیں کسی پہاڑ کا پتہ نہیں ہے۔"

اخیر میں فیصلہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس نام کے پڑھنے میں مؤرخین نے غلطی کی ہے اصل میں اس کا نام بھیرا ہے جو دریائے جہلم کے بائیں ساحل پر کوہستانِ نمک کے نیچے واقع ہے اور اب بھی وہاں کے کھنڈر اس کی قدامت کا پتہ دیتے ہیں۔ خلاصۃ التواریخ میں بھیرا ہی لکھا ہے اور مسٹر ڈو نے تاریخ فرشتہ کے جس نسخہ سے ترجمہ کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ:۔
"ہر چند محمود نے بھٹیا کا قصد کیا تھا، لیکن اتفاق سے وہ شہر تہیرہ پہنچ گیا۔" ـــ چونکہ تہیرہ اور بھیرہ میں تجنیس خطی موجود ہے اس لئے ممکن ہے کہ غلطی سے بھیرہ کو تہیرا لکھ دیا ہو۔

یہاں ایک اور خیال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ پہلے بھیرہ کا نام بھٹیا رہا ہو۔ کیونکہ اب بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں بھٹی راجپوت رہتے تھے اور دریائے چناب پر پنڈی بھٹیاں کا وجود اس کی کافی شہادت ہے۔ عتبیؔ، ابن اثیر اور بیرونی نے بھی بھٹیا لکھا ہے، لیکن موجودہ جغرافیہ کے لحاظ سے اس کو اب بھیرہ ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔ چونکہ ملتان کا علاقہ کوہستانِ نمک تک وسیع

تھا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنی سے چل کر بنوں آیا ہوگا، اور
یہاں سے خرم ہوتا ہوا، اور عیسیٰ خیل کے قریب دریائے سندھ کو عبور
کرتا ہوا براہِ خوشاب و شاہ پور بھیرہ آگیا ہوگا۔" (اسلامی ہند ص ۸۹ و ۹۰)
علامہ نیاز فتح پوری کی بحث یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ انہوں نے بھیرہ کو بھٹیا بنانے اور سمجھنے میں جتنی توجیہات پیش کی ہیں سب کی سب بے اصل ہیں۔ کیونکہ "کوٹ بھٹیا" ابھی تک صفحۂ ارض پر اپنے اصلی نام کے ساتھ موجود ہے۔ یہ ایک گل ریز وادی ہے کہیں صحرا نام کو نہیں۔ دریا کے قرب کی وجہ سے ریت کے چند ٹیلے ضرور موجود تھے جنہیں عرب مؤرخین نے پہاڑ کا نام دیا۔ راجہ کو جب شکست ہوئی تو وہ اِنہی ریت کے تودوں اور جنگل کے گھنے درختوں میں چھپ گیا اور پھر آگے نکل گیا۔ اوچ کا تاریخی اور قدیم شہر اس مقام سے قریب پڑتا ہے۔ یقیناً راجہ نے اس کا رُخ کیا ہوگا۔
اگرچہ کوٹ بھٹیا کا قدیم قلعہ اور شہر کھنڈر بن چکا ہے۔ مگر جدید آبادی انہی کھنڈرات کے قریب کوٹلہ بھٹیاں کے نام سے موجود ہے۔
کوٹلہ بھٹیاں کے قدیم کھنڈرات دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں، جو اس شہر کی وسعت اور عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔ کوٹلہ بھٹیاں کے گرد و پیش شہداء کے چار عظیم قبرستان ملتے ہیں، جو دو دو تین تین میلوں کے فاصلے پر واقع ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں جنگ ہوئی وہیں شہداء کو دفن کر دیا گیا۔
ان قبرستانوں کے نام یہ ہیں :-

۱۔ بیگ شہید
۲۔ مڑیچی والا۔ یہ کوٹ بھٹیا کے قریب ترین واقع ہے۔ ظاہر ہے، کہ جو

مجاہدین شہر کے قریب لڑتے ہوئے مارے گئے وہ اسی جگہ دفن کر دئے گئے
۳- شاہ کمال (شہید ہوئے)
۴- مہینوال شہید
امتدادِ زمانہ سے قبرستانوں کے نام مسخ ہو چکے ہیں۔ مگر ان کا وجود بڑی جنگوں کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

علامہ صاحب نے ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ چونکہ ملتان خود مختار تھا کوٹ بھٹیا لاہور سے متعلق کیونکر ہو سکتا تھا۔

یہ سب کچھ اس دور کی تاریخ اور اس علاقہ کے جغرافیہ سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ علامہ موصوف ایسا اعتراض نہ کرتے۔ دراصل قدیم زمانے میں ملتان کی حدود سکہ تک ختم ہو جاتی تھیں۔ یہ علاقہ جس میں کوٹ بھٹیا اور اسکندرہ واقع تھا ایک الگ صوبہ تھا۔ مسلمانوں نے پہلے کوٹ بھٹیا کو فتح کیا، اور اس کی انفرادیت کو قائم رکھا۔ پھر ملتان فتح ہوا اور یہ اپنی حدود تک محدود رہا۔ چنانچہ جو گورنر ملتان پر متعین ہوئے یا بعد میں جو خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں ان میں کوئی حکمران ایسا نہ تھا جو سلطنت کو وسعت دینے کی کوشش کرتا۔

محمود کا ملتان پر حملہ

مولانا سید ابو ظفر ندوی مؤلف تاریخ سندھ اس حملے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چونکہ یہ جنگ ملتان کی سرحد پر ہوئی تھی۔ اِس لئے سلطان محمود کو بجا طور پر یہ خیال تھا کہ ملتان کی ریاست اس معاملے میں ہر طرح کی امداد دیگی۔ لیکن معاملہ غالباً اس کے برعکس ہوا۔ نوجوان داؤد نے اپنی ناتجربہ کاری سے

ترکوں کی امداد نہ کی، بلکہ اس کے خلاف ایسی کاروائیاں کیں جس سے محمود
ناراض ہو گیا۔ محمود اُس وقت تو کچھ نہ بولا، لیکن غزنہ پہنچ کر فوجی تیاریوں
میں مشغول ہو گیا۔ ۳۹۶ھ میں تازہ دم فوج لے کر ملتان پر حملہ کے لئے روانہ
ہُوا۔ مگر وہ خوب جانتا تھا کہ اگر داؤد کو میرے اِس حملے کی خبر ہو گئی تو وہ اپنے
بچاؤ کی فوراً کوئی تجویز کرے گا۔ اس لئے درۂ بولان کے قریبی رستہ کو چھوڑ
کر درۂ خیبر کی طرف سے دریائے سندھ کو عبور کرنا چاہا۔ لاہور کے تخت پر
اس وقت جے پال کا لڑکا انند پال تھا۔ اور یہ علاقہ اسی کے ماتحت تھا۔ محمود
نے اس سے کہا کہ مجھے راستہ دے دو، تاکہ آسانی کے ساتھ میں ملتان چلا
جاؤں۔ انند پال نے کسی صورت سے اپنی رضامندی ظاہر نہ کی۔ بلکہ جنگ کے
لئے تیار ہو گیا۔

تاریخ ایمنی میں لکھا ہے کہ اس حملہ کی خبر ابوالفتوح داؤد کو بھی ہو گئی۔
وہ یہ سُن کر بہت گھبرایا۔ اور غالباً لاہور کے راجہ سے اس کا معاہدہ تھا کہ وقت پر
ایک دُوسرے کی مدد کریں گے۔ اس لئے اس نے راجہ انند پال کو اس کی اطلاع
دی۔ اور اس نے حقِ ہمسائیگی اور سیاسی مصلحت کی بنا پر محمود کا راستہ روکنے کے
لئے بڑی فوج کے ساتھ پشاور پہنچ گیا۔ دونوں میں جنگ ہوئی۔ راجہ شکست
کھا کر بھاگا۔ ترکوں نے اس کا تعاقب دریائے چناب تک کیا۔ راجہ نے جب
بلا اپنے پیچھے آتی دیکھی تو اس نے بھاگ کر کشمیر کے دروں میں پناہ لی[1]۔

محمود نے بھی اس کا پیچھا چھوڑ دیا اور بھٹنڈا کی راہ سے ملتان جا پہنچا۔
داؤد نے بچشمِ عبرت دیکھا کہ انند پال جو اس سے زیادہ طاقت ور راجہ تھا۔

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۴ و ۲۵، نولکشور

اس پر کیا گزری۔ تو اس نے مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور قلعہ بند ہو گیا۔ محمود نے خود آ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ سات روز تک رہا۔ آخر شہر کے معزز لوگوں نے یہ حالت دیکھ کر دونوں میں صلح کرا دی اور معاہدہ میں طے یہ ہوا کہ امیر ملتان ہر سال دو لاکھ درہم[1] بطور خراج غزنہ بھیجا کرے، اور غالباً یہ بھی طے ہوا کہ ملتان کا ایک حصہ جو دریائے سندھ سے متصل تھا وہ محمود کو دے دیا جائے۔

اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری دفعہ جب وہ ملتان پر حملہ آور ہوا تو بقیہ ملک پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور یہ کام محمود نے صرف اس لئے کیا کہ اگر آئندہ پھر اس قسم کی مہم پیش آئے تو چکر کاٹ کر دوسرے ملکوں سے گزرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اور چونکہ دونوں کی سرحدات اب مل گئی تھیں۔ اس لئے حملہ کے وقت فوجی نقل و حرکت میں کسی قسم کی دشواری پیش آنے کا امکان نہیں رہا تھا سلطان مفتوحہ ممالک کا وائسرائے سکھ پال المعروف نواسہ شاہ کو مقرر کر کے غزنی واپس لوٹ گیا۔

سکھ پال کی بغاوت

سکھ پال راجہ جے پال کا نواسہ تھا۔ پشاور کی جنگ میں ابو علی سنجری نے اسے قید کر کے مسلمان کیا، اور سلطان کی خدمت میں لے آیا۔ سلطان اس نو مسلم شہزادے پر اتنا مہربان ہوا کہ جب ملتان کی مہم سے فارغ ہو کر واپس

---

[1] زین الاخبار ص ۶۷ و ۶۸ ۔ برلن۔ لیکن عتبی نے دو کروڑ درہم لکھا ہے اور ایلیٹ نے فرشتہ کے حوالہ سے بیس ہزار دینار لکھا ہے۔ تحفۃ الکرام صد ہزار دینار (دس کروڑ درہم) لکھتا ہے۔ فرشتہ نیز یہ بھی لکھتا ہے کہ بیس ہزار دینار خراج مقرر کر کے آئندہ کے لئے غیر ملکی عقائد سے توبہ کر لی گئی۔ عنصری لکھتا ہے کہ محمود نے اس حملے میں ۲۰۰ قلعے فتح کئے۔

غزنی جانے لگا تو اس نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک کا اسے وائسرائے بنا دیا۔ لیکن جب سلطان ایلک خاں کے مقابلے سے فارغ ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ سُکھ پال مرتد ہو گیا ہے۔ اس لیے اس نے پھر ہندوستان کا قصد کیا اور سُکھ پال سے چار لاکھ درہم تاوان وصول کر کے اُسے قید کر لیا۔

محمود کا ملتان پر دُوسرا حملہ

۳۹۹ھ میں انند پال ہندوستان کے تمام راجوں مہاراجوں کا لشکر لے کر گھٹا کی طرح لاہور سے اُٹھا اور پشاور پر چھا گیا۔ سلطان کو علم ہوا تو وہ اپنی فوج لے کر آگے بڑھا۔ چالیس دن تک دونوں لشکر آمنے سامنے پڑے رہے۔ انجامِ کار سلطان نے خندقیں کھدوا کر ایک ہزار تیر اندازوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوتے ہی جنگ شروع ہو گئی۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ محمود کی قلیل فوج ہندوؤں کے اِس بحرِ ذخار سے بمشکل جانبر ہو سکتی۔ لیکن اتفاق سے انند پال کا ہاتھی تیروں کی بارش اور روغنِ نفط کے شعلوں سے ڈر کر بھاگا۔ اور اس طرح تمام ہندو سپاہ کے پاؤں اکھڑ گئے اور تیس ہاتھیوں کے علاوہ بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کے بعد محمود غزنوی نگر کوٹ (کانگڑہ) روانہ ہوا۔ تین دن کے محاصرے کے بعد یہ قلعہ بھی فتح ہوا اور بے اندازہ دولت ہاتھ آئی۔

داؤد بن نصر نے ۳۹۹ھ کی جنگ میں جو کہ اپنے وقت کی کفر اور اسلام کی سب سے بڑی جنگ تھی۔ سلطان کی کوئی مدد نہیں کی، نیز سلطان کو اِس امر کی برابر اطلاعات مل رہی تھیں کہ داؤد مرتد ہو چکا ہے اور حسبِ سابق قرامطی معتقدات و افعال کی سختی سے پابندی کر رہا ہے۔ سلطان نے فیصلہ کر لیا کہ قرامطیوں

کے منحوس وجود سے ملتان کو یکسر پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ در پردہ تیاری میں مصروف رہا۔ اور ۴۰۱ھ میں دفعتہً اس طرح ملتان پہنچا کہ داؤد کو سنبھلنے کا موقع تک نہ ملا۔ غالباً یہ لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ مگر سلطان نے ایک زبردست اور شدید حملہ کر کے ملتان فتح کر لیا۔ پھر ایک باغی شہر کا جو حال ہو سکتا تھا، وہ اس کا ہوا۔ اس نے باغیوں کو عبرتناک سزا دی۔ کسی کا ہاتھ پیر کاٹ ڈالا کسی کو قتل کیا اور بڑی تعداد کو قید کر دیا۔ انہی میں شیخ داؤد بن نصر بھی تھا۔ سلطان جلم بن شیبان کے تمام خاندان کو قید کر کے غزنی لے گیا۔ اور وہاں انہیں قلعہ غور میں نظر بند کر دیا۔ شیخ داؤد اسی قلعہ میں ہی اس جہان سے چل بسا[1]۔ اس حملہ نے ملتان کی چولیں ہلا دیں۔ مراۃ مسعودی میں لکھا ہے کہ ملتان سلطان محمود کے فتح کر لینے کے بعد ویران ہو گیا۔ وہاں کے زمیندار اور اُمراء سب اُچ چلے گئے۔ اُسی کو آباد کر کے پایۂ تخت بنایا۔ اس وقت یہاں کا راجہ انگ پال تھا[2]۔

سلطان کے اس حملے سے بظاہر قرامطہ کا اثر ملتان سے زائل ہو گیا۔ محمود نے قرامطہ کی مسجد کو بند کرا دیا۔ اور پہلی مسجد جسے محمد بن قاسم نے تعمیر کرایا تھا اسے آباد کیا اور علماء و مشائخ کو اس امر پہ مقرر کیا کہ وہ مسلمانوں کے معتقدات کو درست کریں۔ قرامطی یہاں سے بھاگ کر منصورہ پہنچے۔ اور اچانک اس پر قابض ہو گئے۔ کیونکہ ہباری خاندان اُس وقت بہت کمزور ہو چکا تھا۔ مگر ۴۱۶ھ میں سلطان محمود نے منصورہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور قرامطی بہت سے رفقاء کے ساتھ جنوبی ہندوستان کی طرف منتقل ہو گئے۔ ان کے باقیات گجرات وغیرہ میں اب تک موجود ہیں اور اسمٰعیلیوں کے بھیس میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

---

[1] زین الاخبار صفحہ ۷۰ برٹن [2] مراۃ مسعودی ص ۳۷ و ۳۸ قلمی حبیب گنج لائبریری

ورنہ اسمٰعیلیوں اور ان کے معتقدات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

محمود غزنوی کی آخری یلغاریں

محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ ان حملوں سے اس کا مقصد ہندوستان میں کوئی مستقل قیام کرنا نہ تھا۔ تاہم پنجاب کا تمام حصّہ سلطنتِ غزنہ میں شامل ہو گیا تھا۔ اور قنوج و گجرات تک اس کا سکہ چلتا تھا۔ محمود نے ملک ایاز کو لاہور کا پہلا گورنر مقرر کیا تھا۔ جس کا مزار پُر انوار ٹکسالی بازار لاہور میں اب تک موجود ہے۔ ملتان آخیر تک غزنوی یلغاروں کو خوش آمدید کہتا رہا۔ شعبان ۴۱۶ھ میں جب وہ سومنات پر حملہ آور ہوا۔ تو اس نے سامانِ رسد اور بار برداری کے جانور یہاں سے فراہم کئے۔ سومناتھ سے واپسی پر چونکہ سندھ کے جاٹوں سے سلطان کے لشکر کو سخت تکلیف پہنچی تھی۔ اس لئے اس نے ۴۱۷ھ میں ملتان پہنچ کر چودہ سو کشتیاں تیار کرائیں۔ ہر کشتی میں تین آہنی شاخیں (دو پہلو میں اور ایک سامنے) نصب کی گئیں۔ جب جاٹوں سے مقابلہ ہوا تو ان کی کشتیاں فولادی شاخوں کے صدمے سے چکنا چور ہو گئیں۔ اکثر جاٹ غرق ہو گئے۔ جو بچے وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد محمود کو ملتان آنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہ ۳۲ برس بڑے دبدبے سے حکومت کرنے کے بعد ۴۲۱ھ میں انتقال کر گیا۔

محمود کے جانشین

اس میں کچھ شک نہیں کہ محمود کے جانشین آرام طلب اور کمزور تھے

لیکن زوالِ سلطنت کا بڑا سبب ان کی ذاتی کمزوریوں کے علاوہ ترکمانوں اور ترکانِ غز کا خروج تھا، جو خراسان کی سرسبز و شاداب زمین پر ہجوم کئے ہوئے تھے۔ اور سلطنت غزنی کی وسعت اور کامیابی کو حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ محمود چونکہ بڑا اذی اقبال شخص تھا۔ اس لئے اس کی زندگی میں تو ترکوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے بعد دس سال کے اندر ہی اندر سلاجقہ نے دریائے سیحون کی سرزمین سے نکل کر سارے ایران کا احاطہ کر لیا اور سمرقند سے لے کر ابجین تک قبضہ کر کے محمود کے ایرانی مقبوضات کو غزنی سلطنت سے جدا کر دیا۔ اُدھر وہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن غزنی کے دربار میں نہایت آزادی سے صحبتِ مےخوارئی برپا ہوا کرتی تھی۔ اگر خوش قسمتی سے مسعود کو خواجہ حسن میمندی ایسا وزیر نہ مل جاتا تو غالباً انتظامِ سلطنت درہم برہم ہو جاتا۔

خواجہ حسن، محمود کا بھی وزیر رہ چکا تھا۔ لیکن بعد میں محمود نے اُسے قلعہ کالنجر میں قید کر کے حسنک کو اس کی جگہ مقرر کیا۔ جب امیر مسعود تخت نشین ہوا تو اس نے خواجہ میمندی کو آزاد کر کے عہدۂ وزارت کے لئے طلب کیا۔ چنانچہ جب خواجہ میمندی دربار میں آیا تو اس کی یہ شان تھی کہ ایک ارغوانی رنگ کی قبا جس پر نہایت نازک و نفیس کارچوب کیا گیا تھا زیبِ بدن تھی۔ سر پر زریں حاشیہ کا باریک ململ کا بڑا سا عمامہ تھا۔ طلائی زنجیر ایک ہزار اشرفی کے وزن و قیمت کی کمر میں تھی۔ جب وہ اندر پہنچا تو مسعود نے اس کو مبارکباد دی اور اس نے زمین بوس ہو کر موتیوں کا ایک قیمتی ذخیرہ پیش کیا۔ اس کے بعد مسعود نے اُسے مہرِ وزارت دی اور یہ اُسے

سر پر رکھ کر باہر نکل آیا۔ اسی وقت جبکہ خواجہ حسن میمندی پر انعام و اکرام کی بارش ہو رہی تھی۔ خواجہ حسنک، جس پر قرمطی ہونے کا الزام لگایا گیا تھا سنگسار ہونے کے لئے کشاں کشاں جا رہا تھا۔ اس حال میں کہ سر پر اس کے ایک عمامہ اور بدن میں ازار تھی۔ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کا حسین جسم چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ اور اس کا جوان چہرہ بالکل تصویر نظر آتا تھا۔ آخر کار اس کا سر ایک طشت میں مسعود کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کا جسم دار پر لٹکایا گیا۔ جہاں اس کی ضعیف ماں رو رو کر کہہ رہی تھی کہ:۔

"اے میرے بیٹے! تو بھی کیسا خوش قسمت ہے کہ ایک بادشاہ (محمود) نے تجھے یہ دنیا دی اور دوسرے فرمانروا (مسعود) نے تجھے دوسری دنیا کا بھی سردار بنا دیا۔"

باوجود اس کے مسعود میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں اور وہ کئی حیثیتوں سے اپنے باپ کا صحیح جانشین تھا۔ اس کی فیاضی اور دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے علی ثانی کہتے تھے اور شجاعت کی یہ کیفیت تھی کہ رستم ثانی اس کا لقب پڑ گیا تھا۔ اس کی جنگی تبر کو کوئی شخص اٹھا نہ سکتا تھا اور اتنا تھا لیکن وہ خود ایک ہی ضرب سے ہاتھی کو بٹھا دیتا تھا۔ علاوہ اس کے علم و ہنر کا وہ بہت بڑا مربی تھا اور خوبصورت عمارتیں کثرت سے تعمیر کر کے اپنے ملک کو دلہن کی طرح سجا دیا تھا۔ انتظام سلطنت سے بھی وہ غافل نہ تھا۔ جب بھی کسی نے سرکشی کی، خود پہنچ کر اس کو سزا دی۔ ان تمام محاسن کے باوجود فضا اس کے حق میں سازگار نہ تھی۔ کام سیدھا کرتا تو الٹا ہو جاتا۔

قرامطیوں کی جہد للبقا

محمود نے جلم بن شیبان کے پورے خاندان کو غزنی لاکر غور کے قلعے میں نظر بند کر دیا تھا۔ محمود کے انتقال پر جب مسعود تخت پر بیٹھا تو اس نے اس خاندان کے لوگوں کو جو زندہ رہ گئے تھے، آزاد کر دیا۔ یہ ملتان واپس آئے۔ اور دوبارہ اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس میں ابوالفتح داؤد کا نواسہ عبداللہ زیادہ سرگرم تھا۔ اس نے اسمٰعیلیوں کی تائید و حمایت حاصل کرنا چاہی، مگر چونکہ اب ان کے معتقدات ہر کہ ومہ پر ظاہر ہو چکے تھے۔ اس لئے اسے کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ اسمٰعیلیوں میں حکومت اور مذہبی عہدہ امام کی اجازت کے بغیر کوئی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اُن دنوں اسمٰعیلیوں کا امام جبل دروز (شام) میں مقیم تھا۔ اس نے اسمٰعیلیوں کی سربراہی کا منصب شیخ سومرہ کو دے رکھا تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا پال سربراہ مقرر ہوا۔ دروزیوں کے امام نے اس کے نام جو خط تحریر کیا تھا۔ اس کے متن کا ایک حصہ درج ذیل ہے۔

"ملتان اور ہندوستان کے مؤحدوں کے نام عموماً اور شیخ ابن سومرہ راجہ پال کے نام خصوصاً۔ ——— اے معزز راجہ پال! اپنے خاندان کو اُٹھا۔ مؤحدین اور داؤد اصغر کو سچے دین میں واپس لاکہ مسعود نے جو اسے حال ہی میں قید اور غلامی سے آزاد کیا ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ تو اس فرض کو انجام دے سکے۔ جو تجھ کو اس کے بھانجے عبداللہ اور ملتان میں تمام باشندوں کے خلاف انجام دینے کے

لئے مقرر کیا گیا ہے، تاکہ تقدیس اور توحید کو ماننے والے جہالت،
ضد، سرکشی اور بغاوت والی جماعت سے ممتاز ہو جائیں!"

اسمٰعیلیوں کے اس فرمان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قرامطیوں کو جاہل، عندی، سرکش اور باغی سمجھتے اور ان کی کوشش تھی کہ قرامطہ اپنے بے ہودہ معتقدات کو چھوڑ کر اسمٰعیلیہ مذہب میں واپس آجائیں۔ اس لئے علامہ سید ابوظفر ندوی لکھتے ہیں کہ

"ابوالفتح داؤد کے نواسے عبد اللہ کی یہ سرگرمیاں اسمٰعیلیوں کے
منشار کے خلاف تھیں!"

تاہم قرامطیوں نے اندر ہی اندر سازشیں جاری رکھیں۔ اور ملتان کی کلیدی اسامیوں پر چھا گئے۔ گو بظاہر ملتان سومروں کے قبضۂ اقتدار میں تھا، لیکن عملاً وہی قرامطی اس کے سیاہ و سفید کے مختار تھے۔ مسعود کے بعد غزنہ کے تخت پر جتنے فرمانروا بیٹھے، سب کے سب آرام طلب اور عیش کوش تھے۔ اس لئے بہت سا علاقہ ان کے قبضہ سے نکل گیا۔ اور محمود غزنوی کا کوئی فرزند ملتان کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔

سیّد جمال الدین ابوالفضل

شیخ محمد یوسف شاہ گردیز

علیہ الرحمتہ والغفران

ولادت	عمر شریف	مزار شریف	رحلت
۴۵۰ھ	۸۱ برس	ملتان شہر	۱۲ ربیع الاول ۵۳۱ھ

جب اسلام کی محافظ تلوار ٹوٹ گئی اور دینِ حنیف ایک دفعہ پھر بے یار و مددگار رہ گیا تو خداوندِ کریم نے اولیائے اُمت کو ہدایت کے اس سرچشمہ کا محافظ مقرر فرمایا۔ اور ہر قسم کی خیر و برکت انہیں عطا کی چنانچہ عین اُس وقت جبکہ ملتان دوبارہ قرامطہ کے زیر اثر آکر اسلامی شعار سے محروم ہو چکا تھا۔ حضرت قطب الاولیاء شاہ موج دریا علیہ الرحمۃ والغفران حکمِ الٰہی سے اس شہر میں تشریف لائے اور دریائے راوی کے کنارے مسندِ ارشاد قائم کر کے خلقِ خدا کی اصلاح میں مصروف ہوئے۔ ملتان شہر غزنوی حملوں کی ضربات اور قرامطیوں کی شکست و ریخت سے انتہائی بے بسی کے ساتھ پڑا کراہ رہا تھا۔ قلعہ اور شہر کی دیگر تمام آبادیاں تقریباً ویران ہو چکی تھیں۔ ہر طرف بے دینی اور بے حیائی کا دور دورہ تھا۔ بیچارے مسلمان امن تلاش کرتے پھرتے تھے۔ حضرت کی خانقاہ میں دو قسم کے لوگوں نے آنا شروع کیا۔ ایک وہ جو اسلام چھوڑ کر قرامطہ کے زیرِ اثر آ چکے تھے دُوسرے جو مسلمان تھے مگر سہمے ہوئے تھے۔ حضرت نے گمراہ طبقے کی دھیمے انداز میں وعظ و نصیحت کے ذریعے اصلاح شروع۔ مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور ہندوؤں کو لا اکراہ فی الدین کے فیضان سے خوش کیا۔ حضرت موج دریا راوی کے کنارے امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مصروف تھے کہ غزنی سے ایک اور بزرگ اس شان سے تشریف لائے کہ شیر پر سوار تھے اور

سلطان شہاب الدین غوری
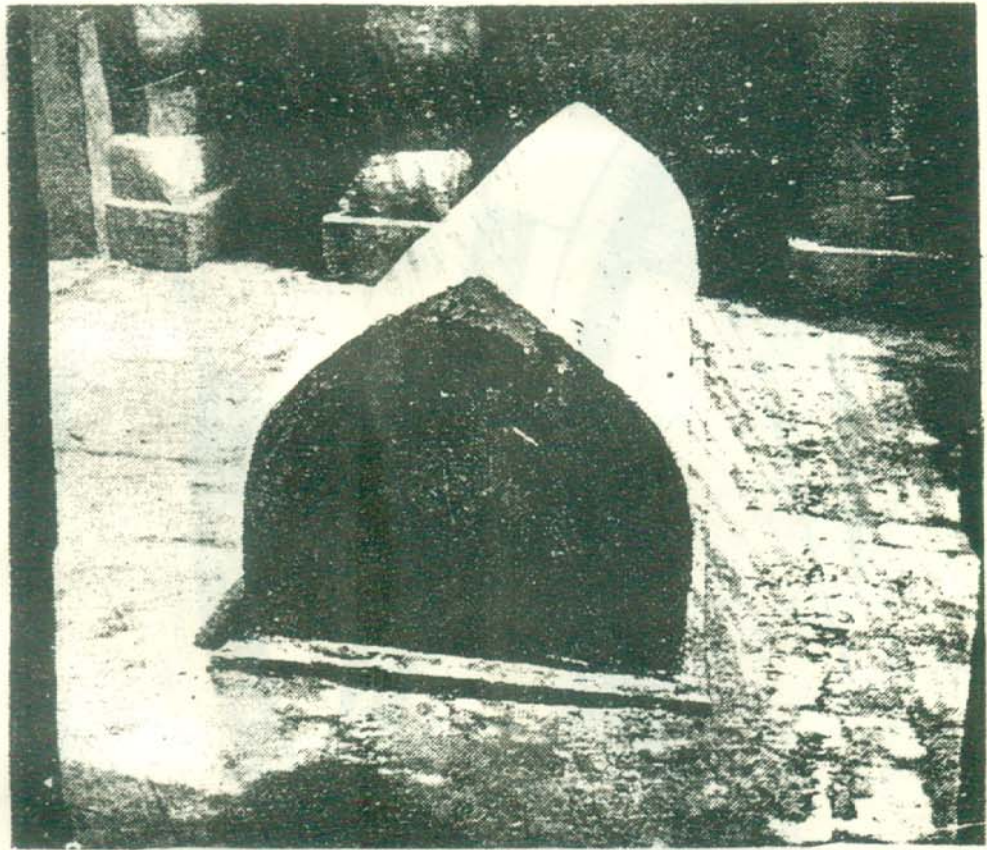
مزار حضرت شاہ کل دین بخاری رح چوک نواں شہر ملتان

ہاتھ میں بجائے چابک کے سانپ تھام رکھا تھا[۱]۔ یہ مخدوم سید محمد یوسف گردیزیؒ تھے، ان کے والد سید ابوبکرؒ اور دادا بزرگوار حضرت مخدوم سید علی قسور رحمۃ اللہ علیہ تھے، جب ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کیا تو حضرت مخدوم غزنی تشریف لائے یہیں آپ کے فرزند سید ابوبکرؒ کے مشکوئے سعادت میں مخدوم شیخ محمد یوسفؒ تولد ہوئے۔

مخدوم شاہ محمد یوسف گردیزیؒ

عام تذکروں میں تاریخ ولادت سنہ ۴۵۰ھ درج ہے۔ باپ اور دادا کے فیضِ تربیت نے قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے علوم متداولہ کا عالم بنا کر جذب و سلوک اور مقاماتِ فنا و بقا میں فردِ فرید بنا دیا۔ کچھ عرصہ آپ نے سیروا فی الارض کی تعمیل میں بلخ و بخارا اور سمرقند و تاشقند کا سفر اختیار کیا۔ ابھی آپ سفر میں تھے کہ کشف کے ذریعے والد ماجد کے سانحۂ ارتحال سے اطلاع ہوئی۔ فوراً گھر پہنچے اور خود ان کی تجہیز و تکفین فرمائی۔

والدِ بزرگوار کی بے وقت رحلت نے آپ پر بڑا اثر کیا اور سیر و سیاحت ترک کر کے اپنے جدِ امجد کے حضور میں رہنے لگے۔ اگرچہ آپ کا اکثر وقت حجرہ اعتکاف میں گزرتا، مگر جب کبھی باہر تشریف لاتے آپ سے ایسی ایسی کرامات ظاہر ہوتیں کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ جدِ بزرگوار بسا اوقات منع فرماتے کہ کشف و کرامات کا اظہار مناسب نہیں، مگر یہاں عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں

۱؎ حضرت کی خانقاہ پر یہ شعر لکھا ہوا ہے، جس سے اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے

؎ دانی سوارِ شیر کہ در دست مار کرد　۰　مخدوم شاہ یوسف اینجا قرار کرد

کہاں تھی۔ آخر الامر ایک دن یہی چیز دادے پوتے کے درمیان فراق کا باعث بن گئی۔ اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں کہ گردیز کے نواح میں ایک بڑا قبیلہ آپ کا مرید تھا۔ اچانک اس گھرانے میں ایک لڑکا سخت بیمار ہو گیا۔ جب دوائیں اور دعائیں بے اثر ثابت ہوئیں اور لڑکا کمال لاغر اور نحیف ہو گیا تو تمام مرید جمع ہوئے اور اس بچے کو مخدوم علی قسور کی خدمت میں لے آئے اور عرض کی کہ :-

"اے شیخ کامل! ہم سب حضور کے غلام اور عقیدت مند ہیں۔ ہمارے گھر کا صرف یہی ایک چراغ ہے جو گل ہونے کو ہے۔ آپ درگاہِ الٰہی میں دعا فرمائیں کہ اوشانہٗ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے اس نونہال کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔"

حضرتِ مخدوم نے ان کی گریہ وزاری کے جواب میں فرمایا کہ ہمیں رضائے الٰہی پر راضی رہنا چاہیئے۔ اہلِ قبیلہ نے کمال عجز و انکسار کیا مگر حضور نے کچھ توجہ نہ فرمائی اور وہ لڑکا جاں بحق ہو گیا۔ اور لوگ روتے پیٹتے لاش کو اٹھا کر واپس اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ چونکہ ان بے چاروں کا صرف یہی ایک بچہ تھا۔ اس لیے وہ کمائی دارو رسیدہ تھے۔ ان کے شور اور واویلا سے ایک کہرام سا برپا ہو گیا۔ اتفاقاً حضرت شاہ محمد یوسف علیہ الرحمۃ عبادت سے فارغ ہو کر راستے میں تشریف لا رہے تھے۔ آپ نے یہ دردناک منظر دیکھا تو خادم سے حقیقتِ حال دریافت کی۔ اتنے میں وہ تمام لوگ آپ کے قریب آ پہنچے، اور لاش زمین پر رکھ کر اپنی بدقسمتی اور بربادی پر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ حضرت چونکہ رقیق القلب اور بے حد کریم النفس تھے۔ آپ سے

ان کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ جذب و جلال کے ساتھ فرمایا۔ کون کہتا ہے کہ یہ لڑکا مُردہ ہے۔ یہ تو زندہ ہے۔ اِس فرمانِ کرامت نشان کے سنتے ہی بحکمِ خدائے بلند و برتر وہ لڑکا کلمہ پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ لوگ جو چند لمحے پہلے زار و قطار رو رہے تھے۔ خوشی سے پھُولے نہ سمائے اور آپ کے قدموں میں گر پڑے۔ چند مخدوم علی قسوّر کو یہ خبر ملی تو وہ سخت ناراض ہوئے اور حضرت کو بلا کر فرمایا کہ:۔

"اے فرزند! اِس قدر توفیق تو خداوندِ عالم نے اس فقیر کو بھی دے رکھی تھی۔ میں تو رضائے الٰہی میں دخل دینا کمال بے ادبی سمجھتا تھا۔ کیونکہ فقرار کا شیوہ تسلیم و رضا ہے، مگر تو نے فقیر کو آج خدا کے حضور شرمندہ کر دیا۔ اس لئے اب ہم دونوں کا یکجا رہنا ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا اچھا یہی ہے کہ تم ملتان چلے جاؤ۔ کیونکہ وہ ملک تباہ اور ویران ہو رہا ہے۔ شاید تمہاری وجہ سے خداوندِ عالم اِس شہر کے باشندوں کو توفیقِ ہدایت عطا فرمائے۔"

حضرت نے جب جدِ بزرگوار کی یہ ناراضی اور پھر سفرِ ملتان کا حکم سُنا تو سخت آزردہ ہوئے۔ والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا عرض کیا۔ اس مخدومہ نے فرمایا:۔

"بیٹا! تیرے خانوادے کا کام شروع سے اشاعتِ اسلام رہا ہے۔ اپنے جدِ بزرگوار کا حکم مانو اور ملتان چلے جاؤ۔ مجھے اُمید ہے کہ تیرے طفیل دینِ الٰہی کی کوئی بڑی خدمت انجام پائے گی

جاؤ نصرتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہو!"

والدہ ماجدہ کا یہ عزم و استقلال دیکھ کر آپ مطمئن ہو گئے۔ جھک کر ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور اپنا چغہ سنبھال ملتان کو روانہ ہوئے۔

جدید ملتان کی تعمیر

جن دنوں حضرت مخدوم ملتان وارد ہوئے۔ شہر اس جگہ واقع تھا جہاں اب مخدومہ پاکدامن علیہا الرحمہ کا مزار اور قبرستان ہے۔ شہر اور قلعہ قدیمہ کے درمیان دریائے راوی بہتا تھا۔ اہلِ شہر چاہتے تھے کہ دریا کے شمال میں قلعۂ قدیم کے متصل ایک اور قلعہ تعمیر کریں۔ جس میں اہلِ شہر آباد ہوں۔ جمال یوسف کے الفاظ یہ ہیں:-

"جب حضرتِ مخدوم بالہامِ الٰہی ملتان پہنچے۔ عرفان پناہ حضرت موجِ دریا علیہ الرحمۃ کے ہاں قیام فرمایا۔ اہلِ شہر چاہتے تھے، کہ دوسرا قلعہ برلبِ دریا تعمیر کریں کہ شرِ اعدا رسے حفاظت ہو۔ کیونکہ ان دنوں ڈاکو اور چور اطراف و جوانب سے جمع ہو ہو کر ملتان کو لوٹا کرتے تھے۔ اس سبب سے لوگ نیا قلعہ بنانے کی فکر کر رہے تھے۔"

مگر چونکہ دریا کا کنارہ دلدلی تھا۔ اس لئے دیوار گر جاتی تھی۔ حضرت نے دریا کے کنارے حجرہ تعمیر کرایا اور اہلِ شہر کو حکم دیا کہ میرے حجرے کو اندر لے کر شہر پناہ کی تعمیر شروع کر دو، اور دیوار پر میرے جوتے رکھ دو' انشاءاللہ یہ نہیں گرے گی۔ چنانچہ ایسا ہُوا۔ فصیل بن کر تیار ہو گئی اور لوگ اس میں آ کر آباد ہونے لگے۔

معمولات

حضرت مخدوم نے یہ معمول بنا رکھا تھا۔ کہ صبح کی نماز سے پہر دن تک مصروفِ عبادت رہتے۔ پھر رشد و ہدایت کا دروازہ کھلتا اور خلقِ خدا جو اس چشمہ فیض پر مور و ملخ کی طرح جمع ہو جاتی تھی اُسے اسلام کی تلقین کرتے اور قرامطی عقائد سے تائب ہونے کی ہدایت فرماتے۔ پھر لنگر شروع ہو جاتا۔ امیر و غریب سب اس مائدہ فیض سے شکم سیر ہو کر کھاتے۔ حضرت مخدوم کا سلوک ہر شخص سے یکساں تھا۔ بلا تفریق رنگ و ملّت ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق کھانا ملتا تھا۔ اس کے باوجود استغنا کا یہ عالم تھا کہ مرید لعل ہائے ناب اور مروارید کے طشت لاکر نذر کرتے، مگر وہ دریائے راوی میں پھینک دیئے جاتے تھے

؎ نازِ شہاں نمی کشم زخم کرم نمے خورم
درنگر اے ہوس فریب ہمت ایں گدائے را

الغرض اسلام کا یہ مبلغ اعظم اپنے لیل و نہار اسی شغلِ عزیز میں صرف کرتا رہا۔ حضرت موج دریا بھی برابر آپ کے شریک کار رہے اور اپنے زہد و اتقا کی جاذبیت اور کشف و کرامات کی بے پناہ کشش سے بہت سے قرامطیوں کو واپس دینِ حنیف میں لے آئے اور ہزاروں ہندوؤں کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا۔

حضرت موج دریا کی وفات

حضرت موج دریا، حضرت کے دستِ راست، مخلص کارکن اور باعمل عالم تھے۔ وہ کچھ عرصہ بیمار رہ کر فوت ہو گئے۔ حضرت کو اپنے شفیق دوست اور شریکِ کار کے انتقال کا بڑا صدمہ ہوا اور انہیں ان کی خانقاہ میں، جہاں وہ

عمر بھر اللہ اللہ کرتے رہے تھے دفن کر دیا۔[1]

یہ وہ زمانہ تھا کہ ملتان نے نہ تو شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا رح کو دیکھا تھا۔ اور نہ حضرت موسیٰ پاک شہید رح اور حافظ محمد جمال اللہ رح کے قدسی نفوس نے سرزمینِ ملتان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا تھا۔ صرف آپ اور محض آپ کی ذات تھی جس کے عزمِ آہنیں اور بے پناہ قوتِ امدادی نے وہ کام کر دکھایا، جس کو غزنوی کی خون آشام تلوار بھی نہ کر سکی۔ جب قرامطہ کا شہر سے پوری طرح استیصال ہو گیا۔ اور عمر شریف اکیاسی برس کے قریب پہنچ گئی تو آپ نے اعلان فرمایا کہ میرا سفرِ آخرت قریب آ پہنچا ہے انشاء اللہ

وفات اس سال ہم اس دارِ فانی سے عالمِ باقی کو کوچ کر جائیں گے چنانچہ ۱۲ ربیع الاول ۵۳۱ھ چہار شنبہ کے پہر دن کو اسلام کا عظیم مبلغ صدائے ارجعی کو لبیک کہہ گیا اور جنازہ ادا کرنے کے بعد آپ کو اسی حجرہ میں سپرد

---

[1] حضرت کی قبر شریف پر مقبرہ اور پاس ہی مسجد تھی۔ جب تک دریا کے راوی اس کے پاس سے ہو کر بہتا رہا۔ حضرت موج دریا رح کی خانقاہ ملتان کا ایک تفریحی مقام تھا اور گرد و پیش شیشم کے گھنے درخت تھے۔ سکھوں کے دور میں مقبرہ شہید ہو گیا۔ ابھی دو تین سال ہوئے مسجد کے پاس قبر بھی موجود تھی۔ لیکن ملتان ایڈیٹوریم کے لئے جب ٹریکٹروں نے زمین کو ہموار کرنا شروع کیا تو یہ قبر بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی اور تعویذ کو ٹریکٹر گھسیٹ کر لے گیا۔ پاس ہی نالہ ملی محمد خان کاک اور مختصر سی کالونی موج دریا سے موسوم ہیں مگر حضرت کی قبر کا نشان نہیں۔ مسجد کے جنوب میں درخت کے گرد و پیش حضرت کی قبر یقیناً موجود اور لاش محفوظ ہو گی۔ موج دریا کالونی میں ابھی چند لوگ ایسے موجود ہیں جو قبر کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ مناسب ہے کہ ان سے دریافت کر کے قبر دوبارہ بنوا دی جائے۔

خاک کیا گیا۔ جہاں حضرت نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ عبادت و طاعتِ الٰہی میں بسر کر دیا تھا۔

اولادِ امجاد

حضرتِ مخدوم شاہ محمد یوسف علیہ الرحمۃ گردیز میں ہی متاہل ہوئے تھے کیونکہ آپ کے پوتے شیخ عبدالصمد نے ہی آپ کے حالات جمع کئے ہیں اور اکثر اُمور ان کے ذاتی مشاہدات پر مشتمل ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیخ عبدالصمد جدِ بزرگوار کی زندگی میں ہی خاصے معمر تھے۔

حضرتِ مخدوم کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے شیخ احمد تھے جو حضرت کے بعد آپ کے صاحبِ سجّادہ بنے۔ حضرت نے اپنی تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ بحصۂ برابر دونوں صاحبزادوں میں تقسیم کر دی تھی۔ البتہ موضع جلال پور کے چاہات جو حضرت نے اپنے نام پر احداث کرائے تھے، مع گاؤں صاحبِ سجّادہ کو مرحمت ہوئے۔ ان کی زندگی میں ملاحدۂ قرامطہ نے پھر ظہور کیا۔ حضرت صاحبِ سجّادہ ان کے استیصال میں برابر کوشاں رہے۔ ان کے بعد شیخ عبدالصمد نے بھی ان کے اثر و رسوخ کو ختم کرنے کی پوری کوشش فرمائی اور جب دیکھا کہ بغیر کسی خونریز جنگ کے ان کا استیصال ناممکن ہے تو سلطان شہاب الدین غوری کو ادھر متوجہ ہونے کے لئے خط لکھا۔

شہاب الدین محمّد غوری

محمد غوری محمود غزنوی کی مانند بہت بڑا جرنیل اور مدبّر حکمران تھا اس نے محمود کی طرح ۳۰ سال تک ہندوستان کو اپنی فوج ظفر موج کی جولان گاہ

بنائے رکھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ محمود نے ہندوستان کو غزنی پر سے تصدق کر دیا تھا، اور محمدؒ غوری نے عروس ہند کے لئے سارے وسطِ ایشیا سے کنارہ کر لیا۔

اگرچہ سلطان محمود نے ملتان سے قرامطہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن اس کے انتقال پر جونہی قرامطہ کو آزادی ملی وہ عملاً اس شہر پر چھا گئے۔ حضرت مخدوم شیخ عبدالصمد کے مکتوب نے سلطان کو ملتان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور وہ فشونِ قاہرہ کے ساتھ ۱۱۷۵ء میں دفعتہً ملتان پر ٹوٹ پڑا۔ اور قرامطہ کو تہس نہس کر کے اس سرزمین کو ہمیشہ کی طرح کفر و الحاد کی لعنت سے پاک کر دیا۔

مولانا ذکاء اللہ سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین محمد غوری کے قرامطوں پر حملوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

> "محمود غزنوی نے اس فرقے کا ملتان سے منہ کالا کیا۔ مگر وہ یہاں سے بالکل خارج نہیں ہوسکے تھے۔ دیہات میں ان کا ہمہ گیر اثر موجود تھا۔ جگہ جگہ ان کے داعی اور نقیب مقرر تھے، جو لوگوں میں کفر اور الحاد کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔"[1]

> "محمد غوری کو اس ملک کی حکومت عطا ہوئی تو اس نے سب سے پہلے قرمطی اور ملحدوں کی بیخ کنی پر کمر ہمت باندھی اور بہت سی لڑائیوں کے بعد ان کو تباہ و برباد کیا۔ اور جو بچ رہے ان کو جلاوطن کر دیا۔"

مؤخر الذکر سطور "تذکرۃ الملتان" کی ہیں۔ انہوں نے عجم اور حمیہ کے خاندان کا جہاں کہیں ذکر کیا ہے انہیں قرمطی اور ملحد ہی لکھا ہے۔ دو سطور ملاحظہ ہوں:۔

"ملتان پر غیر اقوام کا تسلط ہو گیا اور قرمطی بے دین لوگ حکومت کرنے

---

[1] تاریخ علامہ ابن خلدون کتاب ثانی جلد ششم ترجمہ حکیم احمد حسین اکبر آبادی مطبوعہ قیصر ہند پریس الٰہ آباد ۱۹۰۵ء

لگے۔ ابوالفتح بدعقیدہ اور قرمطی تھا۔"

تذکرۃ الملتان کا مؤلف مذہباً شیعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر جلم اور شیخ حمید کا خاندان اسمٰعیلی ہوتا تو یہ اسے قرمطی ہرگز نہ لکھتے۔[۱] یہ بزرگوار مخدوم شاہ محمد یوسف گردیزؒ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ :-

"کچھ عرصہ کے بعد قوم ملاحدہ اور قرامطہ نے ظہور کیا۔ یہ لوگ پورے بے دین تھے۔ حضرت شیخ احمد نے ہر چند ان کے استیصال کے واسطے سعی فرمائی، مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا اور یہ بے دین بڑھتے چلے گئے۔ آپ کے صاحبزادے شیخ عبدالصمد کے زمانہ میں غوریوں کو اقتدار نصیب ہوا۔ اس زمانہ میں بے دین قرامطی اور ملاحدہ بہت زوروں پر تھے۔ شہاب الدین محمد غوری نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔"[۲] [۳]

---

[۱] "اسلام مشرق میں" از مولانا وحید احمد کی رائے ملاحظہ ہو۔ "۹۸۵ء ملتان کا گورنر قرامطی فرقے کا تھا۔ یہ فرقہ رسواکن اسلام ہوا۔ ان کے عقائد میں ایرانی فلسفہ کی آمیزش کی وجہ سے یزدان اور اہرمن والی باطنی تعلیم شامل تھی" (ص ۶۰)۔　[۲] تذکرۃ الملتان ص ۴۸۔

[۳] شیخ اکرام الحق کا قرامطہ پر مختصر مگر جامع بیان ملاحظہ ہو۔ "جلم بن شیبان نے ادینہ کا مندر اور محمد بن قاسم کی مسجد کو بند کرا دیا۔ عرب میں عبداللہ قرامطی زور پکڑ گیا تھا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ نتیجہ اسباب مہیا کرتے ہیں۔ جائز و ناجائز کا سوال نہیں۔ اس قسم کے اصول ملتان میں برتے جانے لگے۔ حتیٰ کہ جلم کے پڑپوتے ابوالفتح داؤد کی خلاف شرع حرکات نے سلطان محمود غزنوی کو اکسایا۔ اور ۱۰۱۰ء میں اس نے یورش کر کے ملتان کو برباد کر دیا۔ سلطان محمود کے حملے کے باوجود قرامطہ پورے طور پر مغلوب نہ ہوئے۔ اور سمرا کے سایۂ عاطفت میں دوبارہ استیلا پا گئے، اور آخرکار ۱۱۷۵ء میں شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں ختم ہوئے۔" (ملتان قدیم و جدید ص ۷۸ و ۷۹)

شیخ عبدالصمد کی غوری سلطان سے ملاقات

ملاقات کے لئے رات کا وقت مقرر ہوا تھا۔ حضرت مخدوم عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد دربارِ سلطانی میں تشریف لے گئے۔ تسبیح خانہ میں سلطان تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت مخدوم نے نزدیک پہنچ کر سلطان کو السّلام علیکم کہا، بادشاہ نے کھڑے ہو کر سنّتِ نبوی کے مطابق اس کا جواب دیا اور معانقہ فرما کر دائیں پہلو میں جگہ دی۔ انتقالِ اختیارات کے سلسلے میں جو شرائط طے ہوئیں ان کا ذکر حضرت مخدوم کے تذکروں میں نہیں ملتا۔ لیکن اتنا درج ہے کہ

۱۔ بے شمار دہانہ چاہات جن پر حضرت مخدوم صاحب قابض و متصرف تھے اور ہزاروں بیگھے اراضی سیلابہ جو آپ خود کاشت کراتے تھے، وجہ معاش، اخراجات، خانقاہ، تیل چراغی اور لنگر کے لئے مخصوص رہے۔ اور ناظمانِ علاقے کا عزل و نصب بھی صاحبِ سجّادہ کے مشورہ سے ہوتا تھا۔

۲۔ معاملہ سرکاری دس روپیہ فی دہانہ چاہ اور فی بیگھہ سیلابہ آٹھ آنہ اور بارہ روپے بابت سالم جھلار مقرر تھا۔ نیز جو چاہ نئے سرے سے احداث ہوتا، اس کے پانچ روپے، نئی جھلار کے سات روپے اور چار آنے فی بیگھہ سیلابہ خدام درگاہ الگ وصول کرتے تھے۔

سلطان شہاب الدین غوری نے ملتان اور سندھ فتح کرنے کے بعد اس ریاست کی حکومت اپنے سپہ سالار علی کرماخ کو مرحمت کی جو ۵۸۲ھ تک حکمران رہا لاہور فتح ہونے پر سلطان نے اس کا تبادلہ لاہور میں کر دیا۔ کرماخ ۱۱ برس تک ملتان و سندھ کا حاکم رہا۔ (تاریخ سندھ، از مولانا سید ابو ظفر ندوی ص ۲۹۶)

ملتان میں علوی خاندان کے ایک بہادر جرنیل حسین بن احمد بن حمزہ بن عمر بن محمد بن محمد العلوی کو سلطان نے قلعہ ہانسی پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ جناب حسین نے کفار کا مردانہ وار مقابلہ کیا، مگر جمعیت کم ہونے کے سبب ۵۸۸ھ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (نزہتہ الخواطر از مولانا عبدالحیٰ)

سُلطان ناصر الدین قباچہ

سلطان محمد غوری کے بعد اس کی سلطنت تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ غزنی پر تاج الدین یلدوز، ہندوستان پر قطب الدین ایبک اور ملتان و سندھ پر ناصر الدین قباچہ نے قبضہ کر لیا۔

قباچہ علماء و مشائخ کا قدردان تھا۔ اس نے ملتان شہر میں ایک بہت بڑی درس گاہ قائم کی تھی۔ ماوراء النہر سے مولانا قطب الدین کاشانی کو، جو اُس دور کے بہت بڑے عالم تھے، منگوا کر اس مدرسے کا شیخ مقرر کیا۔ ساتھ ہی ایک عظیم مسجد تعمیر کرائی۔ مولانا کاشانی عمر بھر اس مدرسے کے منتظم و منصرم رہے اور مسجد میں امامت کرتے رہے۔

اسی طرح ایک مدرسہ اوچ میں قائم تھا۔ اس کے شیخ المکتب مولانا منہاج الدین سراج تھے۔ انہوں نے مدرسہ کو اچھی طرح سے چلایا۔ ناصر الدین قباچہ کے زمانہ میں تاتاریوں کے حملوں نے خوارزم شاہ کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ قتل و غارت کے خوف سے علماء و مشائخ ہندوستان کی طرف کھچے چلے آ رہے تھے۔ چونکہ ملتان راستے میں پڑتا تھا اور اس کا تاجدار قدردان اور فیاض واقع ہوا تھا۔ اس لئے ان کی پہلی منزل ملتان میں ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ ملتان کے دربار سے وابستہ رہتے اور پھر دہلی کو روانہ ہوتے تھے۔ چنانچہ بے شمار علماء اور مشائخ ملتان میں کھچ کھچا کر جمع ہو گئے تھے۔ محمد عوفی جو خود اس زمرے میں شامل تھا۔ قباچہ کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"یہ دربار علماء و فضلاء سے پُر ہے۔ یہ ایک ایسا آسمان ہے جس میں ارباب کمال کے ستارے چمکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بوستان ہے جہاں فضل کی کلیاں اور ہنر کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں۔"

مولانا فضلی نے جو ملتان شہر کے یگانۂ روزگار عالم اور قادر الکلام شاعر تھے، قباچہ کی شان میں کئی قصیدے لکھے تھے۔ نیاز فتحپوری نے "اسلامی ہند" میں قباچہ کو اس طرح سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے:۔

"ناصرالدین قباچہ علاوہ اپنی شجاعت و جرأت کے کیاست و تمیز [۱] میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ ملتان اور سندھ پر اس نے ۲۲ سال تک حکومت کی [۲]۔"

اس زمانے میں بہت سے معرکے پیش آئے اور ہر ایک کو اس نے اپنے بذل و کرم اور احسان و انعام سے اپنے لئے آسان بنا لیا۔ جب چنگیز خاں کے فتنہ نے خراسان و غزنی کے اکابر کو سراسیمہ کر دیا تو یہ سب کے سب قباچہ کے پاس پناہ گزیں ہوئے اور اس نے نہایت دریا دلی سے اپنے خزانے کا منہ ان لوگوں کے لئے کھول دیا۔

---

[۱] سلطان ناصرالدین قباچہ نے اپنا وزیر عین الملک فخرالدین الحسین بن ابوبکر اشعری کو مقرر کیا، جو ایک خدا ترس اور فاضل انسان تھا۔

[۲] اسلامی ہند بحوالہ طبقات اکبری۔ ص ۲۳

ابن الامت، غوث الثقلین، مخدوم العالم

شیخ الاسلام

بہاء الدین زکریا

قدس سرہٗ

ولادت	عمر شریف	رحلت
۲۷ رمضان ۵۶۶ھ	۹۶ سال	۷ صفر المظفر ۶۶۱ھ

مزار شریف

قلعہ قدیم، ملتان

سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار کے مقابلے میں ایک اور دربار، جو ملتان میں خصوصی شہرت رکھتا تھا، وہ فقر و ولایت کا دربار تھا۔ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کے فضل و کمال نے سید السادات جلال بخاریؒ، فخر الدین عراقیؒ، میر حسینیؒ، سلطان التارکین حمید الدین حاکمؒ، نواب موسیٰؒ، اور لعل شہباز قلندر جیسے اکابر اہل اللہ کو اپنے حلقۂ رشد و ہدایت میں جمع کر لیا تھا۔ چنانچہ سیر الاولیاء کا مصنف لکھتا ہے :-

"دریں ایام ملتان قبۃ الاسلام عالم بود، فحول علماء آنجا حاضر بودند۔"

حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ خاندان قریش کے گل سرسبد تھے۔ آپ کے آباء کرام کئی پشتوں سے کروڑ (ضلع منظفر گڈھ) میں آباد تھے اور اس علاقہ پر حاکمانہ اقتدار رکھتے تھے۔ آپ ۲۷ رمضان ۵۶۶ھ کو حضرت مولانا وجیہہ الدین محمد قریشی کے مشکوئے معلّٰی میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ صغیر سن ہی تھے کہ آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے کروڑ (ضلع منظفر گڑھ) میں حاصل کی۔ پھر ملتان میں مولانا عبد الرشید کرمانی سے علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد ایران اور ارض پاک کا سفر کیا۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد مختلف شہروں کے مشائخ اور علماء سے
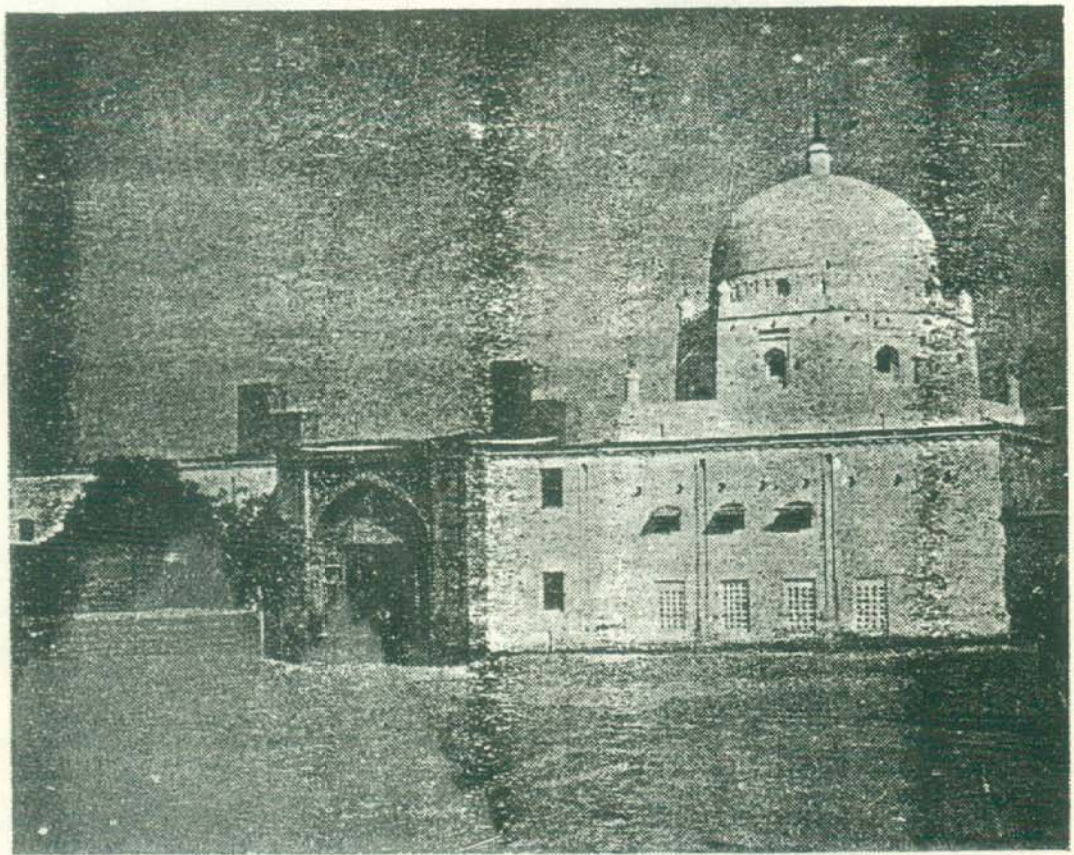
مقبرہ حضرت شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا
قدس سرہ

قلعہ قدیم ——————— ملتان
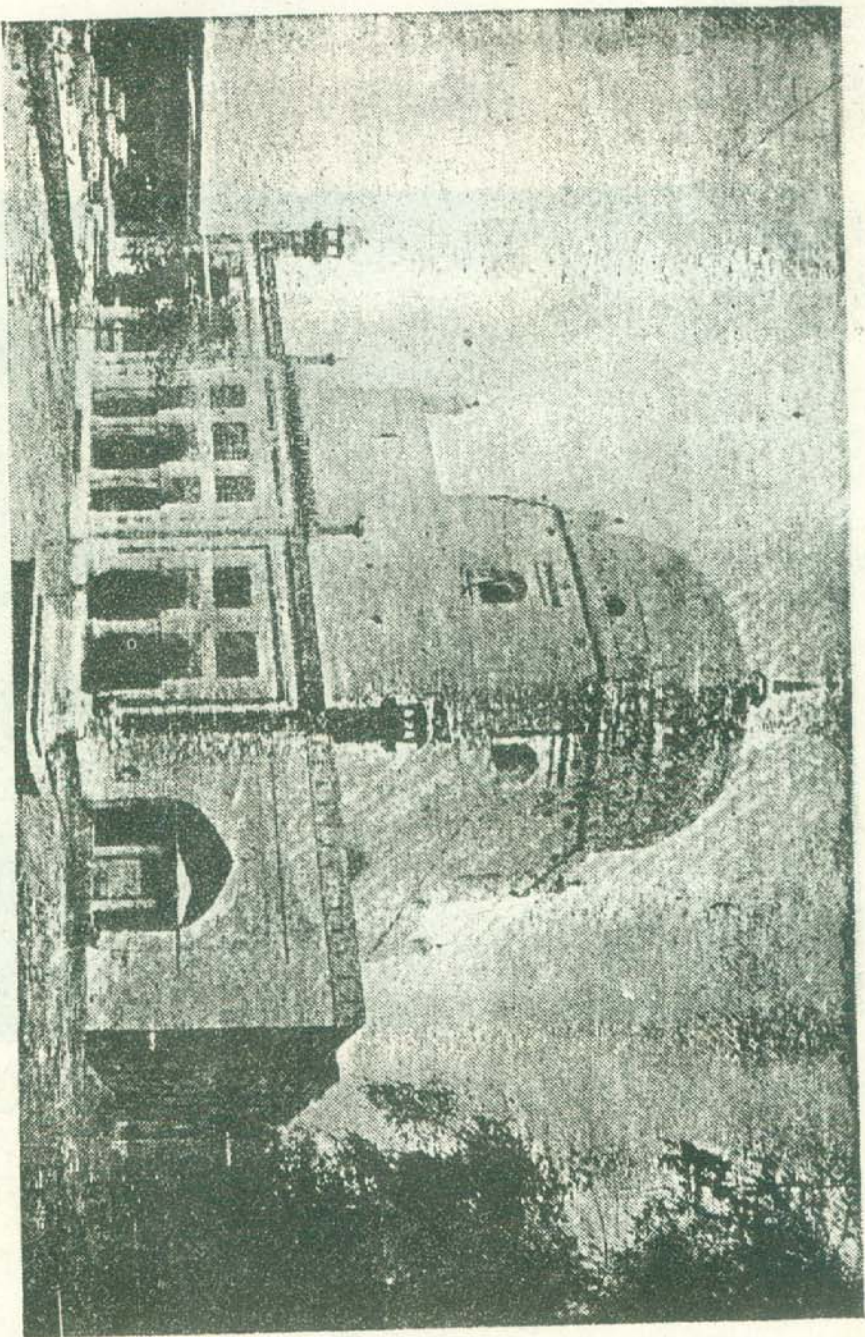
حضرت شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا علیہ الرحمتہ کے مقبرہ کا ایک اور پر شوکت منظر
(بشکریہ محکمہ اوقاف)

استفادہ اور استفاضہ کیا۔ تعلیم و تعلّم اور تزکیہ نفس کے بعد بغداد پہنچ کر شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمتہ سے فیضانِ روحانی حاصل کیا۔ ابھی آپ نے پیر بیعت کی خدمت میں چند یوم ہی گزارے تھے کہ خرقہ خلافت عطا ہوا، اور آپ کو ملتان میں تبلیغ اسلام اور خلقِ خدا کی اصلاحِ احوال پر مامور کیا گیا۔ اُن دِنوں ملتان میں پرہلاد جی کا مندر بڑے عروج پر تھا۔ پرہلاد اگرچہ اپنے دور کے مؤحد انسان تھے اور انہوں نے کفر سے شدید ٹکر لی تھی۔ لیکن اب ان کا استھان شرک و فسق کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے ہزاروں ہندو یاتری اس مندر میں حاضری دینے کے لئے آتے اور مورتیوں پر چڑھاوے چڑھاتے تھے حضرت شیخ الاسلام نے اسی مقام کو اشاعتِ اسلام کے لئے منتخب فرمایا، اور اس کے داخلی دروازے کے عین سامنے مسندِ ارشاد قائم کی۔ وہ چبوترہ آپ کی خانقاہ سے متصل جانب شرق اب تک موجود ہے۔ عصر کی نماز کے بعد حضرت روزانہ اس جگہ وعظ فرماتے تھے۔ سامعین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی اور ہندو یاتری جو مندر سے برآمد ہوتے، حضرت کا وعظ سُن کر مسلمان ہو جاتے تھے۔ خانقاہ معلیٰ کی موجودہ عمارت حضرت نے خود تعمیر کرائی تھی، اور اس میں آپ مصروفِ عبادت رہتے تھے۔ پاس ہی بہت بڑی سرائے تھی جس میں مسافروں کو حضرت کے لنگر سے دونوں وقت کا کھانا ملتا تھا۔

تبلیغی جماعتیں

حضرت شیخ الاسلام پہلے بزرگ تھے۔ جنہوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے ملتان میں مضبوط مرکز قائم کیا تھا۔ مدرسہ بہائیہ علماء، قاری اور حفاظ پیدا

کرتا تھا۔ اور تبلیغی مرکز حضرات علماء کو مبلغ بناتا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام نے لسانی بنیادوں پر تبلیغی شعبے قائم کر رکھے تھے۔ سنسکرت، بنگالی، سندھی، فارسی عربی، جاوی، برمی، مرہٹی، الغرض مشہور مشہور زبانوں کے الگ الگ شعبے تھے۔ جو عالم رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو تبلیغ کے لئے پیش کرتا۔ اُسے اسی شعبہ میں داخل کیا جاتا تھا۔ جہاں اُسے بھیجنا مقصود ہوتا تھا۔ مثلاً جو عالم انڈونیشیا میں جانے اور وہاں تبلیغ کرنے پر آمادگی کا اظہار کرتا اُسے اس شعبہ میں داخلہ ملتا جہاں انڈونیشین علماء[1] اپنے علاقے کی زبان سکھانے اور اپنے ملک کے طور طریقے سمجھانے پر مقرر تھے۔ جب اس طرح پندرہ پندرہ بیس بیس مبلغین ایک ایک ملک کے لئے تیار ہو جاتے تو حضرت شیخ الاسلام اپنے ذاتی خزانہ سے پانچ پانچ ہزار اشرفی ایک ایک مبلغ کو عنایت فرماتے تھے اور وہ اپنے اپنے اتالیق کی ہدایت کے مطابق اس ملک کی ضرورت کی چیزیں خرید کر اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔

جب کوئی مبلغ سوداگر بن کر روانہ ہونے لگتا تو حضرت شیخ الاسلام اسے طلب کر کے ہدایات دیتے تھے، جو اس قسم کی ہوتی تھیں:۔

۱۔ دیکھو! تم ایک سوداگر کی حیثیت سے جا رہے ہو۔ تجارت کے بارے

---

[1] صاحب نزہۃ الخواطر الشیخ الفاضل علامہ حسین القریشی الملتانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ موصوف علوم عربیہ میں علمائے متبحرین میں سے تھے۔ مدتوں شیخ الاسلام کی خانقاہ پر درس دیتے رہے۔ آپ ریاست بھر میں ممتاز تھے۔ ان کے ہزاروں شاگردوں میں سے ایک محمد بن ملکن ملاوی بھی تھے یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ ملاوی لوگ یہاں درس تدریس اور شیخ کے فیضان سے استفاضہ کیلئے آمد و شد رکھتے تھے

میں اسلام کے زرین اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا۔
۲۔ چیزوں کو کم منافع پر فروخت کرنا۔
۳۔ خراب چیزیں ہرگز فروخت نہ کرنا، بلکہ انہیں تلف کر دینا۔
۴۔ خریدار سے انتہائی اخلاق اور شرافت سے پیش آنا۔
۵۔ جب تک لوگ آپ کے قول و کردار کے گرویدہ نہ ہو جائیں ان پر اسلام پیش نہ کرنا۔

اس طرح حضرت شیخ الاسلام کے تربیت یافتہ مبلغین لاکھوں اشرفیوں کا مال لے کر مشرق بعید سے مغرب بعید تک سفر کرتے۔ سامان تجارت فروخت کرتے اور ساتھ ہی اسلام کی اشاعت بھی کرتے تھے۔ اس زمانے میں دریائے راوی قلعے سے ٹکرا کر بہتا تھا۔ اس کے ذریعے بڑی بڑی کشتیوں پر سامان تجارت سکھر، بھکر، منصورہ اور پھر وہاں سے عراق، عرب اور مصر تک جاتا تھا۔ خشکی کے راستے کابل، ایران، دہلی، لاہور اور دکن سے تجارت ہوتی تھی۔

دوسری جماعتیں جو حضرت شیخ الاسلام کے مریدوں پر مشتمل تھیں۔ وہ اپنے اپنے علاقے میں تبلیغ کا کام سرانجام دیتی تھیں۔ یہ لوگ حضرت کے تربیت یافتہ درویش ہوتے تھے۔ سالہا سال حضرت کی خانقاہ میں رہ کر فقر و ولایت کی منزلیں طے کرتے۔ جب انہیں فیضان حاصل ہو جاتا، حضرت شیخ الاسلام ان کو اپنے اپنے علاقے میں عوام کی اصلاحِ احوال پر مامور فرماتے تھے۔ یہ فقراء "خلیفے" کہلاتے تھے۔ سال بھر اپنے حلقۂ اثر میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی خدمت انجام دیتے۔ اور موسمِ بہار میں متلاشیانِ حق کے ایک بڑے قافلے کو جو بالعموم

پانچ چھ سو افراد پر مشتمل ہوتا تھا، لے کر ملتان کو چل پڑتے۔ ہر پڑاؤ پر دُکانیں کھل جاتیں۔ نانبائی کھانا تیار کرتے، بزاز کپڑے کی دکانیں کھولتے اور بنجارے قسم قسم کا سامان لے بیٹھتے۔ محافظ دستہ جنگی مظاہرے کر کے نوجوانوں کو جہاد کے لئے اُبھارتا۔ زور آزمائی ہوتی۔ گھوڑ دوڑ، نیزہ بازی اور شمشیر افگنی کے کمالات سے مردہ دلوں میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑنے لگتی۔ حضرات علماء ایک جانب لاکھوں کے ہجوم میں قرآن و حدیث کا وعظ کرتے نظر آتے۔ دوسری طرف گھنے دار جھاڑیوں میں عارفانِ حق کا حلقہ دکھائی دیتا۔ جس میں زنگ آلود دل نہ صرف صیقل ہوتے، بلکہ انہیں تزکیۂ نفس، استغراق، مراقبہ اور عبادات شرعیہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ ملتان پہنچ کر خلیفہ شیخ الاسلام کی خدمت میں تمام صالحین کو پیش کر کے حضرت سے اُن کے حق میں دعا کراتا، اور پھر خود سالانہ رپورٹ پیش کرتا۔ دورانِ سال جو دقتیں پیش آئی ہوتیں، عرض کر کے اُن کا مداوا چاہتا۔ حضرت شیخ الاسلام اور آپ کے فاضل رفقاء نہ صرف مشکلات حل کرتے، بلکہ جہاں جہاں ضرورت محسوس فرماتے وہاں خود تشریف بھی لے جاتے۔

یارانِ طریقت

صوفیہ میں جو "چار یار" مشہور ہیں۔ اُن سے درج ذیل مشائخ مراد ہیں :۔

۱۔ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ (۲) سید السادات مخدوم جلال بخاریؒ (۳) قطب المشائخ حضرت فرید الدین مسعود گنج شکرؒ (۴) حضرت مخدوم لعل شہباز قلندرؒ

اِن چار یاروں کی بیٹھکیں پورے مغربی پاکستان میں چپے چپے پر ملتی ہیں۔ منگھو پیر ان کا خادم تھا۔ سرد اور گرم پانی کے چشمے، مگر مچھ وغیرہ ان بزرگوں کی ہی یادگار

ہیں۔ اسی طرح سہوآن کے قریب بھی چار یاروں کی نشستگاہیں ملتی ہیں۔ ریلوے لائن کی دوسری جانب ایک پہاڑی پر مرتفع سطح اور چاروں کونوں پر چار مینار اب تک ان حضرات کی یاد میں سر اُٹھائے کھڑے ہیں۔ نیچے غار کے چاروں گوشوں میں بھی ہر بزرگ کا الگ الگ مصلیٰ بنا ہوا ہے۔ پہاڑی کے اوپر رات کو اور غار میں دن کو یہ بزرگوار مصروفِ عبادت رہتے تھے۔ سکھر میں جہاں معصوم شاہ کا مزار ہے۔ یہاں بھی غاروں میں ان حضرات نے ریاضتیں کی ہیں۔ دراصل یہ مقامات ان بزرگوں کے تبلیغی مرکز تھے۔ یہ نشست گاہیں جہاں کہیں بھی ہیں، آبادیوں کے قریب واقع ہیں۔ منگھو پیر کے قریب بھی اُن دنوں شہر آباد تھا، جس کی نشان دہی حجری قبور کر رہی ہیں۔ موسمِ گرما میں یہ بزرگوار کشمیر، افغانستان، بخارا اور نیشاپور کی جانب دوڑ کرتے تھے اور موسم سرما میں پنجاب، سندھ اور راجپوتانہ میں سفر کرتے تھے۔ ہر منزل پر تبلیغی مجالس ترتیب دیتے۔ اور قال اللہ و قال الرسول سے ایسی کیفیت پیدا کرتے کہ دلوں کی کائنات ہل جاتی۔ فولادی طبائع نرم ہو کر موم بن جاتیں۔ خشونت آمیز نگاہوں سے خشیّت الٰہی کی دھاریں پھوٹ پڑتیں۔ بڑے بڑے سنگدل انسان خدا کے قہر و غضب اور اس کی بے پناہ گرفت سے ڈر کر کانپ اُٹھتے اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتے۔ ایک ہی نشست میں ہزاروں فاسق و بدکار تائب ہو کر قطب و ابدال بن جاتے تھے۔ صاحب بزمِ صوفیہ لکھتے ہیں :-

"حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ کے فیوض و برکات کے انوار سے نہ صرف ملتان، بلکہ سارا ہندوستان منور ہو گیا تھا اور آپ کے عہد کو خیر الاعصار کہا جاتا ہے۔"

صاحب سفینۃ الاولیاء نے اس طرح آپ کا ذکر کیا ہے :-

"حضرت بہاء الدین زکریا شیخ الشیوخ سے رخصت ہو کر ملتان آئے، اور یہیں توطن اختیار کیا، رشد و ہدایت میں مشغول ہوئے، بہت سے لوگوں نے ان کی ہدایت سے برکت پائی اور اس دیار کے تمام لوگ ان کے مرید و معتقد ہو گئے۔"[1]

شیخ محمد نور بخش سلسلۃ الذہب میں آپ کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ ہندوستان میں رئیس الاولیاء تھے علوم ظاہری کے عالم اور مکاشفات و مشاہدات کے مقامات و احوال میں کامل تھے ان سے اکثر اولیاء اللہ کے سلسلے منتسب تھے۔ لوگوں کو رشد و ہدایت کی تلقین فرمائی اور انہیں کفر سے ایمان، معصیت سے اطاعت اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف لے آئے۔ اور ان کی شان بڑی تھی۔"[2]

طالبانِ صادق کی آمد

جب حضرت شیخ الاسلام کے فضل و کمال کی شہرت دُور دُور تک جا پہنچی، تو ہر طرف سے طالبانِ صادق نے اس چشمۂ فیض پر آنا شروع کیا۔ حضرت کا معمول تھا کہ صبح سویرے مسافر خانہ میں تشریف لے جاتے۔ اور نو واردوں سے ملاقات کرتے، اور جس کسی میں شوقِ ربانی کی آگ شعلہ زن پاتے اُسے اپنی تربیت میں لے لیتے، اور وہ چند دنوں میں ہی عرفان کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا۔ سینکڑوں باکمال

---

[1] سفینۃ الاولیاء ص ۱۹۷ [2] سلسلۃ الذہب کے اصل الفاظ یہ ہیں:- بھاء الدین زکریا الملتانی قدس سرہٗ کان رئیس الاولیاء ببلاد ھند وکان عالماً بعلوم الظاہرۃ صاحب الاحوال والمقامات من المکاشفات والمشاھدات مرشدا ینشعب منہ کثیراً من الاولیاء لہ فی الارشاد وھدایۃ الناس من الکفر الی الایمان ومن المعصیۃ الی الطاعۃ ومن النفسانیۃ الی الروحانیۃ شان کبیر۔

درویش اور بحرِ معرفت کے غوّاص آپ کے دروازے پر اصحابِ صُفّہ کی طرح پڑے رہتے۔ اور ہزاروں آپ سے فیضان حاصل کرنے کے بعد خلقِ خدا کی ہدایت کے لیئے اقصائے عالم میں پھیل جاتے۔ انہی ایام میں "آستانۂ زکریا" کے فیضان کی کشش نے ایسی ایسی عظیم شخصیتوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا جن پر مسلمان قوم تاابد فخر کرتی رہے گی۔ چند بزرگوں کا مختصر سا تعارف پیشِ خدمت ہے۔

سیّد السّادات مخدوم جلال بخاریؒ

آپ حضرت سیّد علی کے صاحبزادے تھے۔ پرشیخ الاسلام سے عقیدت انہیں ملتان لے آئی۔ ایک دن ملتان کی گرمی سے گھبرا کر فرمایا۔

"آہ یخ بخارا، درچنیں حرارت ترا کجا یابم!"

(آہ یخ بخارا! اس گرمی میں تجھے کہاں سے پاؤں!)

حضرت شیخ الاسلام کو کشف کے ذریعے معلوم ہوگیا۔ اس وقت مطلع بالکل صاف تھا۔ دفعتہً نیلے آسمان پر ایک چھوٹا سا ٹکڑا ابر نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے خانقاہ مبارک پر پھیل گیا۔ اور بادل کی گرج کے ساتھ مُرغی کے انڈے کے برابر اولے گرنے لگے۔ سیّد جلال بڑے خوش ہوئے اور ژالہ اٹھا کر کھانے لگے۔ شیخ الاسلام باہر تشریف لائے اور سیّد جلال سے مسکرا کر فرمایا۔ "دریں حال ژالۂ ملتان خوب است یا یخ بخارا؟" (ملتان کا ژالہ اچھا ہے یا یخ بخارا؟) سیدالسادات نے کھڑے ہو کر ادب سے عرض کیا "ژالۂ ملتان از یخ بخارا ہزار درجہ بہتر واولیٰ است!" (اس حال میں ملتان کے اولے یخ بخارا سے ہزار درجہ بہتر وافضل ہیں) اسی روز شیخ الاسلام نے سیدالسادات کو خرقہ مرحمت فرمایا۔ حضرت مخدوم شیخ الاسلام کے بعد بھی پانچ چھ سال ملتان میں رہے۔

اُس زمانے میں اُچ کا خطہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ سندھ اور پنجاب کے درمیان واقع ہونے کے سبب اکثر صوبے دار یہیں رہا کرتے تھے۔ ڈیراور، بھاگلہ، جیسلمیر کے قلعے راجپوتوں کے قبضے میں تھے۔ اور ان کا رویہ مسلمانوں سے متشددانہ تھا۔ اُچ میں اگرچہ گازرونیوں کی خانقاہ موجود تھی، لیکن اس کے باوجود تبلیغی مرکز قائم کرنے کے لئے مرد آہن کی ضرورت تھی۔ شیخ العارفؒ نے دیکھا کہ اس مقصد کو صرف سیدالسادات کی ذات ہی پورا کر سکتی ہے۔ تو انہوں نے حضرت مخدوم کو اُچ جانے کی اجازت دی[1]۔ یہ ملتان سے بڑی شان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اُچ میں پہنچ کر "محلہ بخاریاں" کی بنیاد رکھی اور اپنے بے پناہ اثر و نفوذ کی بدولت بہت جلد وہاں کے بلند و پست پر چھا گئے۔

حضرت مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ:-

سید جلال حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے خطہ اُچ میں سکونت اختیار کی اور متاہل ہوئے۔ ان کے تین لڑکے پیدا ہوئے، ایک سید احمد کبیرؒ، دوسرے بہاءالدین اور تیسرے سید محمد[2]"

مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ یہ حضرت کی وہ اولاد ہے جو بی بی فاطمہؒ اور بی بی زہراؒ کے بطنِ عفت سے تولد ہوئی تھی۔ لیکن دو صاحبزادے سید علیؒ اور سید جعفرؒ شاہ بخارا کی صاحبزادی سے بخارا میں ہی پیدا ہو چکے تھے۔ یہ دونوں صاحبزادے حضرت کے ساتھ ملتان تک آئے۔ کافی عرصہ آپ کے ہاں مقیم رہے پھر واپس بخارا چلے گئے۔ مفتی صاحب کیا خوب لکھتے ہیں کہ:-

"ایں پنج فرزند چوں پنج بنائے اسلام در ولایت و شرافت و خوارق اشتہار داشتند"

[1] و [2] ملفوظ المخدوم ص ۵

۱۹ ماہ جمادی الاوّل ۶۹۰ھ کو بعمر ۹۵ سال حضرت نے عالم آخرت کا سفر اختیار فرمایا۔ مزار پُرانوار اُچ میں ہے۔

سیّد احمد کبیر بخاری سہروردیؒ

آپ سید السادات کے فرزندِ ارجمند اور خلیفہ اعظم تھے۔ والد ماجد کے وصال پر مسندِ ارشاد کے مالک بنے۔ آپ کے بے شمار مرید تھے۔ اور اُن میں بیشمار قطب اور ابدال تھے۔ خلفاء میں سیّد جلال سلہٹی کا نام زیادہ مشہور ہے۔ یہ حضرت سیّد السادات کے نواسے اور سیّد احمد کبیر کے بھانجے تھے۔ آپ ابھی تین ماہ کے ہی تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ باپ ایک لڑائی میں دادِ شجاعت دیتا ہؤا پہلے شہید ہو چکا تھا۔[۱] اور سید السادات نے آپ کو اپنی تربیت میں لے لیا۔ جب وہ عالم قدس کو تشریف لے گئے تو سیّد احمد کبیرؒ نے ان پر اپنی شفقت کا سایہ ڈالا۔

شیخ جلالؒ نے تیس سال تک اپنے ماموں اور مرشد کی ہدایت کے بموجب حجرے میں عبادت کی۔ اور پھر آپ کو مرشد کی طرف سے بنگال میں جہاد کرنے کے لئے روانہ کیا گیا۔

مشرقی پاکستان میں اشاعتِ اسلام

سیّد احمد کبیر سہروردی علیہ الرحمۃ نے سات سو درویش شیخ جلالؒ کے ہمراہ کر دیئے

۱ـ ملفوظ المخدوم ص ۵۵۱

تھے۔ جو ان کی طرح سلوک و معرفت کی تمام منزلیں طے کر چکے تھے۔ کئی ان میں قطب تھے اور کئی ابدال اور اوتاد۔ زاد سفر بجائے خود رہا، یہ اللہ والوں کا لشکر تیر و تبر اور تلوار تک سے محروم تھا۔ سید احمد کبیر نے ان کے لئے تلواریں مہیا کیں۔ اور سید جلال رح کو مٹھی بھر مٹی مرحمت کر کے فرمایا۔ جہاں اس رنگ و بو کی مٹی ملے اُسے وطن بنا کر خلق خدا کو سبیل الرشاد پر چلانے کی کوشش کرنا، اور تلوار کو بلا ضرورت استعمال نہ کرنا!

سہروردی مجاہدین کی یہ فوج تسبیح و تہلیل کی فلک شگاف صداؤں میں اُچ سے روانہ ہوئی۔ راستے میں کئی مقامات پر طاغوتی طاقتیں ٹکر لینے کو بڑھیں، مگر بُری طرح ناکام رہیں۔ ہر جگہ ان مٹھی بھر درویشوں نے کفر و ضلالت کے قشون قاہرہ پر فتح پائی۔ شیخ جلال رح کا یہ معمول تھا کہ جو شہر فتح ہوتا، وہ مع مالِ غنیمت کسی رفیق کے حوالے کر دیتے اور خود مختصر سے آذوقے کے ہمراہ آگے چل پڑتے الغرض دیس دیس کا پانی پیتے اور خلق خدا کو وعظ و نصیحت کرتے —— یہ درویش بنگال جا پہنچے۔

راجہ گوڑ بند سے جنگ

اُن دنوں سلہٹ میں، جس کا اصل نام سری ہٹ تھا، ایک ظالم راجہ راج کرتا تھا۔ اس کی عسکری طاقت بے حد مضبوط تھی۔ ایک لاکھ پیادہ اور کئی ہزار سوار کا لشکر جرار ہر وقت لڑنے مرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ مزید برآں اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت بڑا جادوگر ہے اور ہزاروں جن بھوت اس کے تابع ہیں۔ اس لئے کسی کو اس پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ اِن ظلم و تشدد کے باوجود اس کی ریاست میں چند مسلمان بھی آباد تھے۔ جن کی حیثیت محض مبلّغین کی تھی۔ ان

میں سے ایک بزرگ برہان الدین کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا۔ اس تقریب پر انہوں نے ایک گائے ذبح کی، سوءِ اتفاق سے ایک چیل گوشت پر لپکی اور ایک ٹکڑا اٹھا کر لے گئی۔ جو اس سے چھوٹ کر ایک برہمن کے گھر پر گر پڑا۔ برہمن بڑا بگڑا اور راجہ کے پاس شکایت لے گیا۔ راجہ کے حکم سے نومولود کو زمین پر پٹخ دیا گیا اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ برہان الدین کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ شیخ برہان الدین سلطان شمس الدین شاہِ بنگالہ کے پاس فریاد لے گیا۔ اس نے اپنے بھانجے سلطان سکندر کو اس مہم پر روانہ کیا۔ مگر راجہ کے جادو کی بڑی شہرت تھی۔ اسلامی لشکر کو شکست ہوئی۔ ان ایام میں شیخ جلال تازہ تازہ اس ملک میں وارد ہوئے تھے۔ سلطان سکندر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب امداد ہوا۔ آپ نے اُسی وقت دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور فرمایا اطمینان رکھیے، اب راجہ کا جادو آپ لوگوں پر اثر نہیں کرے گا۔ ساتھ ہی فرمایا۔ قطعاً کوئی فکر نہ کیجیے۔ ہم لوگ آپ کی فوج میں شامل ہو کر آپ کے دوش بدوش اس بہادری سے لڑیں گے کہ راجہ کو چھٹی کا دُودھ یاد آجائے گا۔

شاہ جلال رح راستے میں اپنے رفیقوں کو ملک کی اصلاحِ احوال اور اشاعتِ اسلام کے لئے متعین کرتے چلے آئے تھے۔ اس لئے اب ان کے پاس صرف تین سو تیرہ درویش باقی رہ گئے تھے۔ حضرت کی دُعا اور درویشوں کی شمولیت سے شاہی لشکر کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ایک ساعتِ سعید میں شاہ جلال رح نے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ بیک وقت سارا لشکر راجہ کی فوج پر پل پڑا۔ درویش عقاب کی طرح جھپٹ جھپٹ کر گرتے اور گوڑ گوبند کی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے تھے۔ بنگالیوں پر مسلمانوں کا بالخصوص درویشوں کا اتنا رعب چھایا کہ وہ ہراساں ہو گئے۔ اور سب کٹ کٹا کر ختم ہو گئے۔ سلہٹ

کے درودیوار تسبیح و تہلیل کی صداؤں سے گونج اُٹھے اور اس کے بلند و پست پر تجلیاتِ الٰہی کا نزول ہونے لگا۔

سلہٹ از شرفِ فلک برابر شد ہر سنگِ درو بہ تاب گوہر شد
ہر قطرہ از و بوسعتِ دریا ئیست ہر ذرہ اُس آفتابِ دیگر شد

ضلع سلہٹ کے سرکاری گزیٹر کی رُو سے سلہٹ ۱۳۸۴ء میں فتح ہوا۔ لیکن حال میں محکمہ آثارِ قدیمہ کو درگاہِ شاہ جلالؒ سے جو پُرانا کتبہ دستیاب ہوا ہے اس پر فتح اسلام کی تاریخ ثلث و سبع مائتہ یعنی ۷۰۳ھ درج ہے۔ اور مؤرخین نے اسی پر اعتماد کیا ہے (حضرت شاہ جلال کا مقبرہ سلہٹ میں ہے)۔

سہروردی درویشوں کی آبادیاں

شاہی لشکر سلہٹ کو شیخ جلال کے انتظام میں دے کر چلا گیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ اس سرزمین کی مٹی رنگ اور خوشبو میں اس مٹی سے ملتی ہے جو ان کے مرشد شیخ احمد کبیر بخاری سہروردیؒ نے مرحمت کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رفیقوں کے ہمراہ اس ملک میں آباد ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جو درویش اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے، انہیں بڑے اعزاز و اکرام سے دفن کیا۔ یہ شمشیر بکف درویش سلہٹ کے گلی کوچوں میں محوِ خواب ہیں۔ شیخ جلال جب اپنے شہید رفیقوں کے کفن دفن سے فارغ ہوئے تو انہوں نے تمام مفتوحہ زمین اپنے دوستوں میں بانٹ دی۔ اور ہر ایک کو متاہل ہونے کی اجازت بھی دے دی۔ ضلع سلہٹ میں چار ایسے مقامات ہیں، جہاں مقامی روایات کے مطابق شاہ جلال نے اپنے رفیقوں کو آباد کر کے اشاعتِ اسلام کے روحانی مراکز قائم کئے تھے۔ یعنی سلہٹ، لاتو، ہاپنیہ، ٹیلہ، ہمنگ ٹیلہ۔ اس

تقسیم میں ایک رقبہ شیخ نورالہدیٰ ابوالکرامات سعیدی حسنی کو بھی مرحمت ہوا۔ وہیں آپ متاہل ہوئے۔ آپ کی اولاد میں شیخ علی شیر بڑے فاضل انسان گزرے ہیں۔ انہوں نے نزہتہ الارواح کے دیباچہ میں درویشوں کی آبادکاری کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ مشرقی پاکستان میں سہروردی سلسلہ کے درویشوں نے اسلام کی اشاعت کا جو شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ بنگالہ کی مفصل انگریزی تاریخ میں ایک ہندو مورخ کے قلم اور مسٹر اسٹیپلٹن کی زبان سے سُنیئے۔

"اس زمانہ میں بنگالہ میں اولیاء اور غازیوں کی اتنی بڑی تعداد آگئی تھی کہ خیال ہوتا ہے کہ یہ صورتِ حال ضرور سلاطینِ دہلی کے بنگالہ سے متعلق کسی خاص سوچی ہوئی پالیسی کا نتیجہ تھی۔ فی الحقیقت یہ قیاس بے جا نہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے ان اولیائے مجاہد (soldier Saints) کا اسلام کی تاریخ میں وہی مرتبہ ہے جو صلیبی لڑائیوں کی تاریخ میں ان ٹمپلر مجاہدین کا تھا (جو مسلمانوں سے لڑنے اور عیسائی مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتے تھے) اگرچہ ان اولیائے کرام کی اخلاقی حالت مسیحی بہادروں (Knights) سے بہتر تھی اور دنیاوی حکام کے بھی یہ اُن سے زیادہ وفادار تھے۔"

ڈاکٹر کالیکا راجن قانون گو لکھتے ہیں:۔

"اولیائے کرام نے جو برہمنوں اور ہندو سادھوؤں سے علم، پارسائی، قوتِ عمل اور دُور اندیشی میں بڑھ کر تھے۔ وسیع پیمانے پر تبلیغ شروع کی۔ جس کی کامیابی کا باعث طاقت نہ تھی، بلکہ ان کا مذہبی جوش اور ان کی عملی زندگی تھی۔ رونچے طبقے کے ان ہندوؤں میں رہتے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے جو اس وقت

بھی دہمیشہ کی طرح، توہم پرستی اور معاشرتی دباؤ کے نتیجہ میں گرفتار تھے۔
دیہاتی علاقوں کے یہ باشندے مسلمان ہو کر اسلامی حکومت کے لئے ایک نئی
تقویت کا ذریعہ ہو گئے۔ بنگالہ کی عسکری اور سیاسی فتح کے سو سال بعد (اسلامی)
صوفیانہ سلسلوں کی مدد سے جو ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے۔ اس
سرزمین میں اخلاقی اور روحانی غلبہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ مندروں اور ہندو
استھانوں کو تباہ و برباد کر کے ابتدائی مسلمان فاتحین نے صرف ان کے زر و
جواہر پر قبضہ کیا تھا۔ لیکن تلوار کے زور سے تاریخی روایات ختم نہ ہو سکتی
تھیں، جن پر ہندو قومیت اور ہندو مذہب کی بنیادیں قائم تھیں۔ مسلمان
اولیاء نے اخلاقی اور روحانی فتح کے عمل کو مکمل کیا۔ اس مقصد کے لئے ہندو
دھرم اور بدھ مت کے پرانے استھانوں[1] پر (جو اب برباد ہو گئے تھے)
ایک پالیسی کے مطابق درگاہیں اور خانقاہیں قائم کر دیں۔ اس کے دو
نتیجے بر آمد ہوئے۔ ایک تو بت پرستی کے ان قدیم استھانوں میں ہندو
مت کے احیاء کا امکان جاتا رہا، اور دوسرے عوام الناس میں ایسے قصے
کہانیاں رائج ہو گئیں جن کے مطابق یہ نمودار قدیم مقدس ہستیوں کے
جانشین ہو گئے۔ ہندو عوام جو صدیوں سے ان مقامات کو مقدس مانتے
آئے تھے اُن کی پرانی تاریخ کو بھول گئے اور بڑی آسانی سے انہوں نے
اپنی ارادت کا سلسلہ ان پیروں اور غازیوں سے وابستہ کر لیا جو ان مقامات پر
قابض ہو گئے تھے۔"

---

[1] پرانے استھانوں کو مسلمان حملہ آوروں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ ان کے پروہت
مسلمان ہو گئے اور انہوں نے ہی از خود ایسے استھانوں کو اسلامی معابد کی شکل دے دی۔ تاریخیں اس امر پر شاہد ہیں (فریدی)

کیاان موثق شہادتوں کے بعد بھی کوئی غیر مسلم یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ اسلام کی اشاعت بزورِ شمشیر ہوئی؟ ہاں البتہ ہمارے صوفیاء کے اخلاقِ حمیدہ کی شمشیرِ بُرّاں ضرور چمکی۔ ان کے دروازے تمام اقوام کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے اور وہ بلا امتیازِ رنگ و ملت سب کو روحانی زندگی کا پیغام دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی یہ راستہ پسند نہیں کیا تھا کہ دوسرے مذاہب اور اُن کے بانیوں کے عیوب ظاہر کرکے اپنے مذہب کی سچائی ثابت کریں۔ دُوسرے مذاہب کے مبلغین کے علی الرغم ان کا طرزِ عمل ہر ایک سے حد درجہ مشفقانہ تھا۔ اس کا عملی نتیجہ یہ نکلتا تھا۔ کہ اسلام کی کششِ صادقہ کفّار کو اپنی طرف خود بخود کھینچ لیتی تھی۔ یہ طرزِ عمل تمام مشائخ بالخصوص سہروردی حضرات کا تھا۔ اور حضرت سیّد جلال رح بھی آخر اسی خانوادہ کے ممتاز بزرگ تھے۔ انہوں نے اسی نہج پر آسامیوں اور بنگالیوں کی تربیت کی۔ جس پر لوگ صدقِ دل سے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

آج سے چھ سو سال پیشتر جبکہ آمد و رفت کے ذرائع اس قدر سہل نہ تھے، تین سو تیرہ درویشوں کا ہزار میل کی مسافتِ بعید طے کرکے راجہ گوبند پر جا پڑنا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ہر انصاف پسند آدمی جب سلہٹ میں داخل ہوتا ہے تو وہ ان سرباز مجاہدین کو خراجِ تحسین ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بلکہ انگریزی حکومت کے ابتدائی دَور میں ہر نئے حاکمِ ضلع (کلکٹر) کو شیخ جلال رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ نُور بار پر لازمی طور پر حاضری دینا پڑتی تھی۔ اب تو خیر حکومت ہی اسلامی ہے اور مسلمان حکام کو دلی ارادت اور عقیدت کشاں کشاں اس گنجِ شہیداں پر لے آتی ہے جنہوں نے آج سے چھ سو برس پیشتر مشرقی بنگال کے کفرستان میں پہنچ کر راجہ گوبند کو یہ بتا دیا تھا، کہ مسلمان لاوارث قوم نہیں ہے، اگر مشرق میں کسی کمزور مسلمان پر ہاتھ اُٹھے گا تو مغرب سے بگولے

کی طرح اُٹھ کر طاقت ور مسلمان اس کی مدد کو آ پہنچیں گے۔

میر حسینیؒ

عبدالدین احمد نام۔ میر حسینی عرف، ہرات کے ادیب، شاعر اور عالی گرامی تاجر تھے۔ ملتان آ کر حضرت شیخ الاسلامؒ سے بیعت کی اور ولایت کے درجہ پر فائز ہوئے نزہتہ الارواح، طرب المجالس، زاد المسافرین اور کنز الرموز حضرت شیخ الاسلام کی خانقاہ میں بیٹھ کر تصنیف فرمائیں۔ ۲۰ سوالات، جن کے جواب میں علامہ محمود شوستری نے گلشن راز مدوّن فرمائی تھی۔ آپ نے یہیں مرتب کئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے بعد بھی آپ کافی عرصہ ملتان میں رہے اور پھر واپس ہرات تشریف لے گئے۔ آپ کا مزار ہرات میں مرجع خواص و عوام ہے۔

مولانا عراقی

مولانا فخر الدین عراقی حضرت شیخ الشیوخ کے خواہر زادے اور دار العلوم دمشق کے ممتاز مدرس تھے۔ ایک دن آپ مدرسہ میں درس دے رہے تھے کہ دفعتہً قلندروں کی ایک جماعت آ پہنچی۔ ان کے ساتھ ایک صاحب جمال لڑکا بھی تھا۔ شیخ کی نظر اس پر پڑی تو سو جان سے فدا ہو گئے۔ اور چار ابرو کا صفایا کرا ان قلندروں میں جذب ہو گئے۔ عراق سے ہمدان، ہمدان سے خراسان اور خراسان سے یہ قلندر ملتان پہنچے۔ حضرت شیخ الاسلام نے اس کی جبین پر سعادت کی جھلک دیکھی تو انہیں گلے سے لگا لیا۔ جس سے مولانا عراقی کے دل سے قلندر زادے کا خیال محو ہو گیا۔ حضرت نے انہیں اپنا لباس پہنایا اور اپنے خلوت خانہ کے قریب رہنے کو حجرہ مرحمت فرمایا۔ اور کمال توجہ سے تربیت فرمائی۔ جس سے مولانا عراقی نے بہت جلد فقر و ولایت میں بڑا مقام حاصل کر لیا۔ حضرت شیخ الاسلام نے ان

کے ساتھ اپنی ایک صاحبزادی کا نکاح کر دیا۔ اس مستورہ کے بطنِ عفت سے شیخ کبیرالدین تولد ہوئے۔ مولانا عراقی شیخ الاسلام کی وفات کے بعد عراق اور مصر سے ہوتے ہوئے دمشق پہنچے اور خط لکھ کر اپنے بیٹے کو بھی بلا لیا۔ مولانا عراقی اور ان کے صاحبزادے کے مزارات محی الدین ابن العربی قدس سرہٗ کے جوار میں واقع ہیں۔ مولانا عراقی صوفی کلام شاعر تھے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎

نیم اہل زہد و تقویٰ بمن آر ساغر مے ۔۔۔ کہ بصدق توبہ کردم ز عبادت ریائی
تو مرا شراب دردہ کہ ز توبہ توبہ کردم ۔۔۔ ز صلاح خود بدیدم ہمہ لافِ خود نمائی
چوں زیادہ مست گشتم چہ کلیسا و چہ کعبہ ۔۔۔ چو بترک خود گرفتم چہ وصال و چہ جدائی
بہ قمار خانہ رفتم، ہمہ پاکباز دیدم ۔۔۔ چو بصومعہ گزشتم ہمہ یافتم دغائی
بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد ۔۔۔ کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی
بطوافِ کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند ۔۔۔ کہ برون در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

در دیر مے زدم سر ز درون ندا برآمد
کہ بیا بیا عراقی! تو ز خاصگانِ مائی!

قاضی حمیدالدین ناگوری

حضرت قاضی حمیدالدین ناگوری شیخ الشیوخ کے خلیفہ مجاز اور حضرت شیخ الاسلام کے پیر بھائی تھے۔ دہلی جاتے ہوئے ملتان سے گزرے اور ایک سال دو ماہ سات دن یہاں مقیم رہے۔ آپ بلند پایہ واعظ اور کامل درویش تھے۔ روزانہ عصر کے بعد وعظ کرتے تھے۔ طبیعت کی یک رنگی نے مولانا عراقی کو ان کا والہ و شیدا بنا دیا تھا۔ جب قاضی صاحب دہلی کو روانہ ہوئے تو عراقی بے چین ہو گئے۔ ان کی

شان میں کئی قصیدے لکھے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہمہ جائے تراخوش است ولیک — بے تو خوش نیست اہلِ ملتان را

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

گر عزیمت کنی اے دوست بسوئے ملتاں
چہ مبارک بود آں عزم و چہ نیکو سفرے

حضرت قاضی صاحب نے ۶۴۱ھ میں وفات پائی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کے جوار میں سپردِ خاک ہوئے۔

لعل شہباز قلندرؒ

یہ حسینی سیّد تھے۔ نام سید عثمان اور مرند کی نسبت سے المرندی کہلاتے تھے۔ ملتان تشریف لاکر حضرت شیخ الاسلام کے مرید ہوئے اور ارتباط اس قدر بڑھا کہ چار یاروں میں شمار ہوئے۔ چونکہ سُرخ لباس پہنتے تھے۔ پیرِ طریقت سے لعل شہباز کا خطاب پایا۔ ۶۷۴ھ میں آپ نے انتقال فرمایا اور سہوان میں دفن ہوئے۔ ملک اختیار الدین والی سیوستان نے عالی شان مقبرہ تعمیر کرایا۔ اور نواب دیندار خاں و میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے اپنے اپنے دَور میں مرمت کرائی۔

مخدوم عبد الرشید قریشیؒ

آپ حضرت شیخ الاسلام کے چچازاد بھائی اور شیخ احمد غوثؒ کے صاحبزادے تھے۔ سید علی ہمدانی سے فیضان حاصل کیا اور ملتان سے جانب شرق آباد ہوئے۔ مخدوم عبد الرشید کے چار حرم تھے۔ ایک بی بی شیخ الاسلام کی ہمشیرہ تھی، دوسری

تغلق کی صاحبزادی تھی۔ تیسری بی بی رائے مونا قوم کھچی کی دختر نیک اختر، اور چوتھی شادی مڑلوں میں ہوئی۔ جس گاؤں میں آپ نے سکونت اختیار کی وہ آپ کے نام کی نسبت سے "مخدوم رشید" کہلاتا ہے۔ اس میں شیخ الاسلام کی ہمشیرہ اور رائے مونا کی صاحبزادی کی اولاد آباد ہے۔ مڑل بی بی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور تغلق بی بی سے مخدوم حسن پیدا ہوئے۔ صاحب منبع البرکات نے حضرت مخدوم اور ان کی اولاد کا شجرہ اس طرح سے دیا ہے:۔

شیخ ابوبکر

شیخ محمد غوث　　　شیخ احمد غوث

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ

مخدوم عبدالرشیدؒ　مخدوم عبدالرحمٰن　مخدوم طاہرؒ عرف بگا شیر　مخدوم شیخ ساون　مخدوم موسیٰ نواب　مخدوم راول دریا　مخدوم شیخ فیض علی عرف ملاں فقیر

مخدوم سلطان ابوبکر　مخدوم محمد سلطان　مخدوم حسن　مخدوم صدرالدین

مخدوم رکن الدین

مخدوم شمس الدین

سلطان ایوب قتال　مخدوم لعل حافظ　مخدوم یعقوب　مخدوم ہو
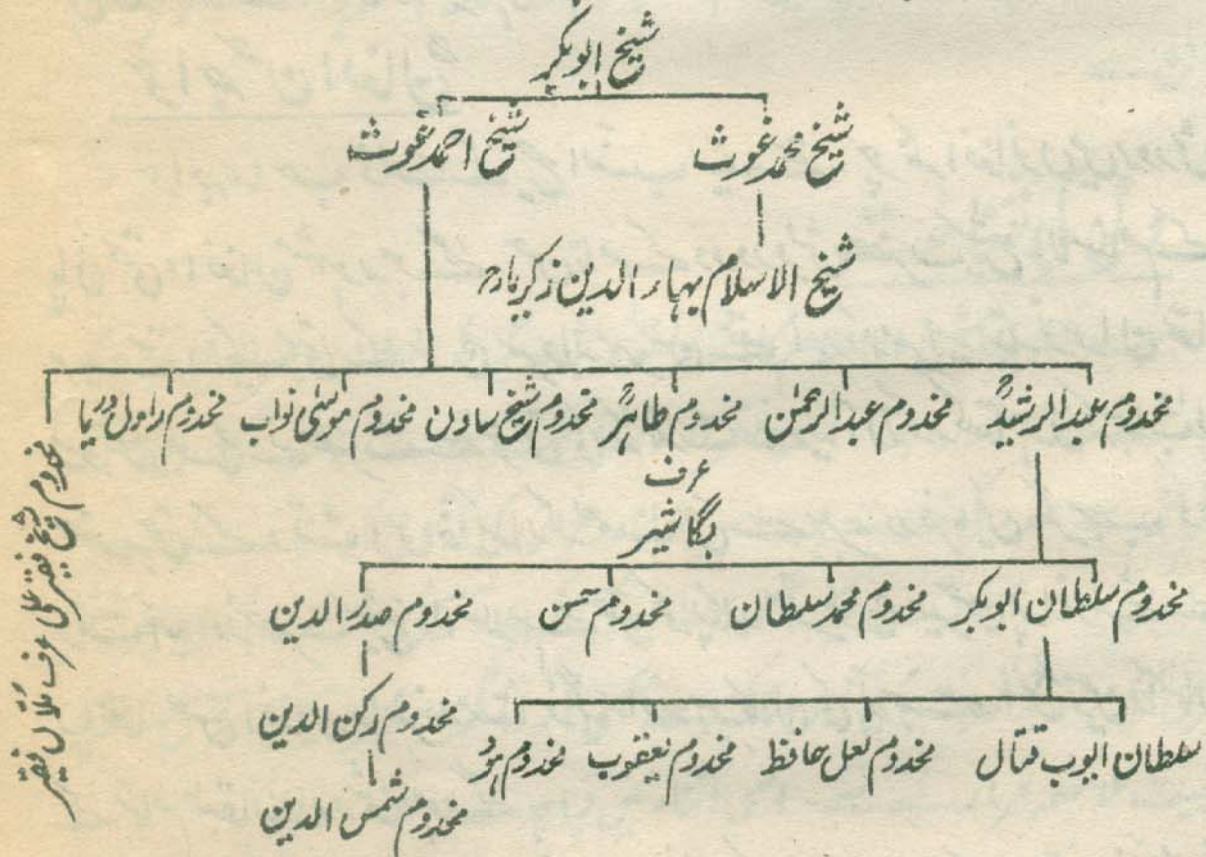
حضرت شیخ الاسلام کو اپنے بھائی مخدوم عبدالرشید سے بڑی محبت تھی۔ ایک دفعہ آپ کو معلوم ہوا کہ بھائی کے پیٹ میں درد ہے۔ آپ نے بصورت خاص دوائی کی ایک پڑیہ بھجوائی۔ مخدوم عبدالرشید نے فرمایا کہ بھائی کی دوائی سے صرف میں فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا۔ کنوئیں میں ڈال دو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ

استفادہ کریں!

خدام نے پڑیہ کنوئیں میں ڈال دی۔ مخدوم عبدالرشید نے بھی اسی کنوئیں کا پانی منگوا کر پیا اور صحت یاب ہوئے۔ پھر لوگوں نے پیٹ کی ہر قسم کی بیماری کے لئے اس کنوئیں کا پانی پینا شروع کر دیا۔ اور جو بھی پیتا شفایاب ہو جاتا۔ اب ۱۹۷۱ء ہے۔ اس وقت تک اس کنوئیں میں یہی تاثیر موجود ہے، اور خلق خدا باقاعدہ استفادہ کر رہی ہے۔

خواجہ حسن افغانؒ

خواجہ صاحب ذات کے صحیح النسب سید تھے۔ چونکہ افغانوں میں پرورش پائی تھی، افغان مشہور ہو گئے۔ حسن نام کے دو درویش حضرت شیخ الاسلام کے مرید تھے۔ ایک سبّی کے بلوچ سردار میر حسن تھے اور دوسرا یہ سیّد نوجوان تھا۔ میر حسن بلوچ نے حضرت سے عرض کی کہ مدت سے یہ آرزو رکھتا ہوں کہ جناب والا حضور حق کے وقت اس خاکسار کو نعمت حق سے بہرہ ور فرمائیں، مگر جب وہ وقت آیا اور حضرت شیخ الاسلام نے حسن کو پکارا تو بلوچ میر حسن پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ حسن افغان حاضر خدمت ہو گیا۔ اور پیر کامل کی توجہ سے اس پر زمین و آسمان کے تمام طبقات روشن ہو گئے۔

خواجہ حسن افغان نے بے شمار ریاضتیں کیں۔ ولایت کے مرتبے پر فائز ہوئے اور وہ درجہ پایا کہ حضرت شیخ الاسلام فرمایا کرتے تھے کہ

"اگر قیامت کے دن مجھ سے سوال ہوا کہ تم دنیا سے کیا تحفہ لائے ہو تو عرض کروں گا کہ خواجہ حسنؒ کا صدق اور صحیح اعتقاد لایا ہوں۔"

جب فقر و ولایت کی تکمیل ہو چکی تو شیخ الاسلام نے حکم دیا کہ افغانوں میں جا کر

تبلیغ کرو۔ چنانچہ کافی عرصہ آپ نے غزنیوں میں اصلاحِ احوال کا کام کیا۔ آخری عمر میں ملتان واپس تشریف لائے اور مرشد کے قدموں میں دفن ہوئے۔

شیخ اسمٰعیل قریشی

ذات کے صدیقی قریشی اور مادر زاد ولی تھے۔ حضرت نے انہیں اقوام دلگھ وڈھول کی اصلاحِ احوال پر متعین کیا۔ اسّی برس کی عمر میں راہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ مزار پُرانوار عمر پور میں ہے۔ یہ گاؤں جلال پور پیروالہ سے جانبِ غرب واقع ہے۔

ولی کی شناخت

جب حضرت شیخ الاسلام کا اثر و نفوذ بڑھ گیا تو سلطان ناصر الدین قباچہ کو آپ سے ملنے کا شوق ہوا۔ اُسے فقرا و مشائخ سے عقیدت نہ تھی۔ ایک دن امتحان کی غرض سے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ "ولی کی شناخت کیا ہے؟" اُس وقت اتفاق سے ایک مکھی سلطان کی ناک پر آبیٹھی، اس نے اُڑایا، پھر آبیٹھی۔ الغرض کئی مرتبہ یہ نوبت آئی کہ وہ ناک سے مکھی اُڑاتا مگر وہ پھر آبیٹھتی۔ حضرت شیخ الاسلام یہ کیفیت ملاحظہ فرما رہے تھے۔ اسی اثنا میں قباچہ نے دوبارہ سوال کیا

"نشانِ اولیا چیست؟"

شیخ الاسلام نے فرمایا کہ ولی کی شناخت یہ ہے کہ اس پر مکھی نہیں بیٹھتی۔ لیکن تیری ناک پر بیٹھتی ہے۔ قباچہ کھڑا ہو گیا اور اس نے اقرار کیا کہ واقعی آپ ولی ہیں۔ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ شیخ الاسلام کے بدن اور لباس پر کسی نے عمر بھر مکھی کو بیٹھے نہیں دیکھا۔

شیخ الاسلام کی فیاضی

قباچہ کے عہد میں ایک بار سخت قحط پڑا، حضرت کے لنگر خانے میں گندم کی کافی مقدار موجود تھی۔ اس نے آپ سے کچھ گندم طلب کی۔ آپ نے فرمایا کہ فلاں انبار خانے کی گندم دے دی جائے۔ جب سلطان کے ملازمین آئے اور انبار خانے سے گندم اُٹھانا شروع کی تو اس میں سے نقرئی سکّوں کے سات کوزے برآمد ہوئے۔ سلطان کو اطلاع ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ یہ کوزے حضرت کی خدمت میں واپس کر دیئے جائیں۔ لیکن حضرت نے فرمایا کہ ہمیں ان کوزوں کا پہلے سے علم تھا اور گندم کے ساتھ ہم نے چاندی کے یہ کوزے بھی بخش دیئے۔[1]

علمار کا احترام

سلطان ناصر الدین قباچہ حضرت شیخ الاسلام کے بے پناہ اثر و نفوذ کو اپنی حکومت کے لئے مستقل خطرہ خیال کرتا تھا۔ اس لئے بڑے سوچ بچار کے بعد کاشان کے علامہ قطب الدین کو ملتان آنے کی دعوت دی۔ وہ بھی فقرار اور مشائخ کے چنداں معتقد نہ تھے۔ علامہ بڑی شان سے ملتان میں داخل ہوئے اور مدرسہ ناصریہ کے شیخ مقرر ہوئے۔ قباچہ اُن کا بڑا ادب کرتا تھا اور اُمرائے دربار کو بھی حکم تھا کہ اُن کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں۔ حضرت شیخ الاسلام کو سب کچھ معلوم تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے محل سے چل کر جامع مسجد میں پہنچتے، اور مولانا کاشانی کی اقتدار میں صبح کی نماز ادا کرتے تھے۔ ایک دن علامہ نے عرض کی۔ حضور! نماز اپنی مسجد میں کیوں نہیں پڑھ لیتے، اس قدر تکلیف کی کیا

---

[1] سیر العارفین از مولانا جمالی

ضرورت ہے۔ فرمایا، میں اس حدیث پاک پر عمل کرتا ہوں من صلّی خلف عالم فکانما صلّی خلف نبی مرسل۔ یعنی جس نے کسی باعمل عالم کے پیچھے نماز پڑھ لی گویا اس نے نبی مرسل کے پیچھے نماز ادا کی۔

سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کا ملتان پر حملہ

خوارزم شاہ کی شکست کے بعد اس کا نوجوان اور اولوالعزم ولی عہد سلطان جلال الدین[1] آخر دم تک مغلوں سے بے جگری اور بہادری سے لڑتا رہا۔ جب اسے ایران، اور افغانستان سے کوئی کمک نہ ملی، تو وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ اُسے امید تھی کہ ہندوستان کی اسلامی حکومت اس کا سہارا بنے گی۔ وہ اِس اُمید میں اٹک تک اُڑا چلا آیا۔ اور اس کے پیچھے چنگیز خاں بھی لشکرِ جرّار کو سرپٹ دوڑاتا سندھ تک آپہنچا۔ مگر جب اُس نے جلال الدین خوارزم شاہ کا ساٹھ فٹ اونچی پہاڑی سے گھوڑے سمیت دریا میں کودنا اور پھر مڑ کر پیچھے دیکھنا ملاحظہ کیا تو اس نے اپنے مُنہ میں انگلی داب لی۔ بے اختیار اُس کے مُنہ سے نکلا کہ کاش! یہ میرا بیٹا ہوتا۔ وہ جلال الدین کی ہمّت و شجاعت کو دیکھ کر ایسا خوش ہو رہا تھا کہ اُس نے سواروں کو وہیں روک لیا اور بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ:-

"مادرِ گیتی ایسے فرزند گاہے گاہے پیدا کرتی ہے۔ اگر قسمت نے اس کا ساتھ دیا تو یہ اپنے باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔"

جلال الدین نے لاہور پہنچ کر سلطان شمس الدین التمش اور ناصر الدین قباچہ سے

The Moghal Empire by Michal Prawda [1]

امداد طلب کی، مگر وہ چنگیز جیسے سفاک دُشمن سے لڑائی مول لینے کو تیار نہ تھے جن کا ایمان ہی یہی تھا کہ جہاں جائے وہاں انسان کی نسل مٹا دے!

آمدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

التمش نے جلال الدین کے نام پیغام بھیجا کہ یہاں کی آب و ہوا آپ کو راس نہ آئے گی۔ جلال الدین اس کا مفہوم سمجھ گیا اور سندھ کی طرف روانہ ہُوا۔ ناصر الدین قباچہ کو علم ہُوا تو یہ پُورے لشکر کے ساتھ مقابلے میں نکلا۔ سلطان کے جرنیل اوزبک پائی نے کھوکھروں کی مدد سے اُوچ کے مقام پر قباچہ سے خونریز جنگ کی۔ جس میں قباچہ کو شکست ہوئی اور یہ بھکر کی طرف بھاگ گیا۔ سلطان ملتان کو روانہ ہُوا۔ قباچہ یہ خبر سُن کر فوراً ملتان آیا اور قلعہ بند ہو بیٹھا اوزبک پائی نے بڑھ کر قلعے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت شیخ الاسلام نے سلطان کے نام پیغام بھیجا کہ "اِس شہر میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں ان کی خونریزی سے تیرے ہاتھ کیا آئے گا!"

سلطان نے حضرت شیخ الاسلام کے سفیر کا بڑا احترام کیا اور فوراً ملتان سے محاصرہ اُٹھا لینے کا حکم دیا۔ اور یہ جنگجو، مگر حوصلہ مند نوجوان اپنی قسمت سے ایک بار پھر ٹکرانے کے لئے براستہ سیوستان اپنے ملک کو واپس لوٹ گیا۔

مغلوں کا حملہ

تمام تاریخوں کا اِس امر پر اتفاق ہے کہ چنگیز خاں نے دریائے سندھ کو عبور نہیں کیا۔ لیکن اس کا جرنیل طرطائی[1] سندھ کو عبور کر کے بھیرہ تک آ پہنچا اور

---

[1] آئینِ اکبری میں اس جرنیل کا نام ترم طائی لکھا ہے۔

اس شہر کی آبادی کو حکم دیا کہ فوج کے لئے کشتیاں تیار کرے۔ چنانچہ تھوڑے سے عرصہ میں کشتیاں تیار ہوگئیں۔ طرطائی نے ان کشتیوں کو دریائے جہلم میں ڈال دیا اور بڑے بڑے پتھر[1] ان میں بھروائے، تاکہ ان سے ملتان پر حملہ کرسکے۔ جب یہ فوج ملتان پہنچی تو اس نے منجنیقوں[2] سے قلعہ پر سنگباری شروع کی فصیل جگہ جگہ سے شکستہ ہوگئی۔ ہوورتھ کے بیان کے بموجب طرطائی کے ساتھ مغل شہزادہ "بیلا" بھی تھا۔ یہ دونوں جرنیل فوج کو لڑا رہے تھے۔

قباچہ درویشوں کی پناہ میں

ان ایام میں شیخ الاسلام اپنے پیر و مرشد شیخ الشیوخ سہروردی علیہ الرحمۃ کے لئے سخت فکرمند ہو رہے تھے۔ مغلوں کی فوج نے اسلامی ممالک میں دھاندلی مچائی تھی۔ طوفان نوحؑ کے بعد دُنیا پر یہ بہت بڑی مصیبت تھی جو نوع انسانی پر نازل ہوئی تھی۔ منگولیا کی اس تیز و تُند آندھی نے ہزاروں شہروں کو بے چراغ کردیا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام پریشانی کے اسی عالم میں بغداد کو روانہ ہوئے ابھی ایک منزل چلے تھے کہ سیّد جلال الدین تبریزی[3] اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات ہوئی۔ شیخ جلال الدین تبریزی نے فرمایا۔

"شیخ الشیوخ کا فرمان ہے کہ آپ واپس چلے جائیں"۔ (فوائد الفواد، جلد ا ص ۳۲)

مُرشد کی خیر و عافیت سُن کر آپ کو اطمینان ہُوا۔ اور اپنے باکمال مہمانوں کے

---

[1] تاریخ روضۃ الصفا [2] تاریخ جہاں کشائے جوینی [3] سید جلال الدین تبریزی نے سالہا سال تک شیخ الشیوخ کے محافہ کے ہمراہ چولہا دیگ سر پر اٹھانے کی خدمت انجام دی تھی۔

ہمراہ ملتان کو واپس لوٹ آئے۔

ملتان پہنچ کر یہ دونوں بزرگوار حضرت شیخ الاسلام کے ہاں مہمان ہوئے۔ تینوں بزرگوار عشا کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے تھے، اور نوافل میں پورا قرآن مجید ختم کر لیتے تھے۔ انہی لیل و نہار میں یہ خدایاد درویش زندگی بسر کر رہے تھے کہ طرطائی نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ قباچہ گھبرا کر شیخ الاسلام کی خانقاہ میں آیا اور عرض کی

"اے خدایاد درویشو! کوئی چارہ گری کرو! خدا کی قسم، اگر مغل شہر میں گھس آئے، تو ایک متنفس بھی زندہ نہ بچے گا!"

اُسی وقت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ نے ایک تیر منگوایا اور قباچہ کے حوالے کر کے فرمایا

"یہ تیر لے جاؤ، اور رات کے اندھیرے میں اسے برج پر سے دشمنوں کی طرف پھینک دو!"

حضرت خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ قباچہ وہ تیر لے کر چلا گیا اور حسب الارشاد رات کو کمان لے کر قلعہ کے ایک برج پر پہنچا۔ اور چلّہ چڑھا کر تیر پوری قوّت سے مغلوں کی فوج پر دے پھینکا۔ خدا کی شان کہ رات کی تاریکی میں وہ بے پناہ لشکر اس طرح غتر بود ہوا کہ صبح کو اس کا نشان تک نہ رہا[1]

اس واقعہ کا قباچہ کے معتقدات پر یہ اثر ہوا کہ وہ درویشوں کو ملک کے لیے آیۂ رحمت سمجھنے لگ گیا۔ چنانچہ چند روز بعد جب حضرت خواجہ قطب الدین

[1] سیر العارفین از مولانا جمالی

بختیار کاکی دہلی کو اور شیخ جلال الدین تبریزی غزنی کو روانہ ہونے لگے تو اس نے بڑی منت خوشامد سے انہیں کچھ عرصہ اور ٹھہرانے کی کوشش کی اور عرض کی:۔
"چند گاہ دیگرے سایۂ برکت دریں مقام ارزانی فرمائید[1]!"
لیکن حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم لوگ زیادہ عرصہ یہاں نہیں ٹھہر سکتے، کیونکہ یہ مقام حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کی تحویل میں دیا جا چکا ہے۔ اور ہمیشہ ان کی پناہ[2] میں رہے گا۔ یہ کہہ کر دونوں بزرگوار اپنے اپنے سفر پہ روانہ ہو گئے۔

حضرت گنج شکرؒ کا زمانۂ طالب علمی

حضرت شیخ الاسلام کی زندگی میں جن قدسی نفوس کو آپ کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان میں حضرت گنج شکر زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ محبت اور

---

[1] کچھ عرصہ اور ملتان پر سایہ فگن رہیں [2] شیخ محی الدین ابن العربی اور ان کے ہم خیال مشائخ کا اعتقاد ہے کہ دنیا کے ظاہری نظام کے ساتھ ساتھ ایک باطنی نظام بھی ہے، جو قطبوں، ابدالوں، اور اوتادوں کے سر پر قائم ہے۔ شیخ ابن العربی نے فتوحاتِ مکیہ میں کئی جگہ اس نظریئے کی تائید کی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ "جب ولی مقامِ قطبیت، غوثیت اور فردیت کو طے کر کے مرتبہ محبوبیت کو پہنچتا ہے تو اس کی ذات مظہرِ الٰہی ہو جاتی ہے اور اس کا ارادہ بھی ارادۃ اللہ ہوتا ہے۔"
بلاشبہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ اپنے زمانہ کے غوث الاغواث اور فرد الافراد تھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بنا پر فرمایا کہ ملتان کے علاقے کا نظام ان کے سر پر قائم ہے۔

اخوت کا یہ رشتہ اخیر دم تک قائم رہا۔ بعض تذکرہ نگاران دونوں بزرگوں کو خالہ زاد بھائی ظاہر کرتے ہیں۔

آپ کا نام فریدالدین مسعود ہے۔ آپ مولانا جمال الدین سلیمان کے فرزند تھے۔ کھتوال کو جس کا موجودہ نام "دیوان چاولی مشائخ" ہے۔ آپ کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ ابھی چھوٹے بچے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ حضرت کی والدہ نے آپ کو گاؤں کے عالم کے پاس پڑھنے بٹھایا۔ جب یہاں کی تعلیم پوری ہوگئی تو تکمیل علوم کے لئے آپ کو ملتان بھجوایا۔ یہاں آپ نے قرآن حفظ کیا۔ اور مولانا منہاج الدین کی مسجد میں فقہ کی مشہور کتاب "نافع" شروع کی۔ ایک دن حضرت اسی مسجد میں بیٹھے کتاب "نافع" کا مطالعہ کر رہے تھے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نماز پڑھنے کے لئے اس مسجد میں چلے آئے۔ آپ کو کتاب کے مطالعہ میں مصروف دیکھ کر پوچھا

"میاں صاحبزادے! کیا پڑھ رہے ہو؟"

آپ نے مطالعہ جاری رکھا اور جواب دیا۔ "حضرت! نافع پڑھ رہا ہوں!"

خواجہ صاحب نے مسکرا کر دوبارہ سوال کیا۔ "کیا یہ کتاب تجھے نفع دے گی؟"

ہونہار طالب علم نے کتاب سے نظر اٹھا کر متکلم کی طرف دیکھا تو اسے ان کے چہرے پر عجیب جاہ و جلال برستا نظر آیا۔ آنکھوں کا جادو ہونا تھا کہ دل کی کائنات میں تہلکہ برپا ہوگیا۔ کتاب بند کر کے ایک جانب رکھ دی اور فوراً خواجہ کے قدموں

ؔ۱ مولانا منہاج الدین ترمذی الملتانی اصول وفقہ میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت خواجہ قطب الدین کاکی علیہ الرحمۃ ان سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے۔

میں جھک گئے۔ عرض کی: "اس کتاب نے کیا نفع دینا ہے۔ البتہ حضرت کی نظر کیمیا اثر سے نفع پہنچنے کی اُمید ضرور ہے۔"

حضرت خواجہ دہلی کو روانہ ہوئے تو شیخ فرید الدین بھی ساتھ چل پڑے تین منزلیں طے کی تھیں کہ خواجہ نے آپ کو طلب کر کے فرمایا:-

"ابھی یہاں ٹھہریئے اور علوم ظاہرہ کی تحصیل میں پوری کوشش کیجئے۔ کیونکہ بے علم زاہد مسخرہ شیطان ہے۔"

چنانچہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ خواجہ صاحب کے حکم سے ملتان لوٹ آئے کچھ عرصہ یہاں تعلیم پائی، پھر قندھار تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔ یہاں سے بغداد پہنچے اور شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی، حضرت سیف الدین باخرزی، سعد الدین حموی، بہاء الدین حموی، شیخ اوحد الدین کرمانی شیخ فرید الدین نیشاپوری رحمہم اللہ جیسے اکابر صوفیہ سے صحبتیں رہیں اور استفاضہ کیا۔ حضرت شیخ الاسلام سے پہلی ملاقات بھی اسی سفر کے دوران ہوئی، لیکن کب اور کہاں؟ تاریخ کے اوراق اس بارے میں خاموش ہیں۔ مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ پانچ برس کی سیاحت کے بعد حضرت گنج شکرؒ نے دہلی پہنچ کر حضرت خواجہؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔

ملتان پر سلطان شمس الدین التمش کا حملہ اور قباچہ کا فرار

التمش ایک ترکی غلام تھا۔ اس نے سلطان قطب الدین کے ماتحت اچھے اچھے کام انجام دیئے۔ جس سے خوش ہو کر قطب الدین نے اپنی لڑکی بیاہ دی اور بیانہ کا حاکم بنا دیا۔ ۶۰۶ھ میں سلطان لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے

گر کر مر گیا۔ ۶۰۷ھ میں التمش امرائے سلطنت کے اتفاق سے تخت پر بیٹھا۔ ۶۱۲ھ میں غزنی کے بادشاہ سلطان تاج الدین یلدوز نے پنجاب پر قبضہ کرنا چاہا، مگر التمش نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ ۶۱۴ھ میں ناصر الدین قباچہ نے پنجاب پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا، مگر ناکام رہا۔ دس سال تک التمش بنگال کی مہمات میں مصروف رہا۔ ۶۲۵ھ میں اس نے سندھ کی طرف توجہ کی، اور خود عظیم لشکر کے ساتھ اُچ آ پہنچا۔ ناصر الدین نے اپنے وزیر عین الملک حسین اشعری کو حکم دیا کہ خزانہ کو قلعہ اُچ سے منتقل کر کے بھکر میں پہنچا دے اور اُچ کے قلعہ کو مستحکم کر کے حملہ آور کا مقابلہ کرے۔

سلطان شمس الدین نے خود قلعہ اُچ کا محاصرہ کیا اور اپنے وزیر نظام الملک جنیدی کو ناصر الدین قباچہ کے تعاقب میں روانہ کیا۔ ایک مہینہ تک اُچ کا محاصرہ رہا۔ پھر صلح سے فتح ہو گیا۔[1]

سلطان ناصر الدین سلطان شمس الدین کی آمد سے اس قدر ہراساں ہوا کہ مقابلہ میں بھی نہ نکل سکا۔ تاب مقاومت نہ لا کر اُچ سے ملتان اور ملتان سے بھکر پہنچا۔ لیکن جب نظام الملک نے قشون قاہرہ کے ساتھ تعاقب کیا تو بھکر میں بھی نہ ٹھہر سکا اور سندھ کے ارادہ سے اپنے اہل و عیال سمیت کشتی میں سوار ہوا لیکن دریا کی خوفناک لہروں نے اسے دبوچ لیا اور وہ بال بچوں سمیت غرق ہو گیا۔

شیخ الاسلامی

شہاب الدین ابو العباس احمد دمشقی المتوفی ۷۴۹ھ شیخ مبارک کی روایت

[1] تاریخ ہند از مولانا ذکاء اللہ

سے مسالک الابصار فی ممالک الامصار میں منصب شیخ الاسلامی کی بابت لکھتا ہے کہ اسلامی دور میں قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلامی دو موقر عہدے ہوتے تھے۔ جنہیں دس دس قصبات جاگیر میں ملتے تھے۔ ان کی آمدنی ساٹھ ہزار تنکہ سے کم نہ ہوتی تھی۔ قاضی القضاۃ کا کام مقدمات کی سماعت اور احکامِ سزا وغیرہ دینا تھا۔ شیخ الاسلام کا کام شرع کے مطابق مسائل عامہ طے کرنا تھا۔ علما و فقہاء کے جملہ امور قاضی القضاۃ سے اور مشائخ و فقراء کے تمام معاملات شیخ الاسلام کی وساطت سے طے پاتے تھے۔[۱] سلطان شمس الدین نے شیخ نجم الدین صغرا کو اپنی قلمرو کا شیخ الاسلام مقرر کیا تھا۔ جب سید جلال تبریزی دہلی میں پہنچے اور سلطان نے ان کا شایانِ شان استقبال کیا تو یہ امر شیخ کو ناگوار گزرا۔ اس نے تبریزی صاحب کو سلطان کی نظروں سے گرانے کے لئے گوہر نامی ایک خوبصورت رقاصہ کو پانچ سو اشرفی دینے کا وعدہ کر کے اس امر پہ آمادہ کیا کہ وہ تبریزی صاحب کو زنا کی تہمت سے مطعون کرے۔ اڑھائی سو اشرفیاں اسے پیشگی دے دی گئیں، اور اڑھائی سو احمد مشرف نامی ایک بنئے کے پاس امانت رکھوا دی گئیں کہ جب یہ معاملہ رقاصۂ مذکور پایۂ ثبوت کو پہنچا دے اُس وقت اسے دی جائیں۔

گوہر نے سلطان کی خدمت میں جا کر سید جلال تبریزی پر تہمت لگائی۔ بادشاہ یہ سُن کر ششدر رہ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ حضرت سید جلال اس الزام سے بری ہیں۔ فاحشہ عورت کی شہادت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ کیونکہ زنا ثابت کرنے کے لئے اعین اربعہ کی شہادت ضروری تھی۔ لیکن چونکہ مقدمہ سامنے آچکا تھا۔ اس لئے شرعی تحقیقات

---

[۱] اسلامی ہند ص ۲۰۱

کی غرض سے سلطان نے محضر طلب کرنے کا حکم جاری کیا۔ محضر میں شرکت کے لیے اکابر علماء اور مشائخ کو خصوصی دعوت دی گئی۔

جمعہ کا دن تھا، نماز کے بعد جامع مسجد علماء اور مشائخ سے پٹی پڑی تھی۔ مولانا جمالی کے بیان کے بموجب اس محضر میں صرف اڑھائی سو تو اولیائے کرام شریک تھے۔ حضرت زکریا ملتانی بھی اپنے رفیقوں کے ہمراہ تشریف لا چکے تھے اور سلطان کے پہلو میں تشریف رکھتے تھے۔ سلطان نے شیخ نجم الدین صغرا سے فرمایا کہ ان علماء اور مشائخ میں سے جس کو آپ کی طبیعت چاہے ثالث مقرر کریں تاکہ عادلانہ فیصلہ ہو سکے۔ شیخ نے حضرت زکریا ملتانی قدس سرہٗ کا نام پیش کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی، کہ حضرت شیخ الاسلام زکریا ملتانی اور سید جلال تبریزی کے درمیان نیشاپور میں لطیف سی شکر رنجی ہو گئی تھی۔ شیخ نجم الدین کو اس واقعے کا علم تھا اور وہ ان دونوں بزرگوں کی کشیدگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ نیز انہیں حضرت زکریا ملتانی کی خشک عابدانہ زندگی کا بھی پتہ تھا کہ یہ شکوک اور شبہات سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ بہر حال وہ اس امر کو ضرور محسوس کریں گے کہ سید جلال نے اپنے طرزِ عمل سے ایسا موقع کیوں بہم پہنچایا، جس پر مخالفین کو اس قسم کے الزامات تراشنے کی جرأت ہوئی۔ الغرض حضرت زکریا ملتانی قدس سرہٗ ثالث تسلیم کر لئے گئے۔ اب سید جلال کو طلب کیا گیا۔ وہ جونہی مسجد میں داخل ہوئے تمام مشائخ ان کی بزرگی اور عظمت سے متاثر ہو کر استقبال کو بڑھے۔ حضرت زکریا نے بڑھ کر ان کی جوتیاں سنبھالیں اور آستین مبارک میں لپیٹ کر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ سلطان اس کارروائی کو بچشم حیرت دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بے ساختہ چلا کر کہا:۔

"صاحبو! جبکہ امام الاولیاء بہاء الدین زکریا جیسے جلیل القدر ثالث نے

سیّد جلال الدین کی اس قدر توقیر کی ہے۔ ان کی بزرگی میں کلام کرنا کوئی دانش مندی نہیں۔ پس وہ الزام جو رقاصہ نے سیّد جلال پر لگایا ہے، باطل ہے۔"

حضرت زکریا نے کھڑے ہو کر فرمایا:-

"میرے لئے فخر کی بات ہے کہ سیّد جلال تبریزی کے پاؤں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں، کیونکہ یہ میرے مرشد شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کے ہمراہ سات سال تک سفر و حضر میں رہے لیکن شاید شیخ الاسلام نجم الدین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ بہاء الدین نے سیّد جلال تبریزی کی تعظیم کر کے ان کے عیب پر پردہ ڈال دیا ہے تو یہ اہل اللہ پر بخوبی روشن ہے کہ حضرت سیّد جلال سے ایسے فعلِ شنیع کا واقع ہونا محال ہے۔ لیکن پھر بھی دلائلِ مبیّنہ کا اظہار ضروری ہے۔ اس لئے مدعیہ رقاصہ کو پیش کیا جائے۔"

چنانچہ رقاصہ حضرت کے سامنے لائی گئی۔ حضرت نے گرج کر فرمایا۔ "اے فاسقہ! ولی اللہ سے کوئی امر پوشیدہ نہیں، سچ سچ بیان کرو ورنہ اپنے کئے کی سزا پائے گی!"

رقاصہ پر حضرت کی شخصیت کا رُعب کچھ اس طرح سے اثر انداز ہوا کہ اس نے سارا ماجرا من وعن بیان کر دیا، اور بولی:-

"خدا شاہد ہے کہ یہ سب دروغ اور افترا ہے اور حضرت سید جلال آبِ حیات سے بھی پاکیزہ تر ہیں۔ شیخ نجم الدین صغرا نے مجھے پانچ سو اشرفیاں دینا کی تھیں ان میں سے اڑھائی سو تو میں لے چکی ہوں اور باقی احمد مشرف سبزی فروش

کے پاس امانت پڑی ہیں کہ بہتان ثابت ہونے پر مجھے ادا کی جائیں۔"
سبزی فروش کو بلایا گیا۔ اس نے بھی رقاصہ کے بیان کی تائید کی اور اڑھائی سو اشرفیاں لاکر حضرت کے روبرو رکھ دیں۔ شیخ نجم الدین صغرا کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس کے مکر و فریب کا بھانڈا اس طرح چوراہے میں پھوٹے گا۔ وہ شدت غم سے چکرا کر گر پڑا۔ سلطان شمس الدین نے برہم ہو کر حکم دیا کہ شیخ نجم الدین کی گردن اڑا دی جائے، اور خواجہ قطب الدین بختیار کو شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز کیا جائے۔
حضرت زکریا نے فرمایا کہ نجم الدین اپنے کئے کی سزا خود پائے گا۔ آپ اس سے درگزر فرمائیں۔
خواجہ قطب الدین نے شیخ الاسلامی کے بارے میں ایک رات کی مہلت مانگی اور فرمایا۔" اے یاران! میرا مشورہ یہ ہے کہ آج رات استخارہ کیجئے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جس کے نام حکم دیں اسے شیخ الاسلام کا منصب دیا جائے۔"
رات کو تمام مشائخ نے استخارہ کیا۔ آدھی رات تھی کہ سب نے خواب میں دیکھا کہ وہ عرش کے نیچے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں حضرت نے بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ کو بلا کر اپنے ہاتھوں سے ایک خلعت پہنائی اور فرمایا "شیخ الاسلامی مبارک!"
صبح کو تمام مشائخ پھر اکٹھے ہوئے اور انہوں نے حضرت زکریا علیہ الرحمۃ کو بارگاہِ نبوت سے شیخ الاسلامی کی خلعت پانے پر تہنیت پیش کی۔ سلطان خود بھی فقر و ولایت میں اونچا مقام رکھتا تھا۔ اور خواب میں یہ نظارہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے حضرت سے درخواست کی کہ وہ اس منصب کو قبول فرمالیں۔ حضرت نے مسکرا کر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس طرح پوری مملکت کے شرعی مسائل اور مشائخ و فقراء

کے جملہ امور ملتان سے متعلق ہو گئے۔ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ نے ایک روز سید جلال تبریزی کی معیت میں جمنا کے کنارے گزاری اور دوسرے دن ملتان کو روانہ ہوئے۔ میر حسینی اس سفر میں شیخ الاسلام کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔

ملتان پھر مغلوں کی لپیٹ میں

۶۳۳ھ میں سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد اگرچہ برائے نام سلطان رکن الدین، سلطانہ رضیہ، سلطان بہرام کے نام سے کئی حکمران دہلی کے تخت پر بیٹھے، مگر کسی کو استقلال نصیب نہ ہوا۔ سب کے سب دو دو تین تین سال حکومت کرنے کے بعد مارے گئے۔ جب اس بدامنی کا شہرہ ہمسایہ ممالک تک پہنچا، تو سالے نوئین نام ایک منگول سردار ملک شمس الدین حاکم ہرات کی مدد سے ۶۴۲ھ میں ملتان پر چڑھ آیا۔ عید الاضحیٰ کا موقع تھا۔ شہر میں خوف وہراس پھیل گیا حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کو اطلاع ہوئی تو آپ نے حاکم ملتان کے ذریعے ملک شمس الدین حاکم ہرات کو بلایا۔ وہ دس سواروں کے ہمراہ لوہاری دروازہ کے قریب آکر حضرت کے قدمبوس ہوا۔ آپ نے فرمایا

"بھئی! جس طرح بھی ممکن ہو، اس بلا کو دفع کرو اور میرے بچوں کو عید کرنے دو!"

ملک شمس الدین اسی وقت منگول سردار کی خدمت میں گیا اور طے پایا کہ اگر گورنر ملتان ایک لاکھ اشرفی بطور تاوان جنگ ادا کرے تو محاصرہ اٹھایا جا سکتا ہے۔
دوسرے دن حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا نے ایک لاکھ اشرفی اپنی

جیب خاص سے منگول سردار کو بھجوائی اور چنگیز خاں نے اپنی طرف سے حاکم ہرات کو شاہانہ تحفے پیش کیے۔ جس پر مطلع سیاست سے جنگ و جدل کے یہ مہیب بادل چھٹ گئے اور شہر قتل عام سے بچ گیا۔[1] عصامی ٹھیک ہی تو کہتا ہے ؎

بہر ملک اگرچہ امیرے بود ٭ ولے در پناہے فقیرے بود

ہر ملک کا اگرچہ بظاہر کوئی نہ کوئی حاکم ہوتا ہے، لیکن اس پر کوئی نہ کوئی درویش بھی ضرور سایہ فگن ہوتا ہے۔ بلاشبہ حضرت شیخ الاسلام ملتان کے باطنی حاکم تھے۔ اسی لئے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے فرمایا تھا کہ ملتان شیخ بہاء الدین کی تحویل میں دیا جا چکا ہے۔ اور ہمیشہ ان کی پناہ میں رہے گا۔ ہم دیکھتے ہیں، کہ جب تک حضرت کی ذاتِ والاصفات اس شہر پر سایہ فگن رہی، یہ شہر ہر طرح سے محفوظ و مصئون رہا۔ نہ صرف امن و امان قائم رہا، بلکہ روحانی طور پر بھی اس کا مقام بلند کر دیا۔ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے جو تازہ تازہ ملتان سے آیا تھا، مجھے بتایا کہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین ذکریا کی خادمائیں چکی پیسنے بیٹھتی ہیں تو قرآن ختم کر کے اٹھتی ہیں۔ جب نوکروں کا دینی معیار اتنا بلند ہو تو شہر کے اکابر اور اشراف کی خدا پرستی کا کیا کہنا۔ ایک موقع پر حضرت شیخ الاسلام نے اس شہر پر انوار و تجلیات کا نزول ہوتا دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھے ؎

ملتانِ ما بجنتِ اعلیٰ برابر است ٭ آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

---

[1] تاریخ نامہ ہرات از سیف بن محمد بن یعقوب ہروی ص ۱۵۷ - ۱۵۸

یعنی ہمارا ملتان فردوس بریں کی مانند ہے۔ آہستہ قدم رکھئے کہ فرشتے سجدہ کر رہے ہیں۔ ملتان کو "ملتانِ ما" کہنے میں حضرت نے قطعاً مبالغہ نہیں فرمایا۔

سلطان ناصر الدین محمود

۶۴۴ھ سے ۶۶۴ھ تک سلطان التمش کے چھوٹے صاحبزادے سلطان ناصر الدین محمود دہلی کے تخت پر رونق افروز رہے۔ یہ نہایت پرہیزگار اور متقی حکمران تھے اپنے ہاتھوں سے قرآن مجید لکھ کر بیچتے اور اسی پر گزارہ کرتے تھے۔ ان کی صرف ایک بیگم تھی جو اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتی تھی۔ ان کا وزیر اعظم الغ خان بڑا مدبر شخص تھا حکومت کا تمام کاروبار اس نے سنبھال رکھا تھا۔ اس نے تاتاری مغلوں کو دوبار شکست دی جس سے انہیں ہندوستان پر پھر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ملک شیر خاں

الغ خان نے اپنے چچازاد بھائی ملک شیر خاں کو ملتان میں گورنر مقرر کیا۔ اس نے شہر کا بڑا اچھا انتظام کیا۔ شہر کی فصیل کی مرمت کی اور گندا پانی نکالنے کے لئے ایک بڑی بدرو بنوائی، جو اب تک دہلی دروازے کے قریب موجود ہے اور بدرو شیر خاں کہلاتی ہے۔

اس نے اپنے محلات قلعہ کے باہر ہی تعمیر کرائے تھے۔ اور فردوس تمثال باغات کا سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ اس وقت نہ وہ محلات ہیں اور نہ باغات، مگر وہ محلہ اب تک ٹبی شیر خاں سے موسوم چلا آتا ہے۔ جو بیرون لوہاری دروازہ گھنٹہ گھر کے عقب میں واقع ہے۔

سلطان حمید الدین حاکمؒ

انہی ایام میں مکران کے سابق بادشاہ سلطان حمید الدین حاکم ملتان تشریف لائے۔ حضرت شیخ الاسلام نے آپ کو اپنے حجرہ کے قریب جگہ دی اور دامادی کے شرف سے مشرف فرمایا۔ اس صدف بحر عفت سے واہب العطایا نے سلطان النارکین کو ایک لولوئے شاہوار عنایت کیا۔ جسے آپ نے نورالدین سے موسوم کیا۔ جب آپ شیخ طریقت کی تلاش میں بغداد گئے تھے تو حضرت شیخ الشیوخ نے آپ کو فرمایا تھا کہ

"ابھی تیرے پیر بیعت نے گوشۂ عدم سے ساحت وجود میں قدم نہیں رکھا۔
ملتان جاؤ، وہاں فرزند مدم بہاء الدین کے پوتے رکن الدین کا انتظار کرو۔ وہی
تیرا شیخ طریقت ہوگا۔"

چنانچہ آپ اسی انتظار میں تھے۔ جونہی حضرت شاہ رکن العالم کی ولادت ہوئی۔ آپ اس خیال سے کہ شاید اس شیر بیشۂ ولایت کی حدّ بلوغت تک عمر فرصت نہ دے۔ بمفراض اس معصوم کے ہاتھ میں دے کر دوسرے ہاتھ کی مدد سے شرط حلق ادا کر کے سہروردیہ سلسلہ میں داخل ہوئے (حضرت حاکمؒ کا بقیہ حال حضرت شاہ رکن عالمؒ کے تذکرے میں ملاحظہ فرمائیں)

حضرت شیخ الاسلام کا سفر آخرت

حضرت شیخ الاسلامؒ ۹۶ سال کے لیل و نہار دیکھ چکے تھے۔ لیکن آپ کی صحت آخریں لمحات تک قابل رشک رہی۔ حضرت زندگی بھر بیمار نہیں ہوئے یہاں تک کہ سر میں درد تک نہ پڑا۔

حضرت جب اس سرزمین میں تشریف لائے تھے۔ یہ علاقہ کفر و الحاد کا گہوارہ بن رہا تھا۔ لیکن اب کایا پلٹ چکی تھی۔ ملک کے طول و عرض میں ہزاروں مبلّغین آپ کے حکم کی

تعمیل میں مئے توحید کے خم لنڈھاتے پھرتے تھے۔ اور چپہ چپہ پر قرآن وحدیث کے درس جاری تھے۔ عروس البلاد ملتان کو آپ کے یارانِ بے ریا اور اکابر خلفاء نے قبۃ الاسلام بنا رکھا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت جس مقصد کے تحت اس مینو سواد خطہ میں تشریف لائے تھے، وہ کافی حد تک پورا ہو چکا ہے۔ دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ ملکِ بقا کا مسافر نئے سفر کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ حضرت تمام دن حجرہ شریف میں معتکف رہنے لگے تھے۔ صرف نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں تشریف لاتے تھے۔ اور پھر حجرے میں چلے جاتے۔

۷ صفر ۶۶۱ھ بروز منگل حسب معمول ظہر کی نماز پڑھ کر حضرت شیخ الاسلام حجرے میں تشریف لے گئے۔ حضرت صدر الدین عارف جو آپ کے بڑے صاحبزادے اور ولی عہد تھے، حجرے کے دروازے پر کسی نامعلوم فکر میں کھوئے سے کھڑے تھے۔ کہ دفعتہً ایک نورانی چہرے کے بزرگ نمودار ہوئے۔ سبز رنگ کا ایک سربمہر خط آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ اس مظروف کو اسی وقت شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچا دیجئے۔

اس خط کا عنوان عجیب قسم کا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس پر یہ کلمات درج تھے اِرجعی الیٰ ربکِ راضیۃ مرضیۃ۔ آپ سہم گئے۔ خط والد ماجد کی خدمت میں پیش کر کے باہر آئے تو قاصد کو نہ پایا۔ اسی اثنا میں حجرے کے چاروں گوشوں سے آواز بلند ہوئی:۔ "دوست بدوست رسید"

حضرت عارف باللہ گھبرا کر واپس لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت کا سرِ نیاز سجدے میں ہے اور روح اعلیٰ علیین کو پرواز کر چکی ہے۔ سچ ہے ؎

در کوئے تو عاشقاں چناں جاں بدہند
کانجا ملک الموت نہ گنجد ہرگز!

شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ ہر طرف بجلی کی سی سرعت کے ساتھ یہ اندوہناک خبر پھیل گئی چھوٹے بڑے ہندو مسلمان سب کے سب آستانۂ عالیہ پر جمع ہو گئے۔ حجرہ شریف ایک بے مثال خوشبو سے مہک رہا تھا۔

شیخ عمر عمودی نے حضرت کے جسدِ اطہر کو غسل دیا اور حضرت شیخ العارف صدر الدین محمد علیہ الرحمۃ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور خانقاہ شریف میں جہاں آپ سالہا سال تک مصروفِ عبادت رہے تھے، سپردِ خاک کر دیئے گئے انا للہ وانا الیہ راجعون[1]
کئی ماہ تک اطرافِ عالم سے گروہ در گروہ لوگ روتے پیٹتے، چیختے چلاتے تعزیت

---

[1] قبۂ ابیض حضرت شیخ الاسلام اپنی خانقاہ میں دفن کئے گئے جو انہوں نے عبادت گاہ کے طور پر خود تعمیر کرائی تھی۔ ۱۸۴۸ء کی جنگ میں گولہ باری سے حضرت کے مقبرہ کا بالائی حصہ شہید ہو گیا۔ صاحب سجادہ نے انگریز گورنمنٹ سے مقبرہ کی مرمت کے لئے مبلغ دس ہزار روپے کا مطالبہ کیا جو منظور نہ ہوا۔ اس پر سجادہ نشین صاحب نے باعانت ارادتمندان خود مقبرے کی مرمت کرائی۔ ۱۸۶۰ء میں پرہلاد مندر کا کلس ہندوؤں نے چندہ کر کے بہت اونچا کر دیا۔ جس پر صاحب سجادہ نے اظہارِ ناراضگی کیا اور شہر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ہندو مسلم تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ بلوہ ہو گیا۔ جس پر حکامِ وقت کی مداخلت سے ہندوؤں کو پرہلاد مندر کا کلس شیخ الاسلام کے مقبرہ سے نیچا کرنا پڑا۔ اس وقت جبکہ کتاب پریس میں جا رہی ہے۔ محکمہ اوقاف صوبہ پنجاب نے کئی لاکھ روپے اس مقبرہ کی مرمت کے لئے منظور کئے ہیں اور خان ولی اللہ خان سابق سپرنٹنڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ کی نگرانی میں کام ہونا طے پایا ہے۔ خان صاحب بزرگانِ دین سے گہری عقیدت اور قدیم طرزِ تعمیر پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ امید ہے خانقاہِ معلّٰی اسی شکل و صورت کو پالے گی جس میں خود شیخ الاسلام نے اسے تعمیر کرایا تھا۔ (فریدی)

کو آتے رہتے۔ رات کو سرائے میں ٹھہرنے والے حجرہ نشین درویشوں اور مستقل خدام کے علاوہ مہمانوں کی تعداد پانچ سو، سات سو اور کبھی ایک ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ ان سب کو ان کے مرتبہ کے لحاظ سے کھانا اور بستر وغیرہ ملتا تھا۔ حضرت سید السادات جلال بخاری قدس سرہٗ اپنے پیر طریقت کی وفات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

شیخ الکبیر المنیر، قطب العلمین، غوث الثقلین، مخدوم العالم شیخ بہاء الدین بہام الحق والشرع والحقیقت والطریقت والدین ابو محمد زکریا رحلت فرمود من دار الفناء الی دار البقاء یوم الثلثا بعد اداء الظہر حین قرابا دخول وقت العصر فی السابع من شہر الصفر سن احدٰی وستون وست مائۃ وکان عمرہٗ ستۃ وتسعون غسلہ شیخ عمر عمودی وصلی علیہ شیخ الاسلام ابو المغانم صدر الدین محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ والمدفون فیہا دخل الحصن القدیم فی حجرتہ وجاء الناس من بلاد شتیٰ افواجًا وافزاعًا کاھم اضیافہم وبلغ جماعۃ الاضیاف فی بعض الاوقات من خمس مائۃ الی سبع مائۃ والی الف سوی سکنۃ الرباط والحجرات والعلم۔

پاکپتن میں غائبانہ جنازہ

جس دن شیخ الاسلام کا انتقال ہوا۔ حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ پاکپتن میں تھے اور ذکر ومراقبہ میں مصروف تھے۔ دفعتہً آپ پر غشی کا عالم طاری ہو گیا جب ہوش میں آئے تو آیدیدہ ہو کر شیخ عبداللہ بنجی کی طرف دیکھا اور فرمایا:۔

"آج برادرم بہاء الدین کا وصال ہو گیا۔ میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے، کہ ایک ہزار فرشتے ان کے آگے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ ان کے پیچھے ہیں

اور شیخ بہاء الدین کو آسمان کی طرف لئے جاتے ہیں؟ پھر فرمایا۔۔
"آئیے! تاکہ اپنے بھائی کا جنازہ پڑھیں!"
چنانچہ خانقاہ کے تمام افراد وضو کر کے جمع ہو گئے۔ اور حضرت گنج شکر علیہ الرحمۃ کی امامت میں غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی۔

الغرض ہدایت اور ولایت کے آسمان کا یہ نیّرِ اعظم جو تقریباً نصف صدی سے ہندوستان کے کفرستان پر ضیا پاشی کر رہا تھا۔ اپنا نور زمانہ بھر میں بکھیر کر ملتان کے فلک بوس قلعے میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ لیکن اس کا غروب ہونا سورج کا غروب ہونا نہیں ہے۔ وہ صرف نگاہوں سے اوجھل ہوا ہے، مگر اس کے نور سے دلوں کی کائنات اب بھی روشن ہے۔ اور جب تک یہ ناظورہ عالم آباد ہے درویشی کی دنیا میں چاند تارے بن کر چمکنے والی ہستیاں اس سے برابر اکتساب نور کرتی رہیں گی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اولاد و احفاد

حضرت شیخ الاسلام کے دو حرم تھے۔ رشیدہ بانو اور بی بی شہر بانو۔ اول الذکر ام المریدین مخدوم عبدالرشید حقانیؒ کی چھوٹی بہن تھیں۔ ان کے بطنِ عفت سے شیخ صدر الدین عارف، شیخ علاؤ الدین محمد، شیخ شہاب الدین انور اور شیخ برہان الدین محمد تولد ہوئے۔۔۔ بی بی شہر بانو سے شیخ قدوۃ الدین محمد، شیخ شمس الدین محمد، اور شیخ ضیاء الدین پیدا ہوئے۔

شیخ ضیاء الدین اور شیخ برہان الدین کی اولاد نہیں ہوئی۔ باقی سارے صاحب اولاد تھے۔ رشیدہ بانو سے ایک صاحبزادی بھی تولد ہوئی تھی، اس معصومہ کا نکاح میر حسینیؒ سے ہوا۔

بی بی شہر بانو سے نور بی بی اور سلطان بی بی تولّد ہوئیں ۔ نور بانو مولانا فخر الدین عراقی کے حبالۂ نکاح میں آئیں ۔ اس بی بی سے سید کبیر الدین پیدا ہوئے اور ساس مصو کا حضرت شیخ الاسلام کی زندگی میں ہی انتقال ہو گیا ۔ دوسری صاحبزادی سلطان بی بی المعروف بی بی فاطمہ تھی ۔ اس کی شادی سلطان التارکین حمید الدین حاکم سے ہوئی جس سے خاندان جلیلہ کے مورث اعلیٰ شیخ نور الدین پیدا ہوئے ۔

مولانا جمالیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام نے صاحبزادوں کی تعلیم پر بڑے نامور اساتذہ مقرر کر رکھے تھے ۔ انہیں انعام و اکرام سے نوازا کرتے تھے ، اور جب حضرت گھر میں ہوتے ان بچوں کو خود بھی تعلیم دیتے رہتے ۔ حضرت شیخ الاسلام کی وفات کے وقت مخدوم صدر الدین عارفؒ چالیس برس کے ، اور آپ کے صاحبزادے شاہ رکن عالم بارہ برس کے صغیر سن بچے تھے ۔ اگرچہ ان کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام کے چھ اور صاحبزادے بھی تھے جن میں شیخ شمس الدین اور شیخ شہاب الدین کا علمی پایہ بہت بلند تھا ۔ اور شیخ علاء الدین تو طبّی دنیا کے بو علی سینا تھے ۔ پوتوں میں مولانا نور الدین ، مولانا عبد الغفار ، مولانا قطب الدین اور شیخ جلال الدین بھی علم و فضل اور زہد و ورع کے اعتبار سے خاص مقام رکھتے تھے ۔ بایں ہمہ الشیخ العارف صدر الدین محمد ہر اعتبار سے اپنے والد ماجد کی ساری اولاد میں ممتاز اور افضل تھے ۔ آپ کی شادی خانہ آبادی شاہ فرغانہ کی صاحبزادی بی بی راستی سے ہوئی تھی اور ۹ ، رمضان ۶۴۹ھ کو حضرت شاہ رکن عالمؒ اس عارفہ کے بطنِ عفت سے عالمِ وجود میں آئے ۔ رحمہم اللہ علیہم اجمعین

شیخ الاسلام کی تصنیفات

شیخ الاسلام کی تصنیفات کے سلسلے میں اتنا پتہ چل سکا ہے کہ آپ نے اپنے

شیخ طریقت حضرت شیخ الشیوخ کے اسلوب پر ایک کتاب "اوراد" سے متعلق لکھی تھی۔ جو حضرت کے کافی عرصہ بعد تک متداول بین الناس رہی۔ خاصکر آستانۂ قدس میں اس کا باقاعدہ ورد ہوتا تھا۔ گو اس کا نام اوراد ہے، لیکن حقیقتہً وہ اوراد و وظائف کی کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ صوفیانہ رنگ کی فقہی تصنیف ہے، جس میں نماز روزہ، طہارت توبہ اور اخلاص وغیرہ کے مسائل درج ہیں۔ چونکہ حضرت شیخ الاسلام کا مسلک تصوف شریعت سے ایک انچ بھر بھی ادھر اُدھر نہیں تھا۔ اس لئے ان کے اوراد بھی گویا مسائلِ شریعت میں انہماک کا دوسرا نام ہے۔ اور "اتباع شریعت" سے علیحدہ ہو کر کوئی چیز بھی ان کے ہاں "ورد" نہیں کہلا سکتی۔

ایک رسالہ "شروط اربعین" کے نام سے حضرت سے منسوب ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس میں چلّہ کشی کی ضرورت اور اس کے آداب پر بحث کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص صدق دل سے چالیس یوم ذکرِ الٰہی میں مصروف رہے اس کے قلب سے زبان کی طرف حکمت و دانائی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص خلوصِ دل اور خالی پیٹ سے چالیس دن عبادتِ الٰہی میں گزارے ہم اس پر علوم دینیہ کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ رسالہ کے آخر میں اعتکاف میں بیٹھنے کی ترغیب دی گئی ہے ؎

اے دل بیا بکوئے وفا خلوت گزیں ۔۔۔ در مسلک سالکاں برہ بے نشاں نشیں
تجرید شو ز ہر چہ ترا دیدہ در خواست ۔۔۔ وانگہ بحق نمائی تو لا جواہل دیں
تاہر کدورتیکہ بود باصفا شود ۔۔۔ از دست دیو نفس زہر جانِ نازنیں
پس نورِ حق مشاہدہ افتد ترا ببسر
مرأت روئے دوست شوی از سر یقیں

آپ کے قلمی نسخے

مشہور ہے کہ جب حضرت مخدوم لعل علیین قدس سرہٗ ملتان سے کروڑ منتقل ہوئے تھے، تو حضرت شیخ الاسلام کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا قرآن مجید ہمراہ لے گئے تھے۔ نیاز مند اس صحیفۂ صادق کی زیارت کے لئے کروڑ گیا۔ قرآن مجید کا یہ نسخہ حضرت مخدوم کے مزارِ پُرانوار کے سرھانے رکھا تھا۔ بندہ نے اس متحفہ کی زیارت کی۔ اور اسے شروع سے آخیر تک بغور دیکھا۔ رسم الخط تو چھٹی صدی ہجری کا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس میں حضرت کے دستخط یا کوئی ایسی تحریر نہ مل سکی جس سے اس دعوے کی توثیق ہوسکتی۔

اسی طرح "العزیز" بہاول پور کے شمارہ فروری ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں صاحبِ مضمون نے تحریر کیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام نے سید علی ہجویری کی مشہورِ عالم تصنیف "کشف المحجوب" کو بھی اپنے ہاتھ سے سپردِ قلم فرمایا تھا۔ یہ قیمتی نسخہ جیسا کہ صاحبِ مضمون نے تحریر کیا۔ پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب ایم اے مترجم عجائب الاسفار کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ خاکسار نے ان کے قریبی رشتہ داروں سے ہر چند دریافت کرنے کی کوشش کی، لیکن اس گنج شایگان کا پتہ نہیں چل سکا۔ حال ہی میں جناب احمد ربانی صاحب نے محکمہ اوقاف کی اعانت سے کشف المحجوب کا ایک فارسی نسخہ طبع کرایا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے ——— جس کی ڈھنڈیا پڑ رہی تھی۔ انہوں نے اس نسخے کا پہلے اور آخری صفحے کا عکس بھی دیا ہے، مگر اسے حضرت شیخ الاسلام سے منسوب کرنے میں چند اشکال حائل ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر تاریخ ارقام ۶۶۴ھ درج ہے، حالانکہ حضرت کا سنہ وصال بالاتفاق ۶۶۱ھ ہے۔ دوسرے یہ کہ دستخط کی عبارت بہاء الدین

زکریا" پر مشتمل ہے۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام کا نام صرف "زکریا" ہے۔ ابو محمد کنیت اور بہاء الدین لقب ہے۔ کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ اپنے قلم سے لقب نہیں لکھا کرتا۔ چہ جائیکہ حضرت شیخ الاسلام جیسی منکسر المزاج شخصیت اپنے نام سے پہلے اپنے لئے "بہاء الدین" لکھنا پسند کرتی۔ لہذا اس قلمی نسخے کا حضرت سے انتساب صحیح نہیں۔

اس دور کی دوسری ممتاز شخصیتیں

حضرت شیخ الاسلام کا زمانہ خیر الاعصار اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس دور میں ملتان روحانیت کا مرکز بن گیا تھا۔ چپے چپے پر اللہ والے ملتے تھے۔ اور تسبیح و تہلیل سے ملتان کے در و دیوار گونج اٹھے تھے۔ یہ تمام فقراء مشائخ حیاتِ سرمدی کی چادر تانے اس عظیم شہر کی خاکِ پاک میں محوِ خواب ہیں۔ ان کے حالات اور اسمائے گرامی کون بتائے۔ چند بزرگوں کا مختصر سا تذکرہ درجِ ذیل ہے:۔

پیر عبدالرشید کرمانیؒ آپ اپنے زمانہ کے فقید المثال عالم بھی تھے۔ اور بحرِ معرفت کے غوّاص بھی۔ ان کے علوئے مرتبت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے برسوں آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ تمام زندگی مسجد کٹرے والی میں درس تدریس میں بسر کی اور جب فوت ہوئے حسبِ وصیت مسجد کے جنوب میں دفن ہوئے۔

پیر دولت شاہؒ حضرت شیخ الاسلام کے زمانے میں دو نوجوان سید بھائی

تشریف لائے۔ دونوں حقیقی بھائی تھے اور دونوں کی آپس میں بڑی محبت تھی۔ بڑے کا نام دولت شاہ۔ چھوٹا چونکہ ہر وقت بڑے بھائی کی خدمت میں مصروف رہتا تھا۔ اس لئے خدمت گزار شاہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دونوں آسمانِ ولایت کے درخشاں ستارے تھے۔ عمر بھر خلقِ خدا کی ہدایت میں سرگرمِ عمل رہے، ہزاروں لوگوں نے آپ سے فیضان حاصل کیا۔ دونوں بھائی جس طرح زندگی میں ساتھ ساتھ رہے، ویسے مرنے کے بعد بھی پہلو بہ پہلو آسودۂ خاک ہوئے۔ خانقاہ کے قریب کا دروازہ آپ کی نسبت سے "دولت دروازہ" کہلاتا ہے۔

بانگا بلالؒ آپ حضرت شیخ الاسلام کی مسجد کے مؤذن تھے۔ آپ اگرچہ بہت بڑے عالم تھے اور مدرسہ بہائیہ میں درس بھی دیتے تھے۔ لیکن اذان سے آپ کو عشق تھا۔ اس لئے بانگا بلالؒ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ جس محلّے میں محوِ خواب ہیں وہ آپ کی نسبت سے "محلّہ بانگا بلبل" کہلاتا ہے۔ سرِ راہ ایک مرتفع چبوترے پر آپ کا مزار ہے۔

شاہ حسین آگاہی آپ مردِ کامل اور حضرت شیخ الاسلام کے مریدِ صادق تھے کہتے ہیں کہ جو شخص جس کام کے لئے حاضر ہوتا اُس کے نفع نقصان سے اُسے آگاہ کر دیتے تھے۔ اسی لئے حسین آگاہی مشہور ہوئے۔ ملتان کے جس بازار میں آپ کا مزار ہے وہ آپ سے موسوم ہے۔

پیر عمرؒ سہروردی آپ سندھ کے رہنے والے تھے۔ عین عنفوانِ شباب میں

ملتان تشریف لاکر حضرت شیخ الاسلام رح کے مرید ہوئے اور درجہ کمال حاصل کیا۔
ایک نواب صاحب کے تعلقات اپنی بیگم سے کشیدہ تھے، وہ حضور کی خدمت میں شکایت لائے۔ آپ کی دعا سے ان کے تعلقات بہتر ہو گئے۔ بیگم نے شکرانے کے طور پر اشرفیوں کا تھال لاکر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے ایک اشرفی اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ بیگم نے عرض کیا۔ حضور! یہ کھانے کی چیز نہیں۔ فرمایا، تو پھر لائی کیوں ہو؟

بیگم نے جب زیادہ اصرار کیا تو فرمایا کہ یہ اشرفیاں واپس لے جاؤ اور فقیر کو قبر کے لئے کچھ زمین دے دو۔ چنانچہ آپ کا گورستان اسی واقعے کی یادگار ہے۔

پیر ولّا درویش رح

آپ لاڑ قوم کے باکمال بزرگ تھے اور حضرت شیخ الاسلام کے خلیفہ تھے۔ آپ نے جس مسجد میں زندگی بھر تبلیغ کے فرائض انجام دیئے اسی کے متصل آپ کو دفن کیا گیا۔ غربی مزار آپ کا ہے۔ اور ماہ ہاڑ میں آپ کا عرس ہوتا ہے آپ کی مقبولیت کا اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورا محلہ آپ سے موسوم ہے اور ولّا چوک کہلاتا ہے۔

شاہ دانا شہید رح

آپ کا اصل نام شیخ سعدالدین بن نصیرالدین ہے۔ مرقع ملتان میں جو واقعہ آپ سے منسوب ہے وہ بے اصل ہے۔ صاحب تذکرۃ الملتان کی تحقیق یہ ہے کہ آپ قبیلہ برلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ اور حضرت شیخ الشیوخ کے خلیفہ تھے شہر بلخ میں پیدا ہوئے، اور قباچہ کے زمانہ میں ملتان تشریف لائے۔ جب چنگیزی افواج نے ملتان پر حملہ کیا تو شمشیر بدست ان کے مقابلے کو نکلے اور لڑتے

ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ ۷ رشعبان ۶۶۹ھ بروز پنجشنبہ کو پیش آیا۔

دہلی دروازہ کے اندر جس محلہ میں آپ دفن ہیں وہ آپ سے موسوم ہے۔ آپ کا مقبرہ شیخ سعدالدین شہیدؒ سے موسوم تھا۔ بعد میں سعدالدین شہیدؒ شادی شہیدؒ اور پھر شادنہ شہید بن گیا اور پڑھے لکھے لوگوں نے اسے شاہ دانا بنا دیا۔ ہمسایہ لوگ آپ کے روحانی تصرفات کے بے حد قائل ہیں اور یہ مقولہ آپ کے بارے میں ہی مشہور ہے

اندر غوث بہاء الحق باہر قطب فریدؒ
جے توں بہت ادتاولا منگ شادنہ شہید

خواجہ فخرالدین گیلانیؒ

مولانا حسام الدین روایت کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام کے ایک مرید خواجہ کمال الدین مسعود شیروانی بڑے مالدار سوداگر تھے۔ اور اکثر جواہرات کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کا جہاز عدن کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ہولناک طوفان آ گیا۔ جہاز کا مستول ٹوٹ گیا۔ پانی کی لہریں جہاز کے اوپر سے گزرنے لگیں۔ قریب تھا کہ جہاز ڈوب جائے۔ اس وقت خواجہ کمال الدین انتہائی عاجزی سے شیخ الاسلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ خدا کے حکم سے اُسی وقت حضرت شیخ الاسلام جہاز پر ظاہر ہوئے اور اہلِ جہاز کو نجات کی خوشخبری دے کر غائب ہو گئے۔ آناً فاناً ہوا بند ہو گئی۔ طوفان ختم گیا اور جہاز بندرگاہ عدن میں صحیح و سلامت آ پہنچا۔ تمام اہلِ جہاز یہ کرامت دیکھ کر متحیّر ہوئے۔ اور سوداگروں نے اپنا تہائی مال نہایت محبت اور اخلاص سے خواجہ کمال الدین کے سپرد کیا کہ ملتان میں حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچا دیں۔ خواجہ صاحب نے وہ مال لے کر اور نصف اپنا مال شامل کر کے اپنے بھانجے خواجہ فخرالدین گیلانی کی معرفت ملتان بھجوایا۔ یہ

نوجوان نہایت متورع اور دیانت دار شخص تھا۔ قطع مسافت کے بعد ملتان پہنچا۔ اس نے شیخ الاسلام کو پہلی بار تختہ جہاز پر دیکھا تھا۔ اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو حضرت کو اسی صورت اور لباس میں دیکھ کر زیادہ معتقد ہوا۔ اور تمام زر و جواہر جو کہ ستر لاکھ کی مالیت کے تھے۔ بطور نذر پیش کیے۔ حضرت شیخ الاسلام نے وہ تمام مال تین دنوں کے عرصے میں شہر کے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا۔ خواجہ فخر الدین شیخ الاسلام کی فیاضی سے اتنا متاثر ہوئے کہ اپنا تمام مال و اسباب شیخ کی نذر کر کے ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ اور تھوڑے سے عرصہ میں واصلانِ حق سے ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ انہیں حضرت کے بڑے صاحبزادے سلطان العارفین شیخ صدر الدین سے بڑی محبت تھی۔ اکثر وقت ان کی خدمت میں گزرتا تھا۔ اس کے بعد اجازت لے کر زیارت بیت اللہ کے ارادے سے ارضِ پاک کو روانہ ہوئے اور جدہ پہنچ کر رحمتِ حق سے واصل ہوئے۔ آپ کا مزار سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ مولانا جمالی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"چون (خواجہ فخر الدین) بمقام جدہ رسید۔ برحمتِ حق پیوست۔ الآن مقبرہ متبرکہ او در کنار دریا ہم در مقام فرخندہ جام جدہ است۔ و اغلب وقت اکثر مردم بداں خطیرہ مکرمہ توجہ دارند و نذر و شکرانہ مے آرند۔"

امام الاولیاء ، عمدۃ الاصفیاء

الشیخ العارف

صدر الدین محمدؒ

رحمتہ اللہ علیہ

ولادت	عمر شریف	رحلت
۶۲۱ھ	۸۸ سال	۲۳ ذی الحجہ ۷۰۹ھ

مزار شریف

قلعہ قدیم ملتان ، والد بزرگوار کے دائیں پہلو میں

الشیخ العارف صدرالدین محمد علیہ الرحمۃ اپنے والد ماجد کے بڑے بیٹے[1] تھے۔ شیخ الاسلام کے وصال کے بعد جونہی مسندِ ارشاد کے مالک بنے، اپنے حصے[2] کا تمام خزانہ ایک ہی دن میں فقراء اور مساکین میں لٹا دیا۔ اور اپنے لیے ایک درہم بھی نہ رکھا۔ کسی نے عرض کی کہ آپ کے والدِ بزرگوار کا خزانہ نقد و جنس سے معمور رہتا تھا۔ اور اس کو تھوڑا تھوڑا خرچ کرنا پسند کرتے تھے۔ آپ کو بھی اسی طرح کرنا چاہیے تھا۔ حضرت عارف ربّانی نے جواب دیا۔

"حضرت بابا دُنیا پر غالب تھے اس لیے دولت ان کے پاس جمع ہو جاتی تو انہیں علائق دُنیا کا کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا اور وہ دولت کو تھوڑا تھوڑا صرف فرماتے تھے اگرچہ میں بھی بالعموم دُنیا پر غالب رہتا ہوں اور کبھی برابر رہتا ہوں۔ نہ غالب نہ مغلوب اور نہیں چاہتا کہ کبھی غالب آ جائے اس لیے مُردار کو اپنے سے دُور ہٹا دیا ہے اور دل کو بے اطمینانی کے فتنہ سے بچا لیا ہے"[3]

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اس روایت پر ایک فقرے کا اور اضافہ کیا ہے کہ:۔

---

[1] آپ کا نام محمد تھا صدرالدین لقب۔ [2] حضرت شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا قدس سرہٗ کے سات بیٹے تھے۔ خزینۃ الاصفیاء کی روایت کے بموجب ہر صاحبزادے کو ستر لاکھ اشرفی نقد ماسوائے دیگر اسباب از قسم ظروف، پارچات و مکانات وغیرہ بموجب تقسیم شرعی اپنے حصے میں ملے تھے [3] سیر العارفین مولانا جمالیؒ

"آبا کے خزانہ کی حفاظت کے لئے میرے دُوسرے بھائی کافی ہیں۔ اگر ساتواں حصّہ نہیں رہتا تو نہ رہے۔"

تبلیغ اسلام، اصلاح اعمال اور تزکیہ نفس کے جو خطوط حضرت شیخ الاسلام قائم کر گئے تھے۔ حضرت عارفؒ باللہ نے انہیں اس عمدگی سے قائم رکھا کہ دُنیا عش عش کر اُٹھی اور ہر شخص کے دل پر آپ کی عظمت و جلالت کا سکّہ بیٹھ گیا۔

آپ کا دستر خوان اگرچہ آپ کو روزانہ ہزاروں کی فتوحات ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود آپ کا ہاتھ اتنا کشادہ تھا کہ آپ اکثر مقروض رہتے تھے۔ بایں ہمہ لنگر خانے کا انتظام اتنا اعلیٰ تھا کہ اگرچہ آپ کے ہاں علماء، مشائخ اور فقراء کی بڑی تعداد جمع رہتی تھی اور آپ ان سب کو شریک طعام کرتے تھے۔ اس کے باوجود آپ کا دستر خوان گوناگوں کھانوں کے سبب سلاطین کے سفرہ پر بھی سبقت لے گیا تھا۔ شیخ رکن الدین فردوسیؒ جو بجائے خود شیخ اکمل اور مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے دادا پیر تھے۔ ایک دفعہ خراسان سے دہلی جاتے ہوئے ملتان سے گزرے تو حضرت عارف باللہ کا نیاز حاصل کرنے کے لئے خانقاہِ غوثیہ پر بھی حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ کے ہاں علماء اور مشائخ کی بڑی تعداد جمع تھی۔ شیخ رکن الدین فردوسی فرماتے ہیں کہ جب کھانے کا وقت آیا تو دستر خوان پر قسم قسم کے ایسے پرتکلف طعام رکھے گئے کہ بادشاہوں کو کیا نصیب ہوں گے۔

خدام مرغن پلاؤ کا ایک بڑا خوان لے آئے۔ پھر ایک اور طبق صابونی حلوے کا اُٹھا لائے۔ میں نے دیکھا کہ طعام کافی اور وافی مقدار میں دستر خوان پر پھیلا پڑا ہے۔ اور تمام علماء مشائخ اور فقراء ادب سے بیٹھے حضرت شیخ العارف کا انتظار

کر رہے ہیں کہ وہ ہاتھ بڑھائیں تو یہ بھی کھانا شروع کریں۔
شیخ رکن الدین فرماتے ہیں کہ میں دوسرے درویشوں کے مقابلہ میں شیخ العارفؒ کے زیادہ قریب بیٹھا تھا۔ دفعتاً حضرت کی آواز بلند ہوئی۔ "بسم اللہ! درویشان خوش باشید" (بسم اللہ کیجئے، درویشو، خوش رہو!) میں نے اگرچہ ایام بیض کا روزہ رکھا ہوا تھا، مگر بحکم مَنْ اَكَلَ مَعَ الْمَغْفُوْرِ فَهُوَ مَغْفُوْرٌ۔ نہیں چاہتا تھا کہ اس سعادت سے محروم رہوں۔ چنانچہ بسم اللہ پڑھ کر شریک طعام ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ اگر افطار صوم محترم میزبان کی خاطر ہے تو اسی قدر کافی ہے۔ زیادہ کھانے کی کیا ضرورت ہے میں ہاتھ کھینچنے کو ہی تھا کہ حضرت عارف باللہ نے نورِ باطن سے میری ذہنی کشمکش کو معلوم کر لیا۔ فوراً میری طرف متوجہ ہوئے اور مسکرا کر فرمایا

"درویش رکن الدین! جو شخص حرارتِ باطن سے طعام کو ذرہ بنا کر حق تک پہنچا سکتا ہے اس کے لئے تقلیلِ غذا کی پابندی ضروری نہیں"

اگرچہ شیخ العارف خود کم غذا لیتے تھے، لیکن دستر خوان سے اس لئے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے کہ ان کو دیکھ کر کہیں مہمان ہاتھ نہ روک لیں اور کوئی بھوکا نہ رہ جائے[1]۔
حضرت عارفؒ باللہ نے والد ماجد کی خانقاہ کے شرف و مجد کو برابر قائم رکھا اور اکابر مشائخ و فقرا، جو اس آستان کی زینت تھے۔ یعنی سید السادات جلال بخاریؒ مولانا فخر الدین عراقی، میر حسینی، سلطان التارکین حمید الدین حاکم۔ خواجہ حسن افغان رحمہم اللہ علیہم، سب کے سب حضرت الشیخ العارف کے انیس و جلیس بنے رہے۔
دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ الشیخ العارف کی ہمہ گیر شخصیت کی جاذبیت نے انہیں ملتان سے جانے نہ دیا، اور اکابر اہل اللہ کی آمد کا سلسلہ بھی جوں کا توں قائم

[1] بزم صوفیہ

رہا۔ حضرت عارف باللہ کا یہ معمول انضباط اوقات بھی تقریباً وہی کچھ تھا جس پر حضرت شیخ الاسلام زندگی بھر عمل پیرا رہے۔ اوراد و اذکار کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔ بقول مخدوم جہانیاں حضرت الشیخ العارف ہر مبتدی اور منتہی کو بلا کسی امتیاز کے تعلیم دیتے تھے[1] عصر کے بعد بلاناغہ حضرت شیخ العارف اپنے والد ماجد کے منبر پر بیٹھ کر وعظ فرماتے تھے۔ جو اکثر قرآن مجید کے اسرار و معارف پر مشتمل ہوتا تھا۔

شیخ جمال خنداں روؒ

سیاحت کے دوران جب حضرت شیخ الاسلام اُچ سے گزر رہے تھے تو آپ نے ایک لڑکے کو دیکھا تھا جس کی پیشانی سے سعادت اور خوش بختی کے آثار نمایاں تھے۔ آپ نے اس کا نام اور حال دریافت فرمایا۔ لوگ جو اس وقت حاضر خدمت تھے لپک کر گئے اور اس بخت بیدار بچے کو پکڑ کر لے آئے۔ شیخ الاسلام نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے حق میں دعا فرمائی۔ سالہا سال کے بعد جب حضرت کا سفر آخرت قریب آیا تو حضور نے اپنے فرزند جگر بند الشیخ الامام العارف حضرت صدرالدین محمد کو طلب کر کے فرمایا کہ

> "بابا صدرالدین! میرے بعد جمال نام ایک شخص تیرے پاس آئے گا اور ہمارے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی خواہش کرے گا۔ اُسے مرید کر لینا اور ہمارے خرقہ شیخ الشیوخ شہاب الملت والدین قدس سرہٗ کہ یہ تیرا حصہ ہے، باقی تبرکات جو لباس پر مشتمل ہیں نصف ان کا اسے دے دینا اور رکھنا نصف کی وصیت[2]"

[1] الدرالمنظوم فی ترجمہ ملفوظ المخدوم ص ۲۸۔ [2] سیر العارفین

والدِ بزرگوار کی یہ وصیت ہر وقت شیخ العارف کے ذہن و دماغ پر مستولی رہی کہ "وقتے جمال نام شخصے خواہد آمد و بشما پیوند خواہد کرد"۔ کئی سال انتظار میں کٹ گئے۔ انجام کار ایک دن اطلاع ملی کہ اُچ سے مولانا جمال الدین بغرض بیعت حاضر ہوئے ہیں۔ آپ بڑے خوش ہوئے اور خدّام کو حکم دیا کہ انہیں ایک حجرہ دے دو تاکہ یکسوئی سے قرآن مجید کی تلاوت کر سکیں۔ تین دن کے بعد حضرت اُن کے حجرے میں تشریف لے گئے اور انہیں اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کر کے وہ تمام تبرکات اور نعمتیں عطا کیں، جن کا حضرت شیخ الاسلام حکم دے گئے تھے۔

الغرض شیخ جمال خندان رُو ظاہری اور باطنی نعمتوں سے مالا مال ہو کر بحکم شیخ طریقت اُچ واپس تشریف لے گئے اور وہاں ایک عظیم الشان مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ جس کے حضرت خود ہی شیخ المدرس تھے۔ مخدوم جہانیاںؒ نے ابتدائی تعلیم آپ سے ہی حاصل کی تھی۔ شیخ جمالؒ ۲۵ محرم ۷۳۷ھ کو فوت ہوئے۔ آپ کی خانقاہ اُچ میں مرجعِ خلائق ہے۔

خواجہ احمد معشوقؒ صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں کہ شیخ احمد نام ایک سوداگر قندھار میں رہتا تھا۔ بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ اُسے شراب کی اتنی لت پڑ چکی تھی کہ بے پئے ایک لحظہ زندگی بسر کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اتفاق سے شیخ احمد اپنا اسباب تجارت ملتان لے آیا اور بازار کے وسط میں ایک شاندار دکان کرایہ پر لے کر کاروبار شروع کیا۔ کام خوب چل نکلا۔ شہر میں اس کی بڑی شہرت ہو گئی۔ خوب کمایا اور خوب کھایا۔ اس کی مے خواری کا ذکر کسی نے حضرت شیخ العارفؒ سے بھی کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ جب میں بازار سے گزروں، مجھے وہ نوجوان دکھانا بہرحال

میرے شہر میں وہ پردیسی ہے۔ اس لئے اُلجھنا اور بگڑنا بھی تو مناسب نہیں!
بات رفت گزشت ہو گئی۔ ایک دن اتفاق سے حضرت بازار سے گزر رہے تھے
جب اس کی دُکان سے گزرے تو غلام نے عرض کیا۔ حضور! یہی وہ سوداگر ہے، جس
کی مے خواری کا چرچا آپ تک پہنچا تھا۔ شیخ نے مڑ کر دیکھا تو ایک رنگیلا سجیلا نوجوان
مسند پر بیٹھا نظر آیا۔ اس کی جبین سے سعادت کے آثار ظاہر تھے۔ آپ نے خادم سے
فرمایا۔ جس طرح بھی ممکن ہو اس نوجوان کو میرے پاس لے آ!
حضرت قبلہ گاہ کی زیارت سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ خادم نے شیخ احمدؒ کو
لاکر پیش کیا۔ حضرت اُسے اپنے ہمراہ حجرے میں لے آئے، گرمی کا موسم تھا، خدام
نے شربت کا پیالہ پیش کیا۔ آپ نے اس میں سے ایک دو گھونٹ نوش فرمائے، اور
پھر وہ پیالہ شیخ احمد کی طرف بڑھایا اور فرمایا "بنوش!"
اس کے پیتے ہی نوجوان کا باطن انوارِ الٰہی سے جگمگا اُٹھا۔ غفلت و مدہوشی
سے آنکھیں کھُل گئیں۔ شیخ کے سراپا پر نظر ڈالی تو کچھ اور ہی کیفیت نظر آئی۔ وہاں
شیخ عارفؒ کہاں تھے، معرفتِ الٰہی کا ایک نُور تھا، جو زمین سے اُٹھ اُٹھ کر آسمان
سے باتیں کر رہا تھا۔ شیخ احمد وحدت کے نشے سے مخمور ہو کر شیخ کے قدموں پر گرے
اور بیعت کی التماس کی۔ حضرت نے اُسے اُٹھا کر گلے سے لگایا اور سہروردیہ طریقہ
کے مطابق اپنے حلقہ بیعت میں شامل کر لیا۔ شیخ احمد خانقاہِ غوثیہ سے واپس روانہ
ہُوا، مگر اِس حال میں کہ آنکھیں پُرآب تھیں۔ اور نظریں اوپر کو نہ اُٹھتی تھیں۔ بازار
سے گزرے دُکان پر پہنچے۔ یہاں تمام احباب جمع تھے۔ انہوں نے ہاتھوں ہاتھ
لیا۔ قسم قسم کے چٹکلے چھیڑے۔ گدگدیاں نکالیں، شرابِ ناب کا پیالہ پیش کیا، مگر یہاں
تو کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ شیخ احمد نے تحیّر انگیز نظر سے اس مجمعے کو دیکھا اور فرمایا۔

"دوستو! معاف کرنا۔ میں اب ایسی شراب پی کر آرہا ہوں جس کا ایک گھونٹ ہمیشہ کے لئے مست بنا دیتا ہے۔ اگر تم بھی ایسے کیف و سرور سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو حضرت شیخ العارف کے قدموں کی خاکِ پاک کو سرمۂ بصیرت بناؤ۔ اس میخانہ سے کوئی رندِ بادۂ الست شاکی نہیں۔ جب مجھ سے غریب الوطن پر یہ عنایت ہوئی ہے تو تم جو اس ذاتِ مقدس کے ہم وطن ہو کیسے محروم رہ سکتے ہو؟"

مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ شیخ احمد اسی وقت دکان کا تمام سامان گاڑیوں پر لاد کر خانقاہِ معلّٰی پر لے آیا اور فقراء و مساکین میں بانٹ۔ اس طریق سے تجرید اور تفرید کی زندگی شروع کی کہ سات سال صرف ایک تہمد میں گزار دیئے۔ جس مستِ شباب کی بہر پہر کے بعد پوشاک بدلتی تھی۔ اب اس تنِ نازنین پر صرف ایک پھٹی پرانی چادر رہ گئی تھی۔ سات سردیاں اور گرمیاں اسی ایک تہمد میں گزر گئیں۔

حضرت محبوبِ الٰہیؒ دہلوی فرماتے ہیں کہ شیخ احمد پر ہر وقت جذبہ و سکر کا عالم طاری رہتا تھا۔ ایک دفعہ کڑا کے کی سردیاں میں جبکہ پانی جم کر یخ ہو رہا تھا آپ غسل کے لئے دریا پر آئے اور کافی دیر تک پانی میں کھڑے رہے۔ بارگاہِ الٰہی میں عرض کی۔

"اے پروردگارِ عالم! تو بادشاہ ہے اور اپنے بندوں کی طاعت سے قطعاً بے نیاز ہے۔ محض اپنی عنایتِ بے غایت سے بے بضاعت بندوں کو سرفراز کرتا ہے میں اس محبت کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں جو اس ذرّہ بے مقدار کو تیری ذاتِ بے ہمتا سے ہے کہ جب تک یہ معلوم نہ کرلوں کہ تیری بارگاہ میں کتنا قرب اور مرتبہ حاصل ہے۔ اس دریا سے باہر قدم نہیں رکھوں گا۔"

ندا آئی کہ :-

"تیرا مرتبہ ہماری درگاہ میں اتنا ہے کہ قیامت کے دن ایک بڑی مخلوق جو گناہوں سے آلودہ ہوگی تیری سفارش سے آتشِ دوزخ سے نکال کر بہشتِ بریں میں داخل کروں گا۔"
شیخ احمد مچل گئے اور بولے :-
"اے پروردگار! تیری رحمت کا کوئی شمار نہیں اور تیری نعمتوں کا کوئی حساب نہیں، میں اس پر اکتفا نہیں کروں گا!"
جواب ملا :-
"اے شیخ احمد! تمام طالبانِ حقیقی نے اپنے آپ کو میرا عاشق بنایا ہے۔ لیکن میں تجھے سرفراز کرتا ہوں اور اپنا معشوق بناتا ہوں۔"
شیخ احمد نے جب یہ مژدۂ فرحت اثر سُنا تو فوراً دریا سے باہر نکل آئے۔ اپنا لباس پہنا اور پیر و مرشد کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں جہاں سے گزرتے لوگوں کی زبانی یہ آواز سُنائی دیتی کہ شیخ احمد معشوق تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کا مزار شیخ الاسلام کے مقبرے میں واقع ہے۔

شیخ فضل اللہ بن محمد ملتانی رح

مولانا عبدالحی اپنی مشہور کتاب "نزہۃ الخواطر" میں لکھتے ہیں کہ الشیخ الفقیہ الزاہد فضل بن محمد علم و معرفت میں ممتاز اور اپنے والد شیخ صدر الدین محمد عارف رح کے مرید تھے۔ اور ان سے شیخ شمس الدین مصری محدث نے استفادہ کیا تھا۔ ان کا فضل و کمال تسلیم، مگر حضرت عارف باللہ سے نسبتِ فرزندی صحیح نہیں۔

برسرِ بازار ایک احاطہ کے اندر آپ محوِ خواب ہیں۔ آپ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کے مشہور مدرسہ کے معلّم اور حضرت قطب الاقطاب شاہ رُکن عالم اور سلطان محمد تغلق کے اُستاد تھے۔ ایک عالمِ دین کے لئے اس سے بڑا شرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ دین و دُنیا کے شہنشاہوں کا اتالیق رہا ہو!

مولانا علاء الدین محبوب اللہ رح مولانا علاء الدین رح اپنے دَور کے بہت بڑے عالم تھے۔ دُنیا ان کے فضل و کمال کی معترف تھی۔ بہترین خطیب، خوش الحان قاری اور مسلّم محدّث اور مفتی تھے۔ ملتان آکر حضرت شیخ العارف رح کے مرید ہوئے حضرت نے بڑی شفقت فرمائی اور اپنے حجرہ کے قریب رہنے کو جگہ دی اور اس محبّت سے تربیت فرمائی کہ مولانا تھوڑے عرصہ میں ہی درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ پیر و مرشد کی یہ اُلفت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت محلسرائے سے باہر آتے تو مولانا کی طلبی ہوتی۔ گھڑی دو گھڑی آرام کے لئے حرم میں جانے لگتے تو مولانا کے کندھے پر ہاتھ رکھے مہمان خانہ اور حجرہ نشین درویشوں کی بابت ہدایات دیتے چلے جاتے، گویا پہلی اور آخری ملاقات مولانا سے ہی ہوتی تھی۔ یہی کیفیت مولانا کی تھی کہ سارا دن شیخ پر سے تصدّق ہوتے رہتے۔ حضرت محلسرائے میں جاتے تو یہ بے چینی سے ڈیوڑھی شریف سے حجرہ مبارک تک آمد و شد کرتے رہتے۔ شیخ برآمد ہوتے تو اس طرح لپک کر قدموں میں گرتے جیسے مدّت سے بچھڑے ہوئے ہوں۔ اس اضطراب اور کثرتِ کار کے باوجود مولانا کی زبان ہر وقت مصروفِ تلاوت رہتی۔ کلام پاک کا ایک ختم دن کو اور ایک رات کو بالالتزام کیا کرتے اور یہی زندگی تک معمول رہا۔ اتنے مرتبہ کے باوجود مولانا کی تشنگی جوں کی توں قائم تھی۔ اور حضرت کو بھی ان کی سچی تڑپ کا شدید احساس تھا۔

ایک رات کڑاکے کی سردی میں حضرت تہجد کے لئے باہر نکلے تو کوئی درویش گٹھری سا بنا قدموں میں آگرا۔ آپ نے پہچانا تو وہ مولانا علاء الدینؒ تھے۔ سردی سے ان کا بدن کپکپا رہا تھا اور اعضا سُن ہو چکے تھے آپ نے اُنہیں اُٹھا کر گلے سے لگایا اور فرمایا
"مولانا! محبوب اللہ شدہ؟ دیگر چہ مے خواہی؟"
یعنی تم خدا کے محبوب تو بن چکے ہو اور کیا چاہتے ہو؟ مولانا تو شاید اسی مژدہ کے منتظر تھے۔ شیخ سے یہ بہت بڑا اعزاز پاکر بے خود سے ہو گئے اور وفورِ مسرت سے رقص کرنے لگے۔ صبح کو ہر طرف اس امر کا چرچا ہو گیا اور جو بھی ملتا۔ مولانا کو "محبوب اللہ" کہہ کر خطاب کرتا۔
حضرت شیخ العارف بالعموم عصر کے بعد وعظ فرمایا کرتے تھے، اور جب کبھی طبیعت حاضر نہ ہوتی مولانا کو وعظ کرنے کا حکم دیتے۔ لیکن منبر پر وہ کیسے چڑھتے۔ ہاں اسے بوسہ دے کر سہ پہلو میں کھڑے ہو جاتے اور ایسی درد انگیز تقریر کرتے کہ حاضرین کی روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتیں! تقریباً چودہ سال اس نہج پر مولانا نے بسر کر دیئے اور جب شیخ کا وصال ہو گیا۔ تو حضرت قطب الاقطاب کی غلامی میں اوقات بسری اختیار کی اور جب وہ بھی پردہ فرما گئے تو پھر مخدوم بھائیاں قدس سرہ سے نیاز مندی کا رشتہ جوڑا اور ۷۶۶ھ میں رفیقِ اعلیٰ کو لبیک کہتے ہوئے دارِ فانی سے عالمِ باقی کو کوچ کیا۔ رحمۃ اللہ علیہ

شیخ صلاح الدین درویشؒ ایک اور بزرگ شیخ صلاح الدین درویشؒ حضرت عارف باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اپنی سیف زبانی کے سبب صوفیاء میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ آپ نے اُسے مرید کیا اور فرمایا۔ اگرچہ یہ دکان صوفیاء کے لئے قطعاً ناساز گار ہے اور اعلائے کلمۃ الحق میں خطرات بہت ہیں، تاہم ہمارے مشائخ اس میدان میں پیش پیش رہے ہیں آج کل دار السلطنت دہلی کو تم جیسے مجاہدین کی سخت ضرورت ہے۔ جاؤ ذو الفقارِ حسلی کی

طرح اپنی زبان کو ہر وقت بے نیام رکھو خدائے حیّ و قیّوم کے سوا کسی سے مت ڈرو۔ انشاء اللہ تم ہر مصیبت سے محفوظ رہوگے۔ خادم کو اشارہ کیا وہ توشہ خانہ سے خرقہ لے آیا۔ آپ نے شیخ صلاح الدین کو کھڑا کرکے اپنے دستِ خاص سے خرقہ مبارک پہنایا اور بغل گیر ہوکر رخصت کیا۔ آپ ۷۱۱ھ میں فوت ہوکر حضرت چراغ دہلویؒ کے قریب دفن ہوئے۔

شیخ حسام الدّین بدایونیؒ

مولانا حسام الدین حضرت عارف باللہ کے جلیل القدر خلیفہ تھے اور سالہا سال حضرت کی صحبت میں بسر کر چکے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اپنے مرشد کے ہمراہ شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے روضۂ اطہر کی زیارت کو گیا حضرت عارف باللہؒ جب زیارت سے فارغ ہوکر باہر تشریف لائے، میرے دل میں خیال گزرا کہ اگر ایک ٹکڑا زمین کا اپنی قبر کے لئے مانگ لوں تو کیا عجب ہے کہ شیخ کبیر کی ہمسائیگی کے طفیل مجھے عذاب دوزخ سے نجات مل جائے۔ بمجرد اس خیال کے گزرنے کے شیخ المشائخ صدر الملۃ والدین نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر فرمایا

"مولانا حسام الدین! زمین برائے مزارِ شما دریغ نیست، اما رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم زمینے پاک برائے مزار شما در خطۂ بدایوں اشارت فرمودہ است، البتہ خاک شما در آنجا آسودہ خواہد شد۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ کا بیان ہے کہ جب مولانا حسام الدین بدایوں تشریف لے گئے تو ایک رات خواب میں انہوں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ایک جگہ بیٹھے وضو فرما رہے ہیں۔ صبح کو اس مقام پر گئے تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ زمین وضو کے پانی سے بھیگی ہوئی ہے۔ اور وضو کا نشان ظاہر ہے۔ مولانا نے وصیت کی کہ مجھے اسی مقام پر دفن کیا جائے۔ چنانچہ بعد وفات وہاں دفن کئے گئے۔

سراج السالکین، منہاج العارفین

حضرت میر شمس الدین ولی سبزواری

رحمتہ اللہ علیہ

ولادت
۱۵ شعبان ۵۶۰ھ

رحلت
۶۷۵ھ

مزار شریف
ملتان

حضرت شاہ شمس ساتویں صدی کے بہت بڑے مبلغ اسلام ہیں۔ آپ ۶۶۶ھ میں ملتان تشریف لائے۔ اور دادی پار جہاں اب ان کا مقبرہ ہے قیام فرمایا حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ کی تاریخ وفات ۶۶۱ھ ہے۔ بنابریں حضرت شاہ شمس رح کو حضرت شیخ الاسلام کا معاصر سمجھنا صحیح نہیں، اس کے ساتھ ہی وہ تمام روایات اور حکایات جو عوام نے ان بزرگوں کے بارے میں مشہور کر رکھی ہیں، بے اصل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

مولانا سید ابوظفر ندوی تاریخ سندھ میں لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ شمس فرقہ نزاریہ کے داعی تھے، اور اسی فرقے کی معتقدات کی اشاعت کے لئے ملتان تشریف لائے تھے۔ لیکن ہمیں ان کے حالات میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے ہم انہیں اس تہمت سے متہم کر سکیں۔

حضرت شاہ شمس بھی سید جلال بخاری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح، حضرت شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رح کے آباء کرام کی طرح مغلوں کے حملوں سے متاثر ہو کر وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ خدائے ذوالجلال نے پاک و ہند میں ان سے اشاعت اسلام کا کام لینا تھا یہ حملے بہانہ بن گئے۔

۶۶۳ھ میں ہلاکو خاں کے مرنے پر اباقاخان تخت نشین ہوا۔ جو ۶۸۱ھ تک

حکمران رہا۔ اس کے عہد میں ہی شاہ شمس ؒ نے سبزوار سے ہجرت فرمائی۔

شاہ شمس ؒ نام کے تین بزرگ گزرے ہیں۔ ایک مولانا روم ؒ کے مرشد ہیں۔ ان کی شہادت ۶۴۵ھ میں واقع ہوئی۔ دوسرے شاہ شمس ؒ سبزواری ہیں۔ جن کا اس کتاب میں ذکر ہو رہا ہے۔ تیسرے شاہ شمس عراقی ہیں جو ۹۳۲ھ میں کشمیر میں فوت ہوئے۔ بعض تذکرہ نگاروں سے شاہ شمس ؒ کے حالات جمع کرنے میں بڑی غلطی ہوئی ہے اور انہوں نے تینوں بزرگوں کے حالات کو گڈمڈ کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ حضرات جن کی معلومات سطحی ہیں بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ شاہ شمس ؒ تبریزی اور شاہ شمس ؒ عراقی سے بھی یہی بزرگوار مراد ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ شاہ شمس ؒ عراقی کا مزار کشمیر میں ہے اور شاہ شمس ؒ تبریزی قونیہ میں دفن ہیں۔ حضرت شاہ شمس ؒ کی تاریخ ولادت ۵۶۰ھ بتائی جاتی ہے۔ جو صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر اسے درست تسلیم کر لیں تو حضرت ملتان میں ۱۰۶ برس کی عمر میں تشریف لے آئے ہوں گے اور یہ سیر و سیاحت کی عمر نہیں ہے۔

شاہ شمس ؒ ایسے زمانے میں ملتان تشریف لائے جبکہ قرامطی فرقہ کے جراثیم ختم ہو چکے تھے۔ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ فرقہ اہلسنت والجماعت کے امام تھے۔ ان کے فیوض و برکات سے اس فرقے کو بڑا فروغ ہوا۔ اور دوسرے تمام فرقوں کے لوگ اس میں مدغم ہو گئے۔ اس دور میں سیدا لسادات جلال بخاری ؒ، مولانا عراقی ؒ، میر حسینی ؒ، سلطان التارکین حمید الدین حاکم ؒ، مولانا علاء الدین ؒ اور شاہ یوسف گردیز ؒ کے صاحب سجادہ موجود تھے جو اپنی اپنی جگہ پر دین اسلام کے بڑے ستون خیال کئے جاتے تھے۔ شیخ الاسلام کی خانقاہ ہیبط انوار بنی ہوئی تھی۔ بیسیوں علماء ملک ہند کے مدرسہ میں درس دے رہے تھے۔ مدرسہ ناصریہ بھی بڑی

بہار پر تھا۔ ملتان کا گورنر ملک شیر خاں بلبن دینی امور میں سخت متشدد تھا۔ ایسے حالات میں کسی کو نزاریہ فرقہ یا قرمطی معتقدات کی ترویج و اشاعت کی جرأت کیسے ہو سکتی تھی۔ شیعہ مذہب ایک دور میں ملتان کا سرکاری مذہب بھی رہ چکا ہے، مگر سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور ناصر الدین قباچہ نے اہلسنّت والجماعت فرقہ کی حوصلہ افزائی کی۔ علماء اور مشائخ خواہ سہروردی تھے یا چشتی سب کے سب سُنّی مسلمان تھے۔ اس لئے کئی صدیوں تک دوسرے تمام فرقے سوادِ اعظم کے آگے ابھر نہ سکے۔ یہ کیفیت صرف ملتان کی نہیں، بلکہ کابل سے بنگال اور کشمیر سے دکن تک ہر جگہ مذہب اہلسنّت والجماعت ہی رائج تھا۔ اگر شاہ شمسؒ کا کوئی اور مذہب ہوتا تو وہ ملتان میں اہل و عیال کے لئے آشیانہ بنانے کی سعی نہ فرماتے اور واپس لوٹ جاتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہ صرف یہاں آباد ہوئے بلکہ اہلسنّت والجماعت مشائخ کے ساتھ گھُل مل گئے۔ چنانچہ شیخ رکن الدینؒ کو "رُکن الدین والعالم" کا لقب آپ ہی نے عنایت فرمایا تھا جو بعد میں کثرتِ استعمال سے "شاہ رُکنِ عالم" ہو گیا۔ ملتان میں شیعہ مذہب کا دوبارہ احیاء لنگاہوں کے آخری دور میں ہوا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ شاہ محمود لنگاہ کے زمانے میں میر عماد گردیزی مع اپنے دو لڑکوں میر شہید اور میر شہداد کے ایران کی طرف سے آیا۔ اور جس شخص نے سب سے پہلے ملتان میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی۔ وہ یہی میر شہداد تھا۔ اس کے بعد بیرم خان خاناں مرزا غیاث، اور علی قلی خاں اور ان جیسے کئی اور اکابر امراء ایران سے آئے۔ جو مذہباً شیعہ تھے۔ اس سے شیعہ مذہب کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ حضرت شاہ شمسؒ کے مقبرہ کی مسجد میں خلفائے راشدین کے نام کی روغنی تختیاں محراب کے اوپر پیوست ہیں۔ یہ لنگاہوں کے دور سے قبل کی معلوم ہوتی ہیں۔ دیگر

آپ نے جن قبائل کو مسلمان کیا ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر سُنّی ہیں۔ بالخصوص گریجے وغیرہ۔ ان حقائق سے حضرت شاہ شمسؒ کے معتقدات پر روشنی پڑتی ہے۔ بندہ نے خود دربار شریف پر جا کر ان تختیوں کا برا ر العین مشاہدہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ کسی زمانے میں اس خانقاہ اور مسجد پر سُنّی مسلمانوں کا قبضہ رہا ہے۔ پھر حیرت یہ ہے کہ شیعہ متولیوں نے بھی اپنے زمانۂ اقتدار میں ان تختیوں کو اکھڑوانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صاحب تذکرۃ الملتان شاہ شمسؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپ ملتان کے اولیائے کبار میں سے ہیں۔ آپ بڑے عابد، زاہد اور عارف کامل تھے۔ چونکہ حضرت شاہ شمسؒ سیدنا اسمٰعیل بن امام جعفر صادق کی اولاد میں سے تھے اس لئے تمام اسمٰعیلی آپ سے ارادت رکھتے ہیں۔

سیّد ناظر حسین صاحب شمسی سبزواری کا ایک مضمون "آفاق" لاہور میں قسط وار چھپتا رہا ہے۔ جس میں انہوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر مسلمان ہونے والے بے شمار قبائل کی فہرست دی ہے جس پر ایک نظر ڈال لینے سے بلا پس و پیش تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ اس برصغیر میں محض اشاعت اسلام کے لئے تشریف لائے تھے اور اس مقصد میں آپ کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ چند قبائل کی فہرست، درج ذیل ہے:۔

<u>کھتری قبائل</u>

سندل۔ سیٹی۔ کپور۔ کیلن۔ آپرتی۔ چھتر۔ تھاپر۔ ترسے۔ پوری۔ اپل وغیرہ

<u>اڑوڑہ قبائل</u>

جاوے، چاولے، چاولمنے، ڈھینگرے، ڈگریجے، پپ، نیچے، دہیڑ

سمیال، لگڑتے، بینال، کھرانے، کوتے۔ ٹنڈے، پسیچے، ہپنا ہے، ٹھیکرے
مونسے، گھملاٹی، کھرینے، من چنڑے، گوڑواڑے، دھیمے، گھمیر، جھوکرے،
مونگے، پوّے، راٹھیے، ببّر، سدھانے، اسیروال، بھانبڑا، لاڑو، ککّنے،
گرت بجے وغیرہ

زرگر قبائل

چوہان، مسال، سونگ، ڈھکے، اولے رائے، چیڑے، سلوانی، لگہ
خلایت، کنڈے، نچل، منن، لودھر، جنووے، سوبھے وغیرہ

اقوام چنگڑ

سیّد ناظر حسین صاحب[1] کا بیان ہے کہ چنگڑ قوم پنجاب میں سات لاکھ کے قریب
آباد ہے، اور یہ پوری قوم حضرت شاہ شمسؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی ہے۔ چنگڑ
قوم کے چند قبائل یہ ہیں :۔

سردے، کاہلے، لتیال، بھٹی، گلچرے، کلوسنے، جولی بھلر، للیاں وغیرہ
ان بے شمار قبائل کو کفر کی ظلمت سے نکال کر سبیل الرشاد پر چلانے والے
عظیم انسان کو ہم سلام کرتے ہیں اور ان کی ذات پر بغیر کسی ثبوت کے ہم کسی قسم
کی تہمت چسپاں کرنے سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔

حالات زندگی

حضرت میر شمس الدین ۱۵ شعبان ۵۶۰ھ کو بمقام سبزوار پیدا ہوئے۔ والد
سیّد صلاح الدین محمد نور بخش اور والدہ ماجدہ سیّدہ فاطمہؒ بنت سیّد عبدالہادی کی صاحبزادی

---

[1] آفاق لاہور، اشاعت ۲۳ فروری ۱۹۵۹ء

تھیں۔ شاہ شمس کو قدرتِ کاملہ نے فہم و ذکا کا مادہ بڑی فیاضی سے عطا کیا تھا اس لئے آپ نے تھوڑے سے عرصہ میں ہی اپنے عمّ محترم سید عبد الہادی سے جملہ علوم ظاہری، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، حکمت اور الٰہیات حاصل کر لئے۔ فیضانِ معرفت اپنے والد سے حاصل کیا۔ ۵۷۹ھ میں آپ بحالتِ تجرید بدخشاں تشریف لے گئے اور اس جانب ہزارہا گم گشتگانِ بادیہ ضلالت کو صراط المستقیم پر گامزن کیا۔ ۵۸۵ھ میں واپس سبزوار مراجعت فرما ہوئے اور آپ کے والد بزرگوار نے آپ کے عمّ محترم سید جلال الدین کی صاحبزادی سیدہ حافظہ جمالؒ سے آپ کی شادی کر دی۔ ۵۸۸ھ میں آپ کے مشکوے معلّٰی میں سید نصیر الدین احمد اور ۵۹۰ھ میں سید علاء الدین احمد پیدا ہوئے۔ جب دونوں صاحبزادے علومِ متداولہ حاصل کر چکے تو آپ نے سید نصیر الدین احمد کی شادی سیدہ مطلع انوار بنت شاہ عبد الحسین سے اور سید علاء الدین احمد کی سید عبد الہادی شاہ کی صاحبزادی سیدہ نور الانوار سے کر دی۔ ۶۶۴ھ میں آپ کے والد ماجد رحلت فرما گئے۔ اور سبزوار منگولوں کے تاڑ توڑ حملوں کی لپیٹ میں آگیا۔ اس لئے آپ کو اہل و عیال کے لئے نئے آشیانے کی فکر ہوئی۔ چنانچہ سید عبد الہادی اور شہزادہ محمد نکودار کی معیت میں ارضِ پاک کو روانہ ہوئے۔ شاکر بہادری صاحبؒ[1] کی تحقیق کے بموجب ۶۶۵ھ میں اوچ اور ۶۶۶ھ میں ملتان وارد ہوئے۔ آپ نے اس شہر کو سکونت کے لئے پسند کیا۔ اور سید عبد الہادی کو واپس روانہ کیا۔ تاکہ آپ کے اہل و عیال کو بھیج دے، انہوں نے سبزوار پہنچ کر آپ کے دونوں صاحبزادوں اور اہل و عیال کو ملتان روانہ کیا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سلطان احمد نکودار نے حضرت شاہ شمسؒ

---

[1] آفاق لاہور ۲۳/ ۲/ ۱۹۵۹ء

کے اہل زبیلستان کی حفاظت کے لئے فوج کا ایک دستہ ساتھ کر دیا تھا۔ سلطان احمد نکودار کا سن تخت نشینی ۶۸۱ھ ہے۔ یہ زمانہ اس کی شاہزادگی کا ہے۔ جھنگ میں ایک مقام نکودر ہے۔ ریلوے اسٹیشن کا نام بھی یہی ہے۔ اس سے نکودری محافظ دستے کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت شاہ شمسؒ کو تقریباً دس سال کا عرصہ اس ملک میں اسلام پھیلانے کے لئے ملا تھا۔ آپ اکثر سفر میں رہتے تھے۔ زبان میں اس قدر شیرینی اور نگاہوں میں کوئی ایسی جاذبیت تھی کہ جس کسی کو اسلام کی دعوت دیتے اس میں انکار کی طاقت نہ رہتی اور وہ بے اختیار اسلام کی آغوش میں آ پڑتا۔

وفات

حضرت شاہ شمس علیہ الرحمۃ نے ۶۷۵ھ[1] میں عالم فانی سے عالم باقی کو انتقال فرمایا۔ آپ کو اسی حجرے میں دفن کیا گیا جس میں آپ مصروف عبادت رہتے تھے۔ آپ کے مزار پُرانوار پر آپ کے فرزند ارجمند سید علاء الدین احمد شکر یار اور پڑپوتے حاجی صدر الدین اور شہزادہ محمد نکودار نے خشت و آہک کا ایک سفید گنبد تعمیر کرایا جو ۱۱۲۸ھ میں بالکل شکستہ ہو گیا تھا۔ اس لئے سیٹھ مہر علی نے کثیر رقم خرچ کر کے یہ شاندار مقبرہ دوبارہ تعمیر کرایا جو ملتانی فن ہندسہ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ رحیم خان باغ سے شمال کی جانب دو فرلانگ کے فاصلے سے سبز و نگینہ رنگ کا حسین و جمیل مقبرہ نظر آتا ہے جو قطع عمارت، تقسیم منازل، تفاصیل تناسب اور اجزاء کی باہمی مشابہت سے ایک ایسا تعجب خیز اور حیرت انگیز تعمیری شعور پیدا کرتا ہے کہ انسانی نگاہیں جم کر رہ جاتی ہیں۔ جوں جوں زائر قریب پہنچتا جاتا ہے توں توں مقبرے کی رعنائی و دلکشی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان اندر جا کر ۳۵×۳۵ فٹ

---

[1] حضرت شاہ شمس علیہ الرحمۃ کی تاریخ وفات اس مصرعے سے برآمد ہوتی ہے ؏ غروب گشت بملتان شمس روحانی ۶۷۵

کی فردوسی عمارت اور باہر کی آٹھ فٹ کی رنگین غلام گردش کو دیکھتا ہے تو شوق دید یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس دلکش و دلستاں شاہکار کو اٹھا کر بیضۂ چشم میں رکھ لے تاکہ اس کے پُر کیف نظارہ سے ہر وقت خُلدِ بریں کی یاد تازہ ہوتی رہے۔

خانقاہ کا انتظام اوقاف سے متعلق ہے اور ۲۰ تا ۲۲ ساون کے علاوہ عیدین کے بعد پہلے جمعہ کو حضرت کے آستان پر بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ مخدوم سیّد مختار حسین شاہ صاحب شمسی حضرت کے موجودہ سجّادہ نشین ہیں۔

نسب نامہ سیّد علی اکبر دسورہ بیانی کے متولیوں سے جو نسب نامہ موصول ہوا ہے وہ درجِ ذیل ہے:۔

شاہ شمس الدین سبزواری بن سید صلاح الدین محمد نور بخش، بن سید علی، بن سید عبدالمؤمن شاہ مراکو، بن سید علی، بن سید محمد، بن سید محمود سبزواری (مدفون لاہور) بن سیّد محمد بن سیّد ہاشم علی، بن سید احمد ہادی بن سید منتظر باللہ، بن سید عبدالمجید، بن سیّد غالب علی، بن سیّد محمد منصور خافانی، بن سیّد اسمٰعیل ثانی، بن سیّد محمد عربعیٰ، بن سیّد اسمٰعیل، بن امام جعفر صادق علیہم السّلام۔

اس شجرہ میں کئی اشکال ہیں، جن کی صحت ضروری ہے۔ شمسی سادات میں انساب کے ماہرین کی کمی نہیں۔ امید ہے کہ وہ اس طرف ضرور متوجہ ہوں گے۔ آپ کے شجرہ میں سیّد صلاح الدین محمد نور بخش کو جو فرقہ نوربخشیہ کے بانی تھے۔ آپ کا والد ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ یہ بزرگوار آپ سے دو سو برس بعد ہوئے ہیں۔ اور ان کی تاریخ وفات ۸۶۹ھ ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے والد سیّد صلاح الدین کو نور بخش کا خطاب نام کی مماثلت کی وجہ سے سہواً دیا گیا ہے۔ آپ صرف

صلاح الدین تھے، نہ نور بخش تھے اور نہ نور بخشی فرقہ سے آپ کا کچھ تعلق تھا۔
اسی طرح چوتھے نمبر پر عبدالمومن شاہ مراکو، کو آپ کے اجداد میں دکھایا جاتا ہے۔ انساب کے ماہرین پر یہ امر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ عبدالمومن شاہِ مراکش سیّد نہیں تھے۔ الاحاطہ فی اخبارِ غرناطہ میں جسے علامہ ابنِ خطیب نے عبدالمومن شاہِ مراکو سے ایک سو سال بعد میں مدوّن کیا ہے، بادشاہ مذکور کا شجرہ اس طرح سے درج کرتے ہیں:۔

عبد المؤمن بن علی بن علوی بن یعلی بن موار بن نصر بن غنی بن عامر بن موسیٰ بن عون اللہ بن یحییٰ بن ورجالع بن سطور بن نغور بن مطهماط بن هودج بن قیس بن عیلان بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

آپ کے اجداد میں عبدالمومن شاہ کا نام تو آ سکتا ہے، مگر شاہ مراکو کا نہیں۔ اسی طرح سیّد محمود سبزواری (مدفون لاہور) شاہ شمس کی اولاد سے تو ہو سکتے ہیں، مگر اجداد سے نہیں۔ اہلِ تحقیق پر یہ امر بخوبی عیاں ہے۔

اولاد امجاد حضرت شاہ شمسؒ کے دو صاحبزادے تھے، سیّد نصیر الدین احمد، آپ لاہور میں ۶۸۲ھ میں فوت ہوئے۔ سیّد احمد شکر بار لاولد تھے۔
اوّل الذکر کے پوتے حاجی صدر الدین بڑے با اثر بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے صاحبزادے سیّد کبیر الدین کے ہمراہ دکن، گجرات (کاٹھیاواڑ) سندھ اور پنجاب کے تمام اضلاع میں دورہ کیا، اور ہر گھر میں خدا کا آخری پیغام پہنچایا۔ لوہانہ قوم میں آپ کو زیادہ کامیابی ہوئی۔ سیّد حسن کبیر الدین کے بارے میں مشہور ہے کہ

جس کسی کو اسلام کی طرف بلاتے تھے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کفر شکن کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ایک دفعہ اُچ کے ہندو گنگا کے اشنان کو جا رہے تھے۔ آپ نے اُنہیں اُچ ہی میں گنگا کا اشنان کرا دیا۔ یہ کرامت دیکھ کر وہ سب لوگ مسلمان ہو گئے۔ اور خواجہ کہلائے۔ حاجی صدر الدین کا مزار ترنڈہ گور گیج میں اور سید حسن کبیر الدین کا اُچ کے مضافات میں واقع ہے۔ سید حسن کبیر الدین کے صاحبزادوں میں سے سید عالم شاہؒ حضرت شاہ شمسؒ کے غربی پہلو میں دفن ہیں۔ آپ ۱۵ شعبان ۷۳۱ھ کو پیدا ہوئے اور اپنی ساری زندگی عالمِ تجرید میں بسر کر کے ۲۷ صفر ۷۹۴ھ کو راہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔

سید علی اکبرؒ آپ کا مقبرہ سورہ میانی میں واقع ہے اور آپ کا نسب نامہ بترتیب ذیل آٹھ واسطوں سے حضرت شاہ شمس سے مل جاتا ہے۔ سید علی اکبر ولد سید موسیٰ ظاہری (مدفون سیت پور) بن بابا ولی قندھاری، بن سید اسلام شاہ نصر اللہ بن سید حسن کبیر الدین کفر شکن بن حاجی صدر الدین بن سید شہاب الدین، بن سید نصیر الدین احمد بن حضرت شاہ شمس سبزواری رحمہم اللہ علیہم

شہزادہ محمد نکوداری حضرت شاہ شمسؒ کے کچھ عرصہ بعد سلطان احمد نکودار کے فرزند ارجمند شہزادہ محمد نکودار کا بھی انتقال ہو گیا۔ آپ کا مقبرہ شاہ شمس کے جانب شرق اور نواب شاہنواز کی قبر کے قریب واقع ہے۔ عوام میں یہ مزار حاجی بغدادی سے موسوم ہے۔

شاہ شمسؒ سے متعلق عوامی روایات مشہور ہے کہ بغداد میں شاہ شمسؒ نے

سلطان احمد نکودار کے مردہ صاحبزادے کو قُم باذنی کہہ کر زندہ کیا تھا۔ اس پر علماء نے آپ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ اور کھال اُتارنے کے درپے ہوئے۔ آپ نے مکمل اوڑھ کر چوٹی سے کھال کھینچی اور اُتار کر علماء کے سامنے رکھ دی۔ جو شہر میں پھرائی گئی۔ شام کو آپ نے واپس لے کر مثل لباس کے زیب تن کر لی۔ یہ واقعہ سلطان احمد نکودار کے زمانے سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس نے ۶۸۱ھ تا ۶۸۳ھ صرف تین سال حکومت کی ہے۔ یعنی شاہ شمسؒ کے ورودِ ملتان سے پندرہ برس بعد۔[1]

دوسرا واقعہ ملتان میں سورج اُتارنے کا ہے کہ جب آپ کو گوشت بھوننے کے لئے آگ کی ضرورت محسوس ہوئی اور ملتان شہر سے آگ نہ مل سکی تو آپ نے سورج کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

"اے آفتاب! اے آفتاب!! گرمی کن، گرمی کن!"[2]

بحکم اس کے آفتاب نیچے اُتر آیا اور لوگ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ اگر آتشی شیشہ سورج کی شعاعوں کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے تو ایک ولی اللہ کے لئے کیا مشکل ہے۔ مگر قدیم و جدید مورخین میں سے کسی نے ایسا واقعہ ذکر نہیں کیا حالانکہ آپ کا مزار ہے اور وہ اُس زمانے میں ملتان میں مقیم تھا۔ اگر اس قسم کا کوئی بات وقوع میں آتی تو وہ اپنی تاریخ میں ضرور درج کرتا۔ مخدوم گردیزی نے تذکرۃ الملتان میں

---

[1] دارالحکومت، دہلی ص۲۴۳

[2] یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آگ لینے کے لئے حضرت شاہ شمسؒ نے شہزادہ محمد نکودار کو شہر میں بھیجا تھا۔ یہ بات بھی دل کو نہیں لگتی۔ جب سید عبدالہادی جیسے بزرگ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ ایک کمسن بچے کو اجنبی شہر میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس قسم کی تمام باتیں بعد کی پیداوار ہیں جنہیں حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ (ف)

ملتان کے مشائخ کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن وہ بھی خاموش ہیں۔ ریسٹ علی اکبر کے سوسیسے نے شاہ شمسؒ کے حالات پر جو کتابچہ لکھا ہے اس میں یہ دونوں واقعات نہیں ہیں۔ اس سے ان مزید معلیات کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم

سلطان غیاث الدین بلبن

۱۱ جمادی الاوّل ۶۶۴ھ کو سلطان ناصر الدین محمود کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ اُمرائے سلطنت نے بالاتفاق الغ خاں وزیر اعظم کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا۔

الغ خاں نے سلطان غیاث الدین بلبن کے لقب سے دہلی کے تخت پر جلوس کیا۔ بلبن نسلاً ترک تھا۔ جب مغلوں نے اس کے وطن کو غارت کیا تو بلبن ان کے ہاتھ آگیا۔ ان سے ایک سوداگر نے خریدا، اور بغداد پہنچ کر خواجہ جمال الدین بصری کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ خواجہ اسے دوسرے غلاموں کے ہمراہ دہلی لے آیا۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ جب بلبن سلطان شمس الدین التمش کے سامنے لایا گیا، تو اس نے اسے خریدنے سے انکار کر دیا، کیونکہ یہ پست قد اور کریہہ المنظر تھا۔ بلبن نے یہ معلوم کر کے سوال کیا کہ "جہاں پناہ نے دوسرے غلام کس کے لئے خریدے ہیں" سلطان نے ہنس کر جواب دیا کہ "اپنے لئے!" بلبن نے دست بستہ عرض کیا "تو پھر مجھے خدا کے لئے خرید لیں"۔ سلطان کو یہ جواب بڑا پسند آیا۔ اور اسے خرید کر سقہ کی خدمت سپرد کی۔[1]

چونکہ بلبن فطرتاً ہوشیار اور چالاک واقع ہوا تھا۔ اس لئے روز بروز ترقی کرتا

---

[1] Medival India by S. Lane Poole P. 78

چلا گیا۔ سلطانہ رضیہ نے اسے میر شکار بنایا۔ بہرام شاہ کے زمانے میں میر آخور ہو گیا سلطان علاء الدین مسعود نے "امیر حاجب" بنایا اور سلطان ناصر الدین محمود نے تو سلطنت ہی اس کے حوالے کر دی۔ سلطان غیاث الدین بڑا دانا اور منتظم انسان تھا۔ جب تک کسی شخص کی قابلیت اور صلاحیت اس پر واضح نہ ہو جاتی اُس وقت تک اُسے کوئی عہدہ نہیں دیتا تھا۔ اور اگر کسی ملازم سے لغزش ہوتی تو اسے فوراً معزول کر دیتا تھا۔ ہمیشہ سنجیدہ رہتا تھا۔ دربار میں ہزل گو یا مسخروں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ وہ خود قہقہہ سے ہنستا اور نہ ہی امراء کو اس کے حضور میں ہنسنے کی جرأت ہوتی تھی۔ عدل پروری کا یہ عالم تھا کہ وہ انصاف کے معاملے میں کسی کی رعایت نہیں کرتا تھا۔ اپنی سلطنت کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے اس نے کثرت سے جاسوس مقرر کر رکھے تھے اور وہ سختی سے احتساب کرتا تھا۔ اس لئے نہ تو جاسوس کوئی غلط خبر اُس تک پہنچاتے تھے اور نہ ہی حکام اور عمال کو بے راہ روی کی جرأت ہوتی تھی۔[1]

سلطان محمد بلبن

بلبن کے بڑے بیٹے کا نام محمد سلطان تھا۔ جو بعد میں "خان شہید" سے موسوم ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں سلطان نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ یہ اسی سعی مشکور کا نتیجہ تھا کہ شہزادہ مکارمِ اخلاق اور محاسن میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ فضل و کمال اور دانش و ہنر میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ اور دو زانو ہو کر بیٹھتا تھا۔ ۶۷۲ھ میں ملک شیر خاں کا انتقال ہو گیا تو سلطان نے ملتان کی گورنری پر اس پیارے اور قابل شہزادے کو تعینات کیا۔ اور حضرت امیر خسروؒ اور خواجہ حسنؒ کو جو اپنے دور کے بہت بڑے شاعر اور عارف کامل تھے

---

[1] فرشتہ ص۷۹

شہزادے کے ہمراہ کر دیا۔ شہزادہ نہایت حسین اور خوش اخلاق نوجوان تھا۔ اس نے آتے ہی اہلِ ملتان کا دل موہ لیا۔ فرشتہ لکھتا ہے:۔

"یہ شہزادہ اس قدر مہذّب اور شائستہ تھا کہ اگر کسی مجلس میں تمام دن رات بیٹھنا پڑتا تو بھی اپنا زانو اونچا نہ کرتا"

حضرت امیر خسروؒ کا بیان ہے کہ میں نے سخن فہمی، باریک بینی، ذوقِ صحیح۔ اور متقدمین کے اشعار کی یادداشت میں اس کے برابر بہت ہی کم لوگ دیکھے ہیں اسی قابلیت کے طفیل اس نے بیس ہزار منتخب اشعار کی بیاض مرتب کی تھی۔ اس زمانے میں یہ اتنی نادر اور بیش بہا خیال کی جاتی تھی کہ شعرائے عصر اس کو نقل کرنے کی آرزو رکھتے تھے۔

قال وحال کی مجلسیں

شہزادہ بالعموم حضرت عارف باللہ کی خدمت میں حاضر ہُوا کرتا تھا اور حضور بھی اس کی خاطر گاہے گاہے مجلسِ خاص میں تشریف لے جاتے تھے۔ حضرت شیخ عثمان المرندی الملقب بہ لال شہبازؒ سہوان سے اپنے مرشدِ طریقت کے آستان پر حاضری دینے آتے تو وہ بھی شہزادہ کی دلجوئی کے پیشِ نظر اس کی علمی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔

ایک روز آسمانِ سہروردیہ کے یہ شمس و قمر یعنی شیخ العارفؒ اور لعل شہباز قلندرؒ شہزادے کے ہاں تشریف فرما تھے۔ ان کی معیت میں اور بھی بہت سے درویش چلے آئے تھے۔ خوش گو غزل خواں عربی اشعار پڑھ رہا تھا۔ ایک شعر پر دفعتہً ان بزرگوں اور دُوسرے درویشوں پر وجد طاری ہو گیا اور وہ رقص کرنے لگے۔ تمام مجلس ادب سے کھڑی ہو گئی۔ شہزادہ بھی ان کے سامنے دست بستہ کھڑا

رہا اور زار و قطار روتا رہا۔

سلطان محمدؒ کا قتل

ذی الحجہ ۶۸۳ھ میں دفعتاً اطلاع ملی کہ تیمور خان مغل تیس ہزار فوج کے ہمراہ لاہور کے قریب پہنچ چکے ہے۔ سلطان محمد نے ستیؔ ہزار کو ستہؔ ہزار پڑھا۔ جس پر یہ دس ہزار سواروں کے ہمراہ لاہور پہنچا۔ اور راوی کے کنارے کافروں سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ امیر خسرو اس مہم میں شہزادے کے ساتھ تھے۔ گرفتار کرلئے گئے۔ لکھتے ہیں ؎

من کہ بہ سر نہ نہادہ بودم گل
توبرہ بہ سرم نہاد دگفتا چل

"چل" خالص سرائیکی زبان کا لفظ ہے جو ملتان اور اس کے مضافات میں اب بھی بولی جاتی ہے۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے کبھی اپنے سر پر پھول بھی نہیں رکھا تھا۔ مگر مغلوں نے میرے سر پر توبرہ رکھ دیا۔ اور کہا "آگے بڑھو!" مغل امیر خسروؔ کو ہرات اور بلخ لے گئے۔ دو برس کے بعد اس بلا سے نجات ملی۔ اُفتاں و خیزاں اپنے وطن پٹیالی آئے۔ آپ کی والدہ اُس وقت تک زندہ تھیں۔ آپ کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوئیں کہ اُن کی چھاتیوں سے دُودھ کی دھار جاری ہوگئیں[1]۔

جب یہ خبر دہلی پہنچی تو بادشاہ کو سخت صدمہ ہوا۔ اگرچہ ظاہر میں استقلال طبع دکھاتا تھا، لیکن دل کا خدا حافظ تھا۔ رات کو نالہ و زار روتا تھا۔ سلطان محمد کی تمام جاگیر اور ملتان کی صوبیداری اس کے بیٹے کیخسرو کو مرحمت کی اور جدید امراء کے ہمراہ اُسے ملتان روانہ کیا۔ سلطان بیٹے کے غم میں بتاشے کی طرح گھلا جا رہا تھا۔ عمر بھی اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ ان اسباب نے اُسے زندہ درگور کر دیا تھا۔ اسی عالم میں امیر خسروؔ

[1] حیات خسرو از سید رکن الدین نظامی

مغلوں کی قید سے رہا ہو کر دہلی پہنچے۔ ماتمی لباس میں تعزیت کو حاضر ہوئے اور اپنے دو پُر درد مرثیے جو انہوں نے سلطان محمد کی شہادت پر لکھے تھے بڑی رقت اور دکھ سے پڑھے[1]۔ امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ روتے جاتے تھے اور تمام حاضرینِ دربار بھی بے قرار ہو کر رو رہے تھے سلطان بڑے حوصلے سے ان مرثیوں کو سُنتا رہا۔ جب امیر خسرو پڑھ کر فارغ ہوئے تو سلطان دربار برخاست کر کے محلسرائے میں داخل ہو گیا۔ اور وہاں بند کمرے میں اس قدر رویا کہ اُسے سخت بخار ہو گیا اور اسی دلی صدمہ اور بخار میں تیسرے ہی دن اس کا انتقال ہو گیا[2]۔

---

[1] حیات خسرو رحمۃ اللہ علیہ [2] امیر خسرو کا نام فرشتہ نے ابوالحسن لکھا ہے اور ایلیٹ نے یمین الدولہ محمد حسن تحریر کیا ہے۔ ان کے والد ماجد کا نام سیف الدین محمود تھا۔ ایک ترکی قبیلہ لاچین کے مشہور فرد تھے۔ امیر خسرو بمقام پٹیالی (مومن آباد) ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ۶۸۸ھ میں ان کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ ان کی سب سے پہلے ملک چھجو (برادر زادہ بلبن) کے دربار میں رسائی ہوئی۔ پھر بلبن کے بیٹے بغرا خاں حاکم سامانہ کے ندیم ہو گئے۔ جب ملتان کی حکومت سلطان محمد سے متعلق ہوئی تو وہ انہیں اپنے ہمراہ ملتان لے آیا۔ خان شہید کے قتل ہونے پر تاتاری انہیں قید کر کے لے گئے۔ دو برس کے بعد رہائی پائی اور بھاگ کر دہلی آ گئے۔ دہلی کے تخت پر جو سلطان بھی بیٹھا اس نے امیر خسرو کی قدردانی میں کوئی کمی نہ کی۔ غیاث الدین تغلق کے زمانے میں یہ ان کے ہمراہ بنگال کی مہم پر گئے ہوئے تھے کہ آپ کی عدم موجودگی میں آپ کے پیر طریقت خواجہ نظام الدین اولیاء کا انتقال ہو گیا۔ آپ یہ خبر سنتے ہی فوراً دہلی آئے تمام دولت خواجہ صاحب کے نام پر نثار کر کے گوشہ نشین ہو گئے اور ۶ ماہ بعد ذی قعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے پائیں زیارت گہ خاص و عام ہے۔

امیر خسرو کی ذات نہ صرف پاک و ہند بلکہ پوری اسلامی دنیا کے لئے مایۂ ناز ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس پایہ کے جامع کمالات نفوس دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ شاعری کے ماسوا آپ موسیقی کے بھی بڑے ماہر تھے اور آپ کا شمار اس فن کے کاملین میں ہوتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ جب آپ کے کمالاتِ باطنی پر نظر جاتی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص جو امراء دربار اور بادشاہوں کی صحبت میں زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ روحانیت میں اتنی ترقی کیونکر کر گیا کہ خود اس کے پیر نے دعا کی کہ "الٰہی بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش!" (ملخص اسلامی ہند ص ۱۷۶، ۱۷۷)

سُلطان کیخسرو کا قتل

بلبن کا خیال تھا کہ اپنے بعد محمد کو جانشین کر جائے گا جب وہ شہید ہو گیا تو اس نے دوسرے بیٹے بغرا خان کو طلب کیا۔ لیکن اُس نے بنگال کی پُرتعیّش زندگی کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اس لئے بلبن نے ناراض ہو کر سلطان محمد کے بیٹے کیخسرو کو نامزد کر دیا۔ جب بلبن کا انتقال ہو گیا تو وزیر اعظم نے کیخسرو کو نظر انداز کر کے بغرا خاں کے بیٹے کیقباد کو تخت نشین کر دیا۔ یہ شہزادہ مُلک داری کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ ملک نظام الدین وزیر اعظم نے اسے شیشے میں اُتار لیا اور پھر جو چاہا کرایا۔

اس نے کیقباد کو سمجھایا کہ کیخسرو آپ کا برابر کا دعویدارِ سلطنت ہے۔ اگر آپ اطمینان سے حکومت کرنا چاہتے ہیں تو اس کانٹے کو درمیان سے نکال پھینکیں۔ کیقباد نشے میں بدمست ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ نظام الدین کے جواب میں سر ہلا دیا۔ جس پر اس بدبخت نے کیخسرو کے نام دربار میں حاضر ہونے کا فرمان بھیجوایا اور راستے میں عزرائیل مقرر کر دیئے۔ جنہوں نے رہتک کے قریب اس کی جان نکال لی۔ اس خبر سے تخت کے خیر خواہوں میں ایک تہلکہ سا برپا ہو گیا۔ مگر نظام الدین نے کسی کو نہ اُبھرنے دیا اور ایک ایک کو چُن چُن کر مروا ڈالا۔

سنہ ۶۸۹ھ میں سلطان کیقباد شراب نوشی کی کثرت سے مفلوج ہو گیا۔ اور اپنے خانہ زاد غلاموں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کی جگہ سلطان جلال الدین فیروز دہلی کے تخت پر بیٹھا اور اُس نے اپنے بہادر بیٹے ارکلی خاں کو ملتان کا گورنر مقرر کیا۔

شہزادہ ارکلی خاں

تقریباً سات سال حکومت کرنے کے بعد سلطان اپنے کافر نعمت بھتیجے علاء الدین کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اُس نے دہلی کے تخت پر قدم

دیکھتے ہی الغ خاں، الماس بیگ اور ظفر خاں کو چالیس ہزار سواروں کے ساتھ ملتان روانہ کیا، تاکہ ارکلی خاں اور اس کے متعلقین کا قصہ تمام کر دیں۔ اُن امراء نے آتے ہی ملتان شہر کا محاصرہ کر لیا۔ شہزادہ ارکلی خاں جانتا تھا کہ علاء الدین ہمیں کسی صورت زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے اس نے شہر اور قلعے کے دروازے بند کرا دیئے، اور دو ماہ تک محصور ہو کر پڑا رہا۔ الغ خاں شہزادہ کے معاون امراء کے نام سلطان علاء الدین کے خفیہ خطوط لایا تھا۔ جن میں انہیں وزارتوں اور عہدوں کے علاوہ، نقد انعام کا لالچ دیا گیا تھا۔ یہ نسخہ تیر بہدف ثابت ہُوا اور شہزادے کی فوج کا بیشتر حصہ اُسے دھوکہ دے کر الغ خان سے مل گیا۔

جلالی شہزادے شاہ رُکن عالمؒ کی خدمت میں

ان دنوں الشیخ العارف حضرت صدر الدین محمد سہروردی علیہ الرحمۃ بوجہ کبر سنی اور ضعیفی خلوت نشیں ہو چکے تھے اور بہت کم باہر نکلتے تھے۔ اسی لئے خانقاہ، مدرسہ اور لنگر خانے کا انتظام حضرت شاہ رکن عالم علیہ الرحمۃ کے سپرد تھا۔ شہزادوں کو بچاؤ کی جب اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ گھبرا کر حضرت کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے اور امان طلب کی۔ آپ نے الغ خاں کو بلا کر سفارش کی اور فرمایا کہ آپ لوگوں نے سلطان جلال الدین کے ساتھ جو کچھ کیا سو کیا، لیکن ان کی اولاد کے پیچھے نہ پڑو۔ الغ خاں نے وعدہ کیا کہ میرے ہاں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ سلطان کو بھی آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔ چنانچہ الغ خاں شہزادوں کو ادب و احترام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے آیا اور اپنی محلسرائے کے پاس اُتارا، سلطان کی خدمت میں فتح نامہ تحریر کیا گیا۔ شہر میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور منبروں پر بادشاہ کے نام کا

خطبہ پڑھا گیا۔ صاحب تذکرۃ الملتان شہزادوں کی گرفتاری کے واقعہ کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"چوں پسران سلطان مرحوم بیتاب شدہ قدوۃ العارفین شیخ رکن الدین ابوالفتح قریشی قدس سرہٗ را وسیلہ انگیختہ امان خواستند و ملاقات کردند الغ خان بمقتضائے اہمیت شرائط تعظیم بجا آوردہ ہمراہ خود دہلی بردہ" (تذکرۃ الملتان ص ۱۸، ۱۹)

ملک الغ خاں نے حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا اُسے پوری طرح وفا کیا اور شہزادوں کو راستے میں کوئی تکلیف نہ ہونے دی، لیکن جب شاہی قافلہ ہانسی کے قریب پہنچا۔ تو ملک نصرت خاں کوتوال دہلی سے آپہنچا اور اس نے شہزادہ ارکلی خاں، قدرخاں، الغو خاں اور ملک احمد چپ کی آنکھوں میں میل کھچوا کر قلعہ ہانسی میں قید کر دیا۔

ملک نصرت خاں ملتان کا علائی گورنر

سلطان علاء الدین نے ارکلی خان کی جگہ ملک نصرت خان کو ملتان کا صوبیدار مقرر کیا۔ یہ بڑا جابر شخص تھا۔ اس نے ملک کا اچھا انتظام کیا اور ملتان، اُچ اور سندھ کے مضافات میں دورہ کر کے ملک کو شر انگیز عناصر سے پاک و صاف کر دیا۔ ۶۹۹ھ میں مغلوں نے سیوستان کی طرف سے ملتان پر حملہ کیا، مگر نصرت خاں نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور وہ ٹڈی دل کی طرح آگے بڑھ گئے۔

فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی تین سال بے دغدغہ حکومت کرنے کے بعد ذرا بھٹک گیا تھا۔ اور وہ اپنے امراء کی مدد سے نئے دین کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس لئے حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم ملتانی قدس سرہٗ نے بغوائے

افضل الجہاد کلمۃ الحق عند سلطان الجائر۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر کی بجا آوری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیا۔ اور کجرو سلطان کو "سبیل الرشاد" پر گامزن کرکے ہی دم لیا ________ تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ سلطان کے واضح نقائص کے باوجود ملک میں اگر دینداری کا چرچا تھا تو یہ حضرت قطب الاقطاب اور حضرت محبوب الٰہی دہلوی جیسے بزرگوں کے فیوض و برکات کا نتیجہ تھا۔ سلطان کی طرف سے جس قدر نذرو نیاز پیش ہوتی وہ سب دہلی کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کروی جاتی۔ یہاں تک کہ ایک جیتل بھی آپ اہل ملتان کے لئے اپنے پاس نہ رہنے دیتے۔ کیونکہ اس شہر کے لئے آپ کی وہاں کی فتوحات کافی تھیں۔ مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ

در آنچہ حضرت شیخ المشائخ رکن الدین ابوالفتح از ملتان بدہلی آمدے خلق را از عطائے ظاہر و باطن ایشاں ہر روز روز عید بودے، و ہر شب شب قدر ________

دو بار عہد سلطان علاء الدین خلجی آمدہ بودند ________

سلطان علاء الدین باوجود استکبارے کہ داشتے باستقبال ایشاں حاضر شدے و باعزازے تمام در شہر دہلی آوردے، دو لاکھ تنکہ در روز آمدن ایشاں شکرانہ فرستادے و پنج لاکھ تنکہ وقت وداع پیش شاں نہادے و آں دو لکھ تنکہ کہ در وقت آمدن بایشاں رسیدے، ہماں زماں ایثار شدے و پنج لکھ تنکہ کہ وقت رخصت آمدے ہماں زماں بخلاف بخش شدے "۔

یعنی ____ جب کبھی حضرت شیخ المشائخ رکن الدین ابوالفتح علیہ الرحمۃ ملتان سے

دہلی تشریف لاتے، ان کی ظاہری اور باطنی بخشش سے اہل دہلی کے لیے ہر روز روزِ عید، اور ہر شب شبِ قدر ہوتی!

سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں آپ دو مرتبہ دہلی تشریف لائے اور سلطان باوجود اس قدر کبر و غرور کے استقبال کو نکلتا اور بڑے اعزاز کے ساتھ حضرت کو دہلی میں لے آتا۔ دو لاکھ اشرفی ان کی تشریف آوری پر بطور شکرانہ کے پیش کرتا تھا اور پانچ لاکھ اشرفی بوقت روانگی پیش کرتا تھا۔

دو لاکھ تنکہ یعنی دو لاکھ اشرفی جو آپ کی آمد پر نذر کی جاتی تھی حضرت کے حکم سے اُسی وقت دہلی کے فقراء میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ اور پانچ لاکھ جو بوقتِ وداع نذر ہوتی تھی، وہ آپ کی روانگی پر فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے

ایسے جود وسخا پر بالخصوص فقراء کا خوش ہونا لازمی امر ہے۔ اس سستے زمانے میں جبکہ چار آنے من گندم فروخت ہوتی تھی، جس گھر کے پانچ افراد سات سات اشرفی لے جائیں، اُن کے ہاں روز روزِ عید اور رات کالیلۃ القدر ہونا بدیہی امر ہے۔

یہ تو صرف دہلی شہر کی کیفیت ہے جہاں حضرت گاہے گاہے تشریف لے جاتے تھے۔ لیکن ملتان، جہاں حضرت قطب الاقطاب کا وجودِ مسعود مستقل طور پر سایہ فگن تھا، ان کے فیوض و برکات سے محروم کیسے رہتا۔ بلاشبہ یہ عظیم شہر حضرت شیخ الاسلام کے زمانے سے برابر فارغ البالی اور سکون و اطمینان کی دولت سے مالا مال چلا آتا تھا۔

شیخ العارفؒ کی وفات

حضرت الشیخ العارف صدرالدین محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جامع السلاسل کی روایت کے مطابق ۲۳ ذی الحجہ ۷۰۰ھ کو انتقال فرمایا۔ "صدرالدین عارف" سے ہی آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ جامع السلاسل کے الفاظ یہ ہیں:-

"شیخ عارف عالم بود باعمل و دانش ورے کامل۔ وفات او شاں در سال ہفت صد و نہ ہجری کہ با "صدرالدین عارف" در شمار برابر است واقع شد نور اللہ مرقدہٗ۔"

عمر شریف ۸۸ برس تھی۔ وفات کے وقت حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم قدس سرہٗ موجود نہ تھے۔ حضرت الشیخ العارفؒ ساتویں صدی ہجری کی عظیم شخصیت تھے۔ آپ نے اپنے ذاتی کمالات کی بنا پر اس کشش میں کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی جو حضرت شیخ الاسلام کے زمانے میں طالبان معرفت کو اکناف عالم سے ملتان کھینچ لایا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ حضرت زکریا قدس سرہٗ کے بعد بھی جوں کا توں قائم رہا۔ حضرت الشیخ العارفؒ کا ملتان سے باہر جانا ثابت نہیں شاہان اسلام کے دعوت ناموں کے باوجود کبھی درباروں میں چل کر نہ گئے اور نہ کبھی سندھ یا شمالی پنجاب کا دورہ فرمایا۔ کیونکہ اب خدا کے فضل سے جنوبی ایشیا کے گوشے گوشے میں حضرت شیخ الاسلام کے خلفاء موجود تھے اور اصلاح احوال و تبلیغ اسلام کا تسلی بخش کام کر رہے تھے۔ آئے دن ملک کے طول و عرض سے تبلیغی جماعتیں ملتان پہنچتیں اور آپ سے ہدایات حاصل کرتی تھیں اگر آپ

ملتان سے باہر تشریف لے جاتے تو تبلیغی امور کی تکمیل میں ایک خلا سا پیدا ہو جاتا۔

حضرت شیخ مقدس

حضرت شیخ العارف کی زندگی کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے نہ تو نامور باپ کی طرح مرشد کی تلاش میں بلخ اور بخارا کا سفر کیا اور نہ ہی حریم معرفت تک پہنچنے کے لئے اُنہیں سلوک کی پُرپیچ وادیوں کو طے کرنا پڑا۔ وہ غوث الاغواث کے بیٹے تھے۔ غوث کی گود میں پلے پوسے اور ان کی توجہ کے فیضان سے ایک ہی جست میں معرفت کی تمام منزلیں طے کر گئے۔ عمر کا بیشتر حصہ اسی نائب رسول کے قدموں میں گزرا اور جب وہ رفیق اعلیٰ کو لبیک کہ گئے تو ان کا سجادہ اس شان سے سنبھالا کہ دوست دشمن سب عش عش کر اُٹھے۔ بقیہ زندگی جلیل القدر باپ اور عظیم الشان مُرشد کے مزارِ پُر انوار کی مجاورت اور ان کے مقصد کی تکمیل میں ختم کر کے ان کے پہلو میں جا لیٹے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے چھ اور صاحبزادے بھی تھے اور وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی قبریں بھی اسی قبہ میں ہوں، ممکن ہے کہ باہر دفن ہوں۔ یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ شیخ العارف کا ہی مقام ہے کہ زندگی بھر میں ایک لحظہ کے لئے بھی آپ والد ماجد سے جُدا نہ ہوئے۔ اور جب "جان" جان آفرین کے سپرد کی تو پھر ان کے پہلو میں ایسے سوئے کہ کوئی قیامت تک اُٹھا نہ سکے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کا ۵ تا ۷ صفر اور حضرت شیخ العارفؒ کا ۲۳ ذوالحجہ کو عرس ہوتا ہے۔ اس مبارک تقریب پر اکنافِ عالم سے جوارِ ارواح صادقہ یہاں جمع ہوتی ہیں، اُن میں ابدال بھی ہوتے ہیں اور اوتاد بھی۔ اور وہ اپنی نشست و برخاست اور اوراد و اذکار کے طور طریقوں سے پہچانے جا سکتے
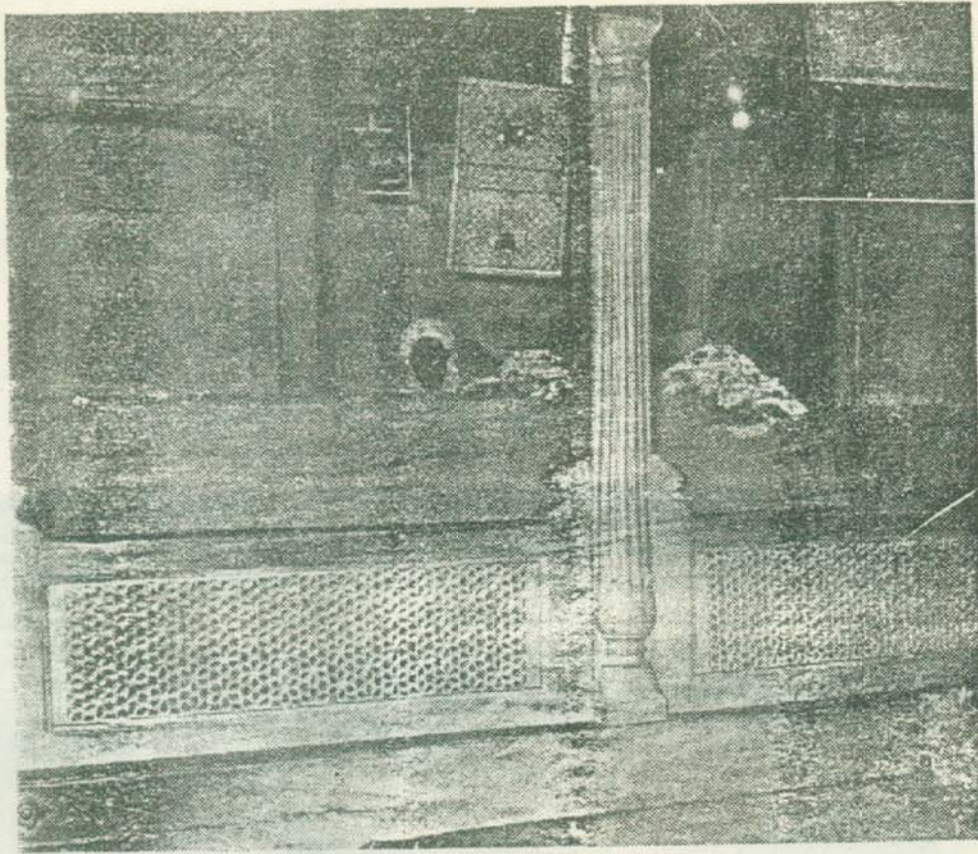
مزار پر انوار الشیخ العارف حضرت صدرالدین محمد رحمتہ اللہ علیہ

مقبرہ حضرت بی بی پاک دامن رح والدہ ماجدہ شاہ رکن عالم علیہ الرحمتہ

شاہ رکن عالم قدس سرہ کا حسین و جمیل سرمرین کٹہرہ

ہیں۔ لیکن ارادت کی نظر شرط ہے۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبال علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی عقیدت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

تبرکات عارفؒ

چونکہ حضرت الشیخ الامام العارف صدر الدین محمد قدس سرہٗ عرصہ تک درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے۔ اس لئے آپ نے مبتدیوں کے لئے "تصریف جدولی" کے نام سے ایک رسالہ مرتب فرمایا تھا۔ جو عرصہ تک عربی مدارس میں متداول رہا۔ اس کے علاوہ ایک اور علمی یادگار "کنوز الفوائد" بھی آپ سے موسوم کی جاتی ہے۔ یہ حضرت کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے ایک فاضل مرید خواجہ ضیاء الدین نے مرتب کیا تھا۔ یہ گرانقدر تحفہ اس وقت ناپید ہے محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں اس کے چند اقتباسات درج کئے ہیں، جن کا متن، ترجمہ اور شرح حضرت شیخ کے تذکرہ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ۔۔۔ خواجہ ضیاء الدینؒ کا اسلوب بیان ملاحظہ ہو:۔

"قال الشیخ الامام العارف صدر الحق والدین رضی اللہ عنہ فی بعض الوصایاہ لبعض المریدین فی کلام القدسی حکایتہ عن اللہ تعالیٰ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ حِصْنِیْ فَمَنْ دَخَلَهٗ اٰمِنَ مِنْ عَذَابِیْ"

یعنی ۔۔۔ یہ وہ وصیتیں ہیں جو حضرت شیخ العارفؒ نے اپنے مریدوں کو ارشاد

کی تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ حدیث قدسی میں ہے کہ لاالٰہ الا اللہ میرا قلعہ ہے، جو اس میں داخل ہُوا وہ میرے عذاب سے نجات پا گیا۔
حصن اور حصار کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حصار وہ ہے کہ احاطہ میں لے لے، لیکن کبھی نگاہ میں رکھے اور کبھی نہ رکھے۔ اور حصن وہ ہے، کہ احاطہ میں بھی لے اور نگاہ میں بھی رکھے۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ لاالٰہ الا اللہ کو حصن کہا گیا ہے حصار نہیں!

اُمّ المریدین بی بی پاکدامنؒ

۶۹۵ھ میں ام المریدین بی بی پاکدامنؒ کا انتقال ہو گیا۔ مخدومہ سلطان جمال الدین شاہِ فرغانہ کی صاحبزادی، حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ کی بہو، الشیخ العارف صدر الدین محمدؒ کی اہلیہ محترمہ اور قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کی والدہ محترمہ تھیں۔ ایک خاتون کے لئے اس سے بڑا شرف اور مجد کیا ہو سکتا ہے کہ باپ بادشاہ، خسر غوثِ زماں، شوہر عارفِ دوراں اور بیٹا زمانے کا قطب الاقطاب ہو۔ اور اپنا مقام اتنا بلند ہو کہ رابعہؒ سُن پائے تو اُسے بھی رشک آئے۔ آپ حافظۂ قرآن تھیں۔ آپ کے محل میں جس قدر لونڈیاں اور خادمائیں تھیں، ان میں ایک بھی بے نماز نہ تھی۔ چکّی پیسنے بیٹھتیں تو قرآن ختم کر کے اُٹھتیں۔ شاہ رکن عالم کی تربیت میں آپ نے جس حزم اور احتیاط سے کام لیا وہ صفحۂ تاریخ پر ہمیشہ زرین الفاظ سے لکھی جائیگی۔ آپ نے انہیں وضو کے بغیر کبھی دُودھ نہ پلایا۔ اور جب دودھ پلانے بیٹھتیں تو بجائے لوری کے قرآن تلاوت فرماتیں۔ خوراک کے متعلق ہمیشہ اس امر کا خیال رہا کہ مطلقاً حلال چیز گھر میں آئے اور وضو کے ساتھ پک کر قطبِ زماں کے دستر خوان پر رکھی جائے آپ کا مقبرہ ملتان سٹی اسٹیشن سے دو فرلانگ جنوب کو واقع ہے۔

قطب الاقطاب، شیخ الاسلام

شاہ رُکنِ عالم مُلتانی

طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ

ولادت	عمر شریف	رحلت
۹ رمضان سنہ ۶۴۹ھ	۸۶ سال	۷ جمادی الاوّل سنہ ۷۳۵ھ

مزار شریف

قلعہ قدیم، ملتان

الشیخ العارف صدر الدین محمد قدس سرہٗ کے وصال کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ رکن عالم علیہ الرحمۃ والغفران نے آبا رکرام کی مسندِ ارشاد کو زینت دی۔ جدامجد حضرت شیخ الاسلام کی دستار مبارک سر پر اور شیخ الشیوخ علیہ الرحمۃ کا خرقہ زیب تن کر کے خلق خدا کو صراط المستقیم پر فائز کرنا شروع کیا۔ اس بابرکت دور میں رشد و ہدایت کی تین مسندیں زیادہ مشہور تھیں، اور ان پر ایسی عظیم شخصیتیں رونق افروز تھیں۔ جنہوں نے جنیدؒ اور غزالیؒ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ ایک قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ تھے جو سہروردی سلسلے کو فروغ دے رہے تھے۔ دوسرے شیخ الموحدین شیخ علاء الدین چشتیؒ تھے، جن کے سحاب کرم نے اجودھن کی سرزمین کو رشکِ فردوس بنا رکھا تھا۔ تیسرے سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین محمد بدایونیؒ تھے۔ جو صحیح معنوں میں دہلی کے روحانی تاجدار تھے۔ ان تینوں کی متحدہ کوششوں نے سرزمینِ ہند کو فسق و فجور سے پاک کر دیا تھا۔ اس دور کا مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی ان قدسی نفوس کے فیوض و برکات کا ذکر اپنے الفاظ میں اس طرح کرتا ہے:۔

"سلطان علاء الدین کے زمانے کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوف حضرت محبوب الٰہی نظام الدین، شیخ المشائخ علاء الدین اور قطب الاقطاب رکن الدین سے آراستہ تھا۔ ایک دنیا ان کے انفاسِ متبرکہ سے روشن
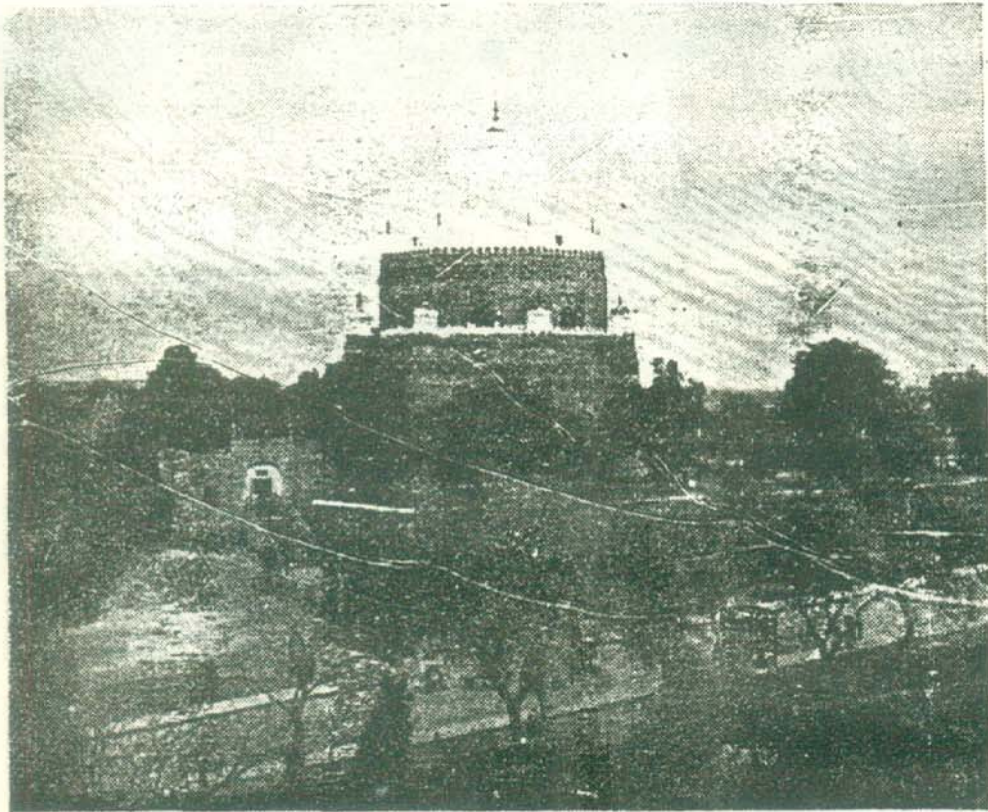
مقبرہ قطب الاقطاب شاہ رکن عالم ملتانی
قدس سرہ

قلعہ قدیم ــــــــــــــ ملتان
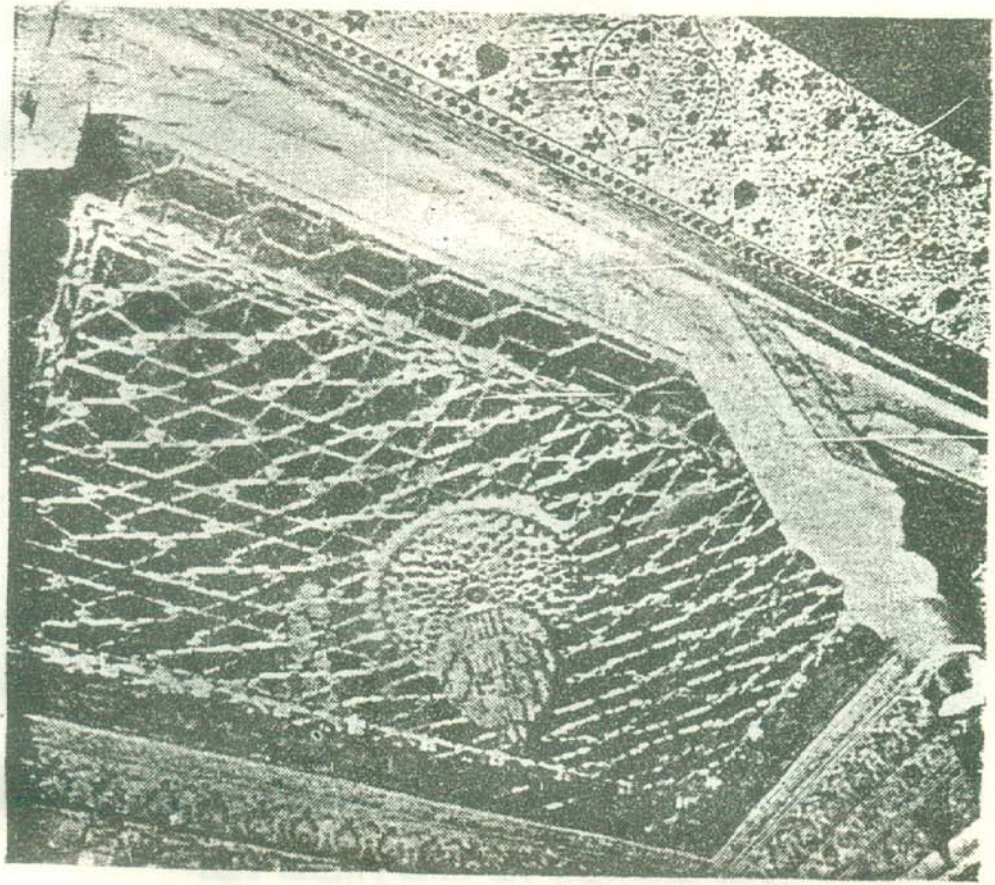
کٹہرے کا بالائی دلفریب نقش و نگار

ہوئی۔ ایک دُنیا نے ان کی بیعت کا ہاتھ پکڑا۔ اور ان کی مدد سے گنہگاروں
نے توبہ کی، ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاری سے ہاتھ اٹھا
لیا اور ہمیشہ کے لئے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔[۱۰۱]

قطب الاقطاب کا مقام

اسی طرح شاہ رکنِ عالم قدس سرہٗ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"ہمچناں در تمامی عصر علائی شیخ رکن الدین کہ شیخ بن شیخ بن شیخ بود۔
بر سجادہ شیخ صدر الدین و شیخ بہار الدین در ملتان مستقیم بود و کدام شرف و
بزرگی و جلالت و منقبت ازاں بہتر و ازاں بالاتر بود! کہ پدر او صدر الدین
و جد او شیخ بہار الدین زکریا باشد! و ہم در عہد علائی شیخ رکن الدین دم
طریقت مشائخ مے داد و حق تکمیل مریداں مے گزاشت و سجادہ پدر
و جد را منور مے داشت و تمامی اہالی دریائے سندھ از ملتان و اُچ و
فرود تر و مریلہ با آستانِ متبرک شیخ رکن الدین قدس سرہٗ العزیز تشبّث و
تعلق نمودہ بودند، و چندیں علماء از شہر و دیار بہند مریدانِ خدمت او شدہ
کہ در کشف و کرامات شیخ رکن الدین کسے را شبہے و شکے نماندہ بود۔"[۱۰۲]

یعنی اس سے زیادہ شرف اور بزرگی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ باپ صدر الدین
عارفؒ اور دادا شیخ الاسلام بہار الدین زکریاؒ ہو۔۔۔ بلاشبہ قطب الاقطاب
شاہ رکنِ عالمؒ نے طریقت اور مشیخت کو اوج کمال پر پہنچا دیا تھا اور مریدوں
کی تربیت کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ باپ دادا کی مسند کو ہر وقت منور رکھتے تھے

---

[۱۰۲] تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی۔ اردو ترجمہ

سندھ اور ملتان کے تمام لوگ اس خاندان سے وابستہ تھے۔ ہندوستان اور ملتان کے بے شمار علماء اور مشائخ آپ کے مریدوں میں شامل تھے۔ آپ کے کشف و کرامات میں کسی کو شک و شبہ نہیں رہا تھا۔

مؤرخین کے علاوہ مشائخ اور فقراء نے بھی آپ کی منقبت اور شان میں قصائد لکھے ہیں۔ مولانا فخر الدین عراقی نے الشیخ العارف صدر الدین محمد علیہ الرحمۃ یعنی آپ کے والد ماجد کا اور آپ کا ایک ہی جگہ ذکر کیا ہے۔ اپنے پیر طریقت حضرت شیخ الاسلام کو خطاب کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں ؎

ہر دو فرزند تو کہ او تادند — ہر یکے غوث ہفت کشور باد
قطب شاں صدر صفۂ ملکوت — کہ مقامش ز عرش برتر باد

بر سر کرسئے ہر یکے گردوں
چوں عراقی ہمیشہ چاکر باد[۱]

اگرچہ شیخ الاسلام کثیر الاولاد تھے۔ لیکن الشیخ العارف اور قطب الاقطاب کو جو خصوصی تعلق حضرت سے تھا۔ اس کے پیش نظر عراقیؒ نے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا۔ گویا آسمان سہروردیہ اس وقت صرف یہی شمس و قمر ضیا بار تھے۔ مولانا جامی اور سلطان التارکین حمید الدین حاکم نے حضرت کی شان میں جو قصائد لکھے ہیں۔ ان کی اس مختصر سی کتاب میں گنجائش کہاں۔ حضرت قطب الاقطاب نے کمالات باطنی کے ساتھ ظاہری حسن و جمال سے بھی بہرہ وافر پایا تھا۔ مولانا جمالیؒ لکھتے ہیں کہ شیخ عثمان سیاح شامی آپ کے حسن و جمال اور چہرۂ انور کے انوار و تجلیات کو دیکھ کر ہی حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تھے۔

---

۱ کلیات عراقی طبع لاہور۔ ص ۵۴

دہلی کا سفر

سلطان علاء الدین ان پڑھ آدمی تھا اور حد سے زیادہ مغرور بھی۔ تین سال بے دغدغہ حکومت کرنے کے بعد ذرا بہک گیا تھا۔ اور وہ برملا کہتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار یاروں کی مدد سے دینِ اسلام کی عظمت اور شوکت قائم کی تھی۔ میں بھی ایک نیا دین اپنے چار یاروں الماس بیگ، ظفر خاں، نصرت خاں اور سنجر الپ خاں کی مدد سے قائم کر سکتا ہوں۔ چونکہ مجلس میں ہر وقت شراب کا دور چلتا تھا۔ اس لئے خوشامدی امراء نشے میں جھوم جھوم کر علاء الدین کے ان خیالات کی تائید کرتے تھے، عقلمند امراء کو جرأت نہ پڑتی تھی کہ سلطان کو ان لغو خیالات سے روکیں۔ آخر ایک دن حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے مرید ملک علاء الملک کوتوال نے سر ہتھیلی پر رکھ کر بادشاہ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیا دین چار یاروں کی مدد سے نہیں چلایا تھا، بلکہ خدا کی وحی کی مدد سے چلایا تھا اور وہ آپ کو میسّر نہیں ہے۔ چنگیز خاں اور اس کی اولاد نے اسلام کو مٹانے کی انتہائی کوشش کی، مگر وہ بھی اسلام کو نہ مٹا سکے، بلکہ اُلٹا آلِ چنگیز کو حلقہ بگوشِ اسلام ہونا پڑا۔ اور انہوں نے اسلام کی حمایت میں جہاد کیے، تب جا کر ان کی حکومتیں مضبوط ہوئیں۔ اگر حضورِ عالی کے خیالات ہندوستان میں مشہور ہو گئے تو ایسی بغاوت سر اُٹھائے گی جسے کوئی طاقت سنبھال نہ سکے گی۔

ایسے اُمراء سمجھتے تھے کہ جب تک کوئی ولی اللہ آ کر بادشاہ کو کلمۂ حق نہیں کہے گا۔ اس قسم کی خوفناک حماقتیں سلطان سے سرزد ہوتی ہی رہیں گی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ سلطان نے از خود حضرت قطب الاقطاب کو دعوت نامہ بھیجا یا نیک نیت امراء نے بادشاہ کو اس امر پر آمادہ کیا۔ بہرحال سلطان کی استدعا پر حضرت قطب الاقطاب دہلی

تشریف لے گئے۔ مولانا جمالیؒ لکھتے ہیں کہ جب حضرت قطب الاقطاب ملتان سے دہلی تشریف لاتے تھے، اس شہر کی مخلوق آپ کی ظاہری اور باطنی بخششوں سے نہال ہو جاتی تھی۔ ان کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شب برات ہوتی تھی۔

سلطان علاء الدین کے زمانے میں حضرت دو بار دہلی تشریف لائے، اور بادشاہ باوجود اس قدر کبر و نخوت دیکھنے کے خود ان کے استقبال کو سوار ہو کر نکلتا۔ اور بڑے اعزاز و احترام سے شہر میں لے آتا۔ دو لاکھ اشرفی تشریف آوری پر نذر گزارتا جو حضور اسی وقت دہلی کے فقراء میں تقسیم کر دیتے اور پانچ لاکھ رخصت ہونے پر، اور وہ بھی اسی وقت مستحقین میں بانٹ دی جاتیں۔

حضرتؒ کی سواری

مختلف تذکروں میں حضرت کی سواری کی جو کیفیت لکھی ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ حضرت جب دہلی تشریف لے جانے کا ارادہ کرتے، تو شہر میں اعلان کر دیا جاتا تھا کہ جس کسی کو بادشاہ سے کچھ عرض معروض کرنا ہو، وہ درخواست لکھ کر پیش کرے۔ اسی طرح چند غلام منزل بمنزل آگے آگے چلتے تھے، جو قیام و طعام کا انتظام بھی کرتے تھے اور ساتھ ہی غرضمند حضرات کو درخواستیں پیش کرنے کی تحریک بھی کرتے تھے۔

حضورؒ کی مرغوب سواری تخت رواں تھی، اسی پر حضرت سوار ہوتے تھے، اور تخت کے آگے پیچھے گھوڑ سوار اور معتقدین کا ایک ہجوم ہوتا تھا۔ گاہے گاہے حضور گھوڑے کی سواری بھی فرماتے تھے۔ الغرض حضرت قطب الاقطاب کی سواری کے آگے آگے خدام ایک صندوق لے کر چلتے تھے جس میں لوگ اپنی درخواستیں ڈالتے تھے، اس طرح دین و دنیا کا یہ شہنشاہ ملتان سے دہلی کو روانہ ہوتا تھا۔ اگرچہ کسی تذکرے میں سلطان

علاء الدین اور قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقاتوں کی تفصیل نظر سے نہیں گزری تاہم سلطان کی طبیعت میں جو خوشگوار تبدیلی ہوئی تھی وہ اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ سلطان نے شیخ کی روحانیت سے جی بھر کر استفاضہ کیا۔ حضرت شاہ رکنِ عالم قدس سرہٗ کے دہلی پہنچتے ہی نہ صرف شہر کا بلکہ پورے ملک کا نقشہ بدل گیا۔ ہر جگہ دینداری کا چرچا ہونے لگا۔ مساجد نمازیوں سے معمور نظر آنے لگیں۔ بازاروں میں فسق و فجور کا نشان تک نہ رہا۔ اہلِ باطن اس خوشگوار تبدیلی کو حضرت قطب الاقطاب کے فیوض و برکات کا نتیجہ خیال کرتے تھے۔ اجناس اس عہد میں اتنی سستی تھیں، کہ پھر کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ چند اہم اشیاء کے نرخوں پر آپ بھی ایک نظر ڈالیں۔

جنس	مقدار	قیمت	جنس	مقدار	قیمت
گیہوں	۴۱ سیر	۲ آنے	گڑ	۱۴ سیر	¼ پیسہ
جو	″	۱؍	گھی	۲½ سیر	– ؍
جوار	″	۱/ ؍	روغن کنجد	۳ سیر	۱/ ؍
ماش	″	۱/ ؍	نمک	۳۵ سیر	۱/ ؍
چنا	″	۱/ ؍	سوتی کپڑا (اعلیٰ)	۲۰ گز	۴ آنے
موٹھ	″	۵ ؍	″ (اوسط)	۳۰ گز	۴ ؍
شکر تری	″	۱½ پیسہ	مصری	فی سیر	۰ ؍

تنخواہ سپاہی	درجہ اوّل	۵۸ — ۸ روپے
تنخواہ سپاہی	درجہ دوم	۳۹ — ۰۰ ″
تنخواہ سپاہی	درجہ سوم	۲۱ — ۱۲ ″

جس کسی کے پاس دو گھوڑے ہوتے، اس کو ۱۹ روپے ۸ آنے زیادہ ملتے تھے۔ جب

تک سلطان علاء الدین زندہ رہا، ضروریات زندگی مقررہ قیمتوں میں بکتی رہیں اور اناج کی قیمت میں، خواہ بارشیں زیادہ ہوں یا کم، رتی برابر بھی گرانی نہیں ہوئی اناج کا منڈیوں میں مقررہ قیمتوں پر فروخت ہونا عجائبات زمانہ میں سے خیال کیا جاتا تھا۔

شیخ رکن الدین دہلی کے قیام میں حضرت قطب الاقطاب یقیناً کئی بار حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے ہوں گے ان میں سے چند ملاقاتوں کا ذکر اکثر مؤرخین نے کیا ہے۔ اُن میں سے ایک ملاقات کا تفصیلی ذکر احمد ایاز خواجہ جہاں کا ہے۔ چونکہ ان کا اپنا مشاہدہ ہے اس لئے ہم باقی تمام روایات پر اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ احمد ایاز لکھتا ہے کہ:۔

"میں اپنے حضور حضرت محبوب الٰہیؒ کے ساتھ چبوترہ یاران پر گیا ہوا تھا۔ اور حضرت حجرہ محراب بزرگ میں تشریف رکھتے تھے۔ اس وقت یکایک کسی نے خبر دی کہ حضرت مخدوم رکن الدینؒ ملتانی اس طرف آرہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا، ممکن ہے کہ وہ اندرپت کے مزارات کی زیارت کے لئے جا رہے ہوں۔ اتنے میں کسی نے عرض کیا کہ ان کی پالکی اسی طرف آرہی ہے۔ حضرت محراب بزرگ کے حجرے سے باہر تشریف لائے اور لنگر خانے کے سامنے میانگی دروازے تک پہنچے تھے کہ حضرت کی پالکی آتی دکھائی دی۔ اور ان کے ساتھ کئی آدمی گھوڑوں پر سوار تھے۔ حضرت دروازہ میانگی کے گنبد کے اندر کھڑے تھے اور ہم بھی حضرت کے ساتھ تھے کہ پالکی گنبد کے قریب آگئی۔ حضرت کے حکم سے گنبد کے اندر فرش بچھا دیا گیا اور حضرت نے فرمایا۔ حضرت کی پالکی اندر لے آؤ۔ گھوڑے سوار باہر ہی اُتر گئے۔ اور گھوڑے چھوڑ کر گنبد کے اندر آگئے۔ حضرت قطب الاقطاب کی
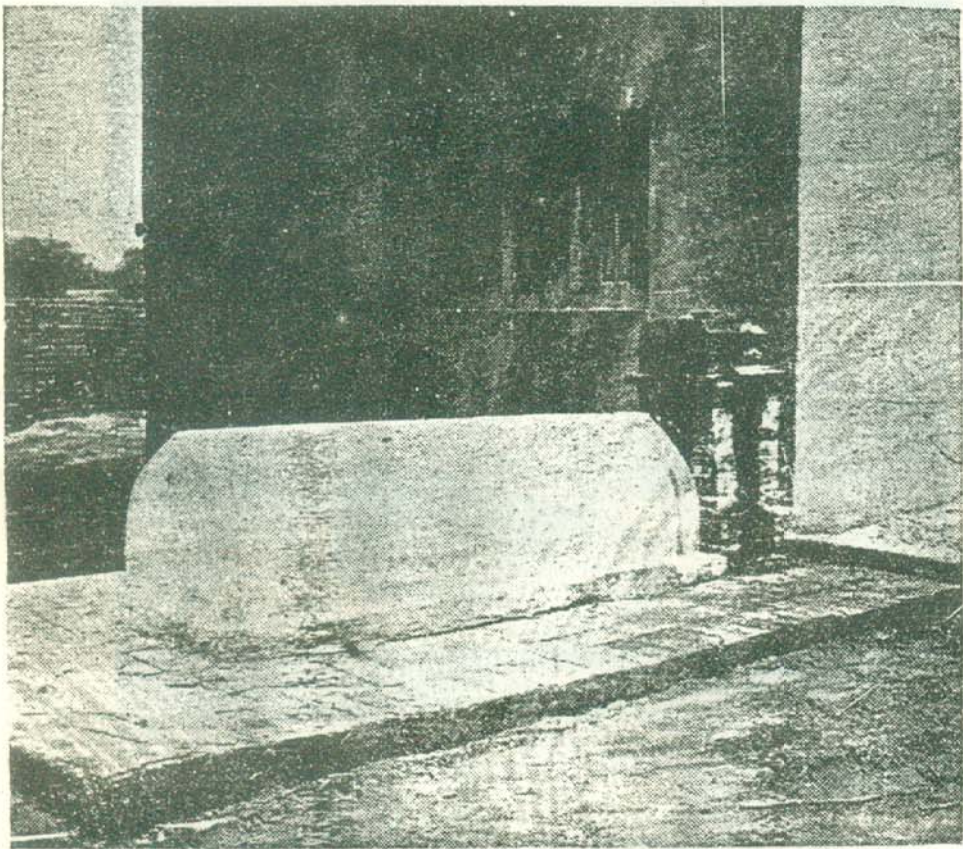
مزار حضرت شاہ بدر رخ عالم اُستاد محترم حضرت مخدوم جہانیاں رح
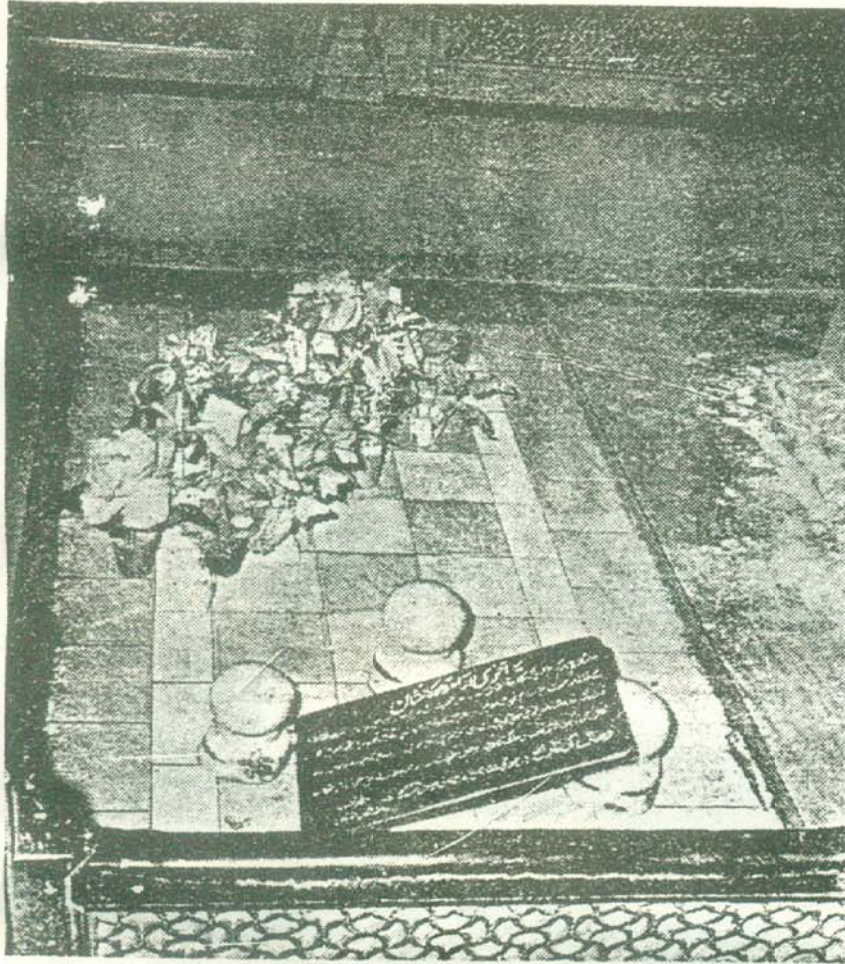
شاہ رکن عالم علیہ الرحمتہ کی پہلی جائے تدفین
حضرت شاہ رکن عالم رح کو پہلے حضرت شیخ الاسلام رح
کے قدموں میں دفن کیا گیا تھا ۔ جب سلطان فیروز شاہ ملتان
آیا تو اس نے بموجب بشارت آپ کے صندوق کو یہاں سے
نکلوا کر بڑے مقبرے میں دفن کرایا

پالکی گنبد کے اندر رکھی گئی، اور انھوں نے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ "آج اس میں کچھ تکلیف ہے، اس واسطے میں گھوڑے پر سوار نہ ہو سکا۔" اس کے بعد حضرت نے آنجناب کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر پالکی سے باہر نکالا اور اپنے قریب فرش پر بٹھا دیا۔ پالکی میں بہت سے کاغذ رکھے تھے۔۔۔ میرے حضرت نے قطب الاقطاب سے پوچھا

"یہ کیسے کاغذات ہیں؟"

حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا۔ لوگوں نے خیال کیا ہوگا کہ میں بادشاہ کے پاس جا رہا ہوں اس لئے انہوں نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے یہ عرضیاں میری پالکی میں ڈال دی ہیں۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں دنیا کے شہنشاہ کے پاس نہیں، بلکہ شہنشاہِ دین کے پاس جا رہا ہوں۔

قطب الاقطاب کی یہ بات سن کر میرے حضورؒ نے خواجہ اقبال کو اشارہ کیا "کھانا لاؤ!" اور نذر پیش کرو!

اقبال فوراً لنگر خانے چلے گئے اور ہم چار آدمی حضرت کے پیچھے دست بستہ حاضر رہے۔ حضرت قطب الاقطاب کے ساتھ بھی چار آدمی تھے جن میں ایک ان کے بھائی تھے۔ وہ بھی ہاتھ باندھے پیچھے کھڑے تھے اور یہ دونوں بزرگ آمنے سامنے دو زانو بیٹھے تھے۔ میرے حضورؒ کا رخ قبلہ کی طرف تھا اور حضرت قطب الاقطاب کا رخ میرے حضرت کے چہرے کی طرف تھا۔ کچھ دیر میرے حضرت نے پاؤں کی تکلیف کی کیفیت دریافت کی۔ اس کے بعد حضرت قطب الاقطاب کے بھائی (شیخ عماد الدین اسمٰعیل) نے قریب بیٹھ کر عرض کیا۔ اس وقت ہندوستان کے مہرو ماہ یہاں جمع ہیں، مجھے ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے، حکم ہو تو عرض کروں؟

میرے حضرت نے فرمایا۔ پوچھئے۔ اگر جواب دینے کے قابل ہوگا تو دیا جائے گا
انہوں نے کہا "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا باعث سب کو معلوم ہے
کہ وحی کے حکم سے ہجرت ہوئی، کیونکہ اہل مکہ نے اتفاق رائے سے طے کیا تھا، کہ
حضرت کو شہید کر دیا جائے۔ اس لئے آنحضرتؐ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے
مگر میرا سوال یہ ہے کہ ہجرت کا روحانی باعث کیا تھا" یہ سن کر میرے حضرت نے
فرمایا کہ یہ سوال بہت بڑا ہے، میری مجال نہیں کہ حضرت قطب المشائخ کے سامنے
زبان کھول سکوں"

حضرت قطب الاقطابؒ نے فرمایا "شہنشاہِ دین کے سامنے میں کیا بول سکتا
ہوں، لیکن الامر فوق الادب کے پیش نظر عرض کرتا ہوں کہ میرا فہم یہ کہتا ہے، کہ
آنحضرتؐ کے کمالاتِ باطنی کی تکمیل اس پر منحصر تھی کہ آنحضرت اپنا گھر چھوڑیں۔ سفر
کی تکلیف اُٹھائیں اور مدینہ میں بے گھر ہو کر رہیں۔"

یہ سُن کر میرے حضرت نے فرمایا۔ "فقیر کے خیال میں اس سوال کا جواب یہ
ہے کہ مدینہ کے رہنے والے ناقص تھے، اور ان کی تکمیل اس پر منحصر تھی کہ حضرت
اپنا گھر چھوڑ کر مدینہ جائیں اور مدینہ کے ناقصوں کا نقص دُور کر کے ان کو کامل بنا دیں۔"

خواجہ حسن نظامیؒ لکھتے ہیں کہ ہجرت کے روحانی سبب کی تشریح دونوں
بزرگوں نے الگ الگ فرمائی، حضرت قطب الاقطاب کے جواب میں یہ بات
پوشیدہ تھی کہ میں ملتان سے ہجرت کر کے دہلی میں اس لئے آیا ہوں کہ باقیماندہ کمالات
حضرت کے فیض سے مجھے حاصل ہو جائیں۔ اور حضرت سلطان المشائخ کے جواب
میں یہ اشارہ تھا کہ میں ناقص تھا، حضرت قطب الاقطاب مجھے کامل بنانے کے
لئے ملتان سے تشریف لائے ہیں۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ جب خواجہ اقبال نے نذرانہ حضرت قطب الاقطاب کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اسے قبول کرنے میں تامل کیا۔ اس پر حضرت محبوب الٰہی نے یہ نذر اُن کے بھائی شیخ عماد الدین اسمٰعیل کے حوالے فرمائی۔ اخبار الاخیار کے الفاظ یہ ہیں :-

"شیخ رکن الدین در گرفتن آں عذر کرد، شیخ نظام الدین آں را بشیخ عماد سپرد"۔ (اخبار الاخیار ص ۶۶)

کسی تذکرے سے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ حضرت قطب الاقطاب کا یہ قیام کتنا طویل تھا۔ اور آپ کب واپس ہوئے۔ بہر حال یہ ثابت ہے کہ سلطان علاء الدین کے زمانے میں آپ دو دفعہ تشریف لے گئے۔ اور سلطان نے جس قدر نذر نیاز پیش کی۔ آپ نے سب دہلی کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دی۔ یہاں تک کہ ایک پیسہ بھی اہل ملتان کے لئے اپنے پاس نہ رکھا۔ کیونکہ اس شہر کے لئے آپ کی وہاں کی فتوحات کافی تھیں۔

سندھ کا دورہ سندھ حضرت شیخ الاسلام زکریاؒ کے فیوض و برکات سے باقی ممالک کی نسبت زیادہ مستفیض ہوا ہے۔ حضرت شاہ رُکن عالم نے بھی اس ریگزار کو یقیناً کئی بار اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا ہوگا۔ مگر ہمیں تاریخی اسناد سے صرف ایک سفر کا ثبوت مل سکا ہے جو آپ نے حضرت مخدوم لعل شہباز علیہ الرحمۃ کی معیّت میں اختیار فرمایا تھا۔

صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں کہ سندھ میں ایک درویش تھے۔ شیخ ریحان علیہ الرحمۃ۔ ان کی بڑی شہرت تھی۔ حضرت قطب الاقطاب شاہ رُکن عالمؒ قریہ قریہ خلقِ خدا کو صراط المستقیم پر گامزن کرتے جب سندھ میں پہنچے تو آپ نے لوگوں کی

زبانی ان کے زہد و ورع اور مشغولیت کی تعریف سنی۔ جس پر یہ دونوں اقطاب دیدار شیخ ریحان کو ملنے تشریف لے گئے۔ وہ ایک جنگل میں مصروفِ عبادت تھے۔ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک عارفانہ گفتگو کرتے رہے۔

شیخ بوسنؒ

سندھ میں شیخ بوسنؒ نام حضرت شیخ الاسلام زکریاؒ کا ایک مرید رہتا تھا۔ جب حضرت قطب الاقطابؒ سندھ میں تشریف لے گئے تو آپ نے اس درویش کا پتہ کرایا۔ اُن دنوں شیخ بوسنؒ کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے صاحبزادے مُلّا نصیر اور مُلّا امام اطلاع پا کر حاضر ہو گئے اور خدمتِ عالیہ میں رہنے لگے۔ حضرت قطب الاقطابؒ ان کے زہد و ورع اور دینداری سے اتنے خوش ہوئے کہ انہیں اپنے ہمراہ ملتان لے آئے۔

دونوں مُلّا صاحبان حضرت قطب الاقطاب کے حاضر باش غلام تھے۔ انہوں نے حضرت کے سایۂ ہما پایہ میں رہ کر دین و دُنیا کی سعادتیں حاصل کیں اور دُنیائے تصوف میں بڑا درجہ پایا۔ مُلّا امام کی قبر حضرت شیخ الاسلام رحؒ کی خانقاہ میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ مُلّا نصیر بھی یہیں کہیں دفن ہوں گے۔ ان کی اولاد تحصیل ملتان میں آباد ہے۔

جوئیہ قوم کا قبول اسلام ملتان شہر میں سید محمد زندہ پیر نام ایک قفالی بزرگ رہتے تھے۔ حضرت قطب الاقطاب سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ ایک دفعہ حضرت نے ان کے ہمراہ کہروڑ کا سفر کیا۔ اس زمانے میں یہ شہر ویران ہو چکا تھا اور جوئیہ قوم اس کے گرد و پیش اچھے اچھے مکانات میں آباد تھی۔ چونکہ قدیم کھنڈر آبادی کے درمیان واقع تھا۔ اس لئے ان بزرگوں نے اسے قیام کے لئے پسند کیا۔ جوئیہ شرفاء کو ان

بزرگوں کی آمد کا علم ہوا تو وہ دوڑے دوڑے آئے اور ان کی خدمت کرنے لگے حضرت قطب الاقطابؒ نے انہیں اسلام پیش کیا اور وہ بطیب خاطر مسلمان ہو گئے ۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُنہوں نے سر کے بال حضرت سیّد محمد زندہ پیر کے آگے اُتارے، اور چوٹی حضرت قطب الاقطاب کے سامنے منڈوائی ۔ دونوں بزرگوں نے ان کے اسلام لانے پر خوشی کا اظہار کیا اور ان کے حق میں دُعا فرمائی ۔

دہلی کا تیسرا سفر

حضرت قطب الاقطاب کو دہلی سے تشریف لائے بمشکل دو تین برس ہی گزرے تھے کہ دہلی سے متوحش خبریں آنے لگیں ۔ ملک کافور سلطان علاء الدین کا ایک ہندو غلام تھا ۔ جسے بادشاہ نے ایک ہزار دینار سے خریدا تھا ۔ اور وہ اپنی قابلیت کے طفیل سپہ سالار اعظم کے عہدے تک پہنچ گیا ۔۔۔ اس بدبخت نے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کے لئے بادشاہ کو اس قسم کا زہر دیا ، جو نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا رہا ۔ انجام کار یہ عظیم المرتبت شہنشاہ ۶ شوّال ۷۱۶ھ کو دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو انتقال کر گیا ۔

ملک کافورؒ نے ایک جھوٹا وصیت نامہ بنا کر سلطان کے سب سے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو، جس کی عمر بمشکل سات برس کی ہو گی ۔ تخت پر بٹھایا ۔ سلطان مرحوم کے شہزادوں کو گوالیار کے قلعے میں قید کر کے اندھا کر دیا ۔ محل کے محافظوں کو مبارک خاں کے قتل پر مقرر کیا، مگر انہوں نے خود کافور کو ہی قتل کر دیا ۔ قطب الدین مبارک شاہ نے آبائی تخت پر قدم رکھتے ہی اپنے تمام بھائیوں اور بھتیجوں کو تہِ تیغ کرا دیا ۔ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کا بڑا اثر و نفوذ

لہ تذکرۃ الملتان ص ۱۹

تھا۔ تمام امرار حضرت کے مرید تھے۔ سلطان نے ان کے اثر کو مٹانے کے لئے ملتان سے حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم علیہ الرحمۃ کو بلوایا۔ آپ اپنے رفقار کے جلو میں دہلی کو روانہ ہوئے۔ ایک منزل باقی تھی کہ حضرت محبوب الٰہیؒ آکر آپ سے ملے۔ حضرت قطب الاقطابؒ نے بڑھ کر معانقہ کیا۔ اور فرمایا لوگ سمجھتے ہوں گے کہ رکن الدین بادشاہ کی ملاقات کو جا رہا ہے، حالانکہ میں نے تو محض اس شہنشاہِ دین کے لئے چار سو میل کی مسافت طے کی ہے۔ شہنشاہِ ہند نے ملتان کے شہنشاہِ طریقت کا استقبال کیونکر کیا۔ اس کی تفصیل خواجہ احمد ایاز کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں:-

"جب دہلی میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ حضرت شیخ رکن الدین دہلی کے قریب پہنچ گئے ہیں تو بادشاہ نے حکم دیا کہ سب امیر وزیر، شہر کے مشائخ اور علمار حضرت کے استقبال کے لئے شہر کے باہر جائیں۔ میں بھی کل صبح استقبال کے لئے جاؤں گا۔

چنانچہ سب لوگ دوسرے دن صبح شہر کے دروازے کے باہر جمع ہوئے میں بھی اپنے باپ کے ساتھ وہاں گیا۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار تھا اور سب لوگ پیدل تھے۔ یکایک کچھ گھوڑے سامنے آتے دکھائی دیئے۔ ان کے آگے

---

[1] ایک دفعہ سلطان نے حضرت محبوب الٰہی کو لکھا کہ آپ تارکِ دنیا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ آپ کے گھوڑے سونے کی میخوں سے باندھے جاتے ہیں۔ اس کا معقول جواب دیں، ورنہ اپنے دنیاوی کرّ و فر کو لے کر یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے اس خط کی پیشانی پر لکھ دیا۔ کجا اندا ختم در دل، مگر اندا ختم در گل کہ اسپاں برادفاددہے کنند۔ یعنی میں نے سونے کی میخ دل میں تو نہیں گاڑی۔ مٹی میں گاڑی ہے اور گھوڑے اس پر پیشاب کرتے ہیں۔

آگے ایک بزرگ درویش گھوڑے پر سوار آرہے تھے۔ میں نے ان کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کیونکہ میں ان سے ملتان میں مل چکا تھا۔ بادشاہ اپنے گھوڑے سے اترا اور آگے بڑھ کر اُن کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ حضرت قطب الاقطابؒ نے بھی گھوڑے سے اُترنا چاہا۔ مگر بادشاہ نے ان کی رکاب تھام کر کہا۔ آپ کو میرے سر کی قسم! آپ سوار رہیں اور یہ فرمائیں کہ اس شہر سے سب سے پہلے آپکو کون ملا؟ حضرت قطب الاقطاب نے جواب دیا۔ جو شہر میں سب سے اچھا آدمی ہے وہی مجھے سب سے پہلے ملا ہے۔

سلطان نے پھر عرض کیا کہ "دہلی کا سب سے اچھا آدمی کون ہے!"

حضرت نے بلند آواز سے فرمایا۔ "اے لوگو! دہلی میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے، جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہے اور اس کو سارا ہندوستان سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے نام سے جانتا ہے۔"

حضرت کا یہ فقرہ سن کر ہجوم میں اظہارِ ادب و خوشنودی کی ایک گونج پیدا ہوئی اور بادشاہ کا چہرہ متغیّر ہو گیا۔ وہ اپنے دل میں سخت نادم ہوا کہ جس کا زور توڑنے کے لئے میں نے انہیں مدعو کیا تھا یہ خود انہیں سلطان المشائخ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔"

بہر حال سلطان نے دس لاکھ تنکہ[1] بطور نذر پیش کیا اور بڑے ادب و احترام سے شہر میں لے گیا۔ اور خاص محل میں جا کر ٹھہرایا۔ وہ گراں قدر رقم جو حضرت کو نذر

---

[1] فرشتہ کی اصل عبارت یہ ہے۔ "دہ لک تنکہ روز آمدن شکرانہ فرستادے و پنج لک تنکہ بوقت وداع ارسال داشتہ۔ شیخ رکن الدین ہمدر آں روز کہ شکرانہ رسیدے ہمہ صرف خلائق کردے و یک درم و دینار نگزاشتے۔ (ص ۴۷۲)

کے طور پر ملی تھی، سب کی سب اسی روز مساکین اور فقراء میں تقسیم کر دی گئی۔

حضرت قطب الاقطاب دربارِ شاہی میں فرشتہ لکھتا ہے کہ حضرت قطب الاقطاب شاہ رکنِ عالمؒ قطب الدین مبارک شاہ کے عہد میں تین دفعہ دہلی تشریف لائے اکثر اوقات شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ جب بادشاہ کو ملنے کا ارادہ ہوتا، اس روز تختِ رواں پر سوار ہوتے اور مناسب مقام پر تخت کو روکتے تھے، جہاں غرضمند لوگ اپنی اپنی عرضیاں لکھ کر تخت پر ڈال دیتے تھے۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے دیوان کے تین دروازے تھے، دو دروازوں سے آپ تختِ رواں پر سوار ہو کر جاتے تھے، اور تیسرے دروازے پر جو بلند دروازے کے نام سے موسوم تھا، بادشاہ استقبال کو حاضر ہوتا۔ جب حضرت تخت سے اُترتے، بادشاہ لپک کر قدمبوس ہوتا، اور آپ کو ادب و احترام سے دیوانِ خاص میں لے جاتا تھا۔ حضورؒ تختِ شاہی پر رونق افروز ہوتے اور بادشاہ آپ کے سامنے مریدانہ عقیدت سے دوزانو ہو کر بیٹھتا۔ اور تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا۔ اُس وقت حضرت کا ملازم خاص اشارہ پا کر مخلوقات کی درخواستوں کا پشتارہ لا کر بادشاہ کے آگے رکھ دیتا۔ بادشاہ ایک ایک درخواست کو غور سے پڑھتا اور اس کی پیشانی پر سائل کے مدعا کے مطابق جواب لکھتا تھا۔ اور ارکانِ دولت حکمِ شاہی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ جب عوام کی درخواستوں کا تصفیہ ہو جاتا تو حضرت اپنی قیام گاہ کو تشریف لے جاتے تھے۔[۱]

مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ حضرت

۱؎ فرشتہ صد ۷۷۳، ۷۷۴

قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ اور آپ کے باپ دادا کے مرید پنجاب سے لے کر قندھار تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور تقریباً آٹھ سو خانقاہیں آپ کے زیر اثر اور زیر حکم تھیں۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے یہ سوچ کر کہ جب آپ دہلی میں آئیں گے، تمام خلائق کا رجوع آپ کی طرف ہو جائے گا۔ اور سلطان المشائخ کا زور ٹوٹ جائے گا۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنا زیادہ وقت محبوب الٰہی کی صحبت میں گزارنا اور کمال احترام سے پیش آنا بڑے جگر کا کام ہے اور یہ حضرت شاہ رکن عالم کی جرأت ایمانی اور رفعت روحانی کا بڑا ثبوت ہے[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ اب تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت شاہ رُکن عالمؒ نے اپنے تعلقات اہلِ حکومت سے کیسے خوشگوار رکھے، آپ کے تعلقات کا مقصد یہ تھا کہ

۱۔ اہلِ حکومت کی اصلاحِ حال جس حد تک ممکن ہو کرتے رہیں۔

۲۔ خلق اللہ کی حاجت روائی کا ذریعہ بنے رہیں۔

۳۔ اگر اہلِ حکومت کو دوسرے اولیاء اللہ سے عناد ہو تو اسے ممکن حد تک کم کریں اور خود اولیاء اللہ کے پشت پناہ بنے رہیں۔

دراصل آپ کا عمل اس فرمانِ نبوی پر تھا جسے ابو الدرداءؓ نے روایت کیا ہے۔

"جو شخص اپنی ضرورت حاکم تک نہ پہنچا سکتا ہو۔ اس کی درخواست وہاں تک پہنچانے والے کا اجر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس دن اُسے ثابت قدم رکھے گا جس دن قدموں میں لغزش پیدا ہوگی!"

یہ اتنی بڑی خدمت ہے جو بڑی سے بڑی عبادت کی صف میں رکھی جاسکتی ہے

[1] آستانہ زکریا۔ ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء ص ۱۱

اسی خدمتِ خلق کے جذبے سے آپ نے سلاطین و اہلِ حکومت سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھے۔[1]

حضرت شاہ رکن عالمؒ سلطان قطب الدین مبارک شاہؒ کے زمانے میں تین مرتبہ دہلی تشریف لے گئے تھے، اور ہر بار آپ کا مقصد سلطان کی اصلاح اور خلقِ خدا کی وکالت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواری نے آپ کے مریدوں کے حلقے کو پنجاب سے قندھار تک محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ رکن عالمؒ کے زمانے میں آپ کے مرید جاوا، سماٹرا سے مصر تک پھیل چکے تھے۔ سید جلال سلہٹی سہروردی درویشوں کی معیت میں ۷۰۳ھ میں سلہٹ فتح کر چکے تھے۔ ۷۲۰ھ کے قریب جب حضرت قطب الاقطابؒ دہلی تشریف لائے تھے، مشرقی بنگال میں سہروردی مشائخ کا طوطی بول رہا تھا اور جگہ جگہ ان کی کالونیاں بن چکی تھیں، مصر اور دمشق میں مولانا عراقیؒ کے لاکھوں مرید تھے۔ یمن میں فقیہ بصال قطب عدن، شوکارہ میں شیخ قوام الدین، ہرات میں میر حسینی اور سندھ کا سارا صوبہ آپ کے ارادتمندوں سے پٹا پڑا تھا۔ اگر کوئی اور درویش حضرت کی جگہ ہوتا تو وہ سلطان کی گرفت سے ہرگز نہ بچ سکتا۔ وہ آپ کی روحانی عظمت کو تو کیا پہچانتا، جبکہ وہ حضرت محبوبِ الٰہی جیسے شہنشاہِ دین کو بھی ایک دکاندار جانتا تھا۔ البتہ آپ کی سیاسی طاقت کا اسے پوری طرح اندازہ تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اگر ملتان اور سندھ جیسے دور دراز صوبوں میں ایک دفعہ بغاوت کی وبا پھوٹ پڑی تو اس سے دہلی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ اس لئے اس نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ حضرت قطب الاقطاب کو

[1] آستانۂ زکریا۔ ماہ جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۱۳، ۱۴

ہر حالت میں راضی رکھا جائے۔ اس کا سارا ادب و احترام اسی وجہ سے تھا بہرحال حضرت شاہ رکن عالم نے اس کی خشونت اور تلوّن مزاجی کی کوئی پرواہ نہ کی، وہ اس کے زمانے میں کئی بار دہلی گئے۔ خلق خدا کی وکالت کی۔ ہزاروں غرضمندوں کی درخواستوں کو بادشاہ کے ملاحظہ سے گزار کر مناسب احکامات لکھوائے، دہلی کے لاکھوں محتاجوں اور مسکینوں کو اپنی داد و دہش سے مالامال کیا۔ اور لاکھوں سائلوں اور درویشوں کے سایہ میں بخیریت ملتان واپس تشریف لے آئے، گویا

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے!

سلطان غیاث الدین تغلق

حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم جب تک دہلی میں رہے، سلطان قطب الدین مبارک شاہ حضرت محبوب الٰہی کے بارے میں خاموش رہا اور جب آپ ملتان واپس تشریف لے آئے، تو اس نے اپنی پہلی سی گستاخانہ حرکتیں شروع کر دیں۔ آپ کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کرنا چاہتا تھا کہ ۵ ربیع الاول ۷۲۱ھ کی رات کو اپنے نومسلم غلام خسرو خاں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

خسرو خاں گجرات کا ہندو تھا۔ اس نے سلطان کو دھوکہ دینے کے لیے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رکھا تھا۔ لیکن باطن میں وہ سخت کٹر ہندو تھا، سلطان کو قتل کرنے کے بعد اس نے تخت کے تمام وارثوں کو ٹھکانے لگا دیا اور خود بادشاہ

بن بیٹھا۔ ہندو، جو تین چار سو برس سے دبے ہوئے تھے۔ اُبھر آئے اور انہوں نے مسلمانوں پر تشدد کرنا شروع کیا۔ مسجدیں جلائی گئیں۔ قرآن پھاڑے گئے ان دنوں کشلو خاں[1] آبیہ ملتان کی صوبیداری پر تعینات تھا۔ اور دیپال پور کی نظامت ملک غازی تغلق سے متعلق تھی۔ انہوں نے اتفاق کر کے خسرو خان کو قتل کر دیا۔ ملک غازی تغلق نے امرائے سلطنت کو جمع کر کے کہا۔

"صاحبو! میں نے اپنے آقا کا انتقام لے لیا ہے۔ اب آپ لوگ جس کو چاہیں دہلی کے تخت پر بٹھائیں، مجھے حکومت کی ہوس نہیں ہے"

امرائے سلطنت نے بالاتفاق کہا کہ سلطان علاء الدین کی اولاد میں سے کوئی زندہ نہیں رہا۔ اب آپ سے زیادہ تخت کا اور کوئی مستحق نہیں ہے۔ چنانچہ ملک غازی سلطان غیاث الدین کے نام سے تخت نشین ہوا۔ یہ حد درجہ معتدل مزاج حکمران تھا اور افراط و تفریط سے ہٹ کر ایک مناسب رائے تمام امور میں قائم کیا کرتا تھا کارکن امراء کی اس نے عزت افزائی کی، اور ناکارہ لوگوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔ الغرض سلطنت کے تمام امور ایک ہفتہ کے اندر ٹھیک ٹھاک ہو گئے۔ اس کے دور میں ملک کشلو خاں آبیہ حسب سابق ملتان کی گورنری پر فائز رہا۔

سلطان غیاث الدین تغلق[2] جب اپنے وطن سے اس ملک میں وارد ہوا تھا تو اس نے ملتان میں سکونت اختیار کی تھی۔ ملتان کا وہ محلہ جس میں تغلق آباد ہوا تھا اب بھی کوٹلہ تغلق خاں سے موسوم ہے۔

سلطان جن دنوں دیپال پور میں بطور گورنر تعینات تھا اس نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ فرما رہے ہیں کہ میرے مقبرہ

---

[1] خسرو خاں [2] ملحقات میں درج ہے کہ تغلق اصل میں قتلغ تھا ترکی لفظ تھا ہندیوں نے اسے مقلوب کر کے تغلق بنا دیا

سے جانب غرب دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک مقبرہ تعمیر کرو۔ چنانچہ سلطان نے اپنی جاگیر کی آمدنی سے قلعہ قدیم پر عالی شان مقبرہ تعمیر کرایا، جو اب تک سر اٹھائے عوام سے خراج عقیدت حاصل کرتا نظر آتا ہے۔

حضرت قطب الاقطاب کا دہلی کا آخری سفر

حضرت قطب الاقطابؒ غیاث الدین تغلق کی دعوت پر بمعیت سلطان التارکین حمید الدین حاکمؒ اور مخدوم جہانیاںؒ دہلی تشریف لے گئے۔ یہ آپ کا آخری سفر تھا۔ اور کافی عرصہ دہلی میں مقیم رہے۔ سلطان ان دنوں بنگالے میں تھا۔ کسی نے اُسے حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلاف بہکایا، کہ جوناخان ہر وقت ان کے پاس رہتا ہے اور آپ کے خلاف سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو لکھا کہ

"دو بادشاہ در یک اقلیمے نمی گنجند"

یعنی دو بادشاہ ایک ولایت میں نہیں سما سکتے۔ اس لئے مناسب ہے کہ آپ دہلی سے نکل جائیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اسی پروانے پر لکھوا دیا۔ ع

ہنوز دہلی دُور است

یعنی آپ دہلی تو آئیں۔ ابھی دہلی کافی دُور ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کو دہلی میں داخل ہونا نصیب نہیں ہوگا۔

بادشاہ کی آمد آمد ہوئی اور وہ ربیع الاوّل ۷۲۵ھ کے آغاز میں افغان پور پہنچا، اور جوناخان کے بنوائے ہوئے نئے محل میں اکابر امرار کے ساتھ دعوت طعام میں شریک ہوا۔ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو حضرت شاہ رکن عالمؒ عصر کی نماز پڑھنے

کے لئے محل سے نکل آئے۔ ولی عہد نے نذر کے ہاتھی منگائے۔ چونکہ مکان نیا تھا اور اس میں فرش بھی لکڑی کا تھا۔ جونہی کئی ہاتھی محل کے اندر آئے فرش دب گیا اور چوبی محل بیکایک گر پڑا۔ بادشاہ اپنے تمام امرار کے ساتھ دب کر مر گیا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کو اس حادثے کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کی مشیّت انسانی ارادوں پر غالب رہتی ہے۔ بادشاہ بہت اچھا آدمی تھا۔ اس کے دل میں شریعت کا ادب تھا، اور وہ رعایا کی آسائش کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ ۱۸ ربیع الاوّل ۷۲۵ھ کو حضرت محبوب الٰہیؒ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حضرت شاہ رُکنِ عالمؒ نے جنازہ کی نماز پڑھائی، اور فرمایا۔ آج مجھے پتہ چلا کہ اتنا عرصہ مجھے دہلی میں کیوں ٹھہرایا گیا تھا۔

امیر خسروؒ کی وفات

حضرت امیر خسروؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے محبوب مرید اور نامور خلیفہ تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے سرائیکی میں تصرّف کر کے اردو زبان کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے اکثر اشعار میں اپنے شیخ کے ہجر و فراق پر حزن و ملال کا اظہار کیا ہے۔ وہ جب کبھی شاہی لشکر کے ساتھ کسی مہم پر جاتے، شیخ کی یاد میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے اور درد انگیز اشعار کہتے تھے۔ مثلاً ؎

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کسے پڑی ہے جو جا سُنائے پیارے پی کو ہماری بتیاں

ترجمہ:۔ اگر میں اپنے محبوب کو نہ دیکھوں تو اندھیری راتیں کیسے کاٹوں۔ کسے غرض پڑی ہے کہ میرے محبوب کو میری غم انگیز کیفیت جا کر سنائے۔

؎ نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آئیں نہ بھیجیں بتیاں

ترجمہ:- اب حالت یہ ہے کہ نہ آنکھوں میں نیند ہے، نہ بدن کو چین۔ نہ آپ آتے ہیں اور نہ ہی کوئی خط بھیجتے ہیں!

ے وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنار
آپ پار اُتر گئے ہم تو رہے اُروار

ترجمہ:- وہ دیکھئے، میرا محبوب جا رہا ہے، ندی کے کنارے کنارے۔ آپ تو دریا کے پار چلے گئے۔ اور ہم اِدھر کے اِدھر ہی رہے!

ے بھائی رے ملّا، جو ہم کو پار اُتار
ہاتھ کا دیووں گی مندرا گل کا دیواں ہار

ترجمہ:- ارے بھائی ملاح! اگر تو ہمیں پار لے جائے، تو میں تجھے ہاتھ کی انگوٹھی اور گلے کا ہار انعام میں دوں!

ے چکوا چکوی دو جنے ان کو مارو نہ کو
او مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہو[1]

ترجمہ:- اے لوگو! چکوا چکوی دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہیں، انہیں کچھ نہ کہو، یہ عشق کے کشتہ ہیں۔ انہیں آزار پہنچانے سے گھر سے بے گھر ہونا پڑتا ہے!

حضرت امیر خسروؒ ۷۲۴ھ میں سلطان غیاث الدین کے ہمراہ بنگالہ کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ بادشاہ تو آ گیا، مگر اُنہیں حاکمِ بنگالہ نے روک لیا۔ جب آپ کے پیر و مرشد حضرت محبوب الٰہی کا انتقال ہُوا تو آپ بنگال ہی میں تھے۔ وہیں آپ کو پیرِ طریقت کے وصال کی خبر ملی۔ اُسی وقت بے سرو سامانی کی حالت میں دہلی کو چل پڑے۔ افتاں و خیزاں دیوانہ وار مسافتِ بعید طے کرنے کے بعد جب

[1] گئے، پار، اُروار، مندرا، گل، ڈیواں، ہار، جنے، بچھوڑی (بچھوڑی) خالص سرائیکی کے الفاظ ہیں۔

دہلی پہنچے۔ اور حضرت محبوب الٰہی کے مزار مبارک کی طرف جانے لگے تو حضرت کے خلفاء اور مریدوں نے روک دیا۔ آپ اسی جگہ جہاں اب ان کا مزار ہے کھڑے ہو گئے، وہاں کیوڑے کے پودے لگے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک پودے کی ڈالی پکڑی اور فرمایا ؎

سُن رے کھیوڑے گانٹھ گٹھیلے میں توڑوں تیری ڈار
تجھ تلے میرا پیہو سوئے، تُو نے دی نہ پُکار !

ترجمہ:۔ اے گانٹھوں والے کیوڑے! میں تیری ڈالیاں توڑ ڈالوں! میرا محبوب تیرے سائے میں پڑا سویا کیا، مگر تُو نے مجھے خبر نہ کی!

کہتے ہیں حضرت محبوب الٰہی کے جنازہ کو لحد میں اتارنے سے پہلے اسی کیوڑے کے سائے میں رکھا گیا تھا۔ حضرت امیر اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے سوزِ دروں کا اظہار فرماتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ دیر تک امیر خسروؒ وہیں کھڑے گریہ و زاری کرتے رہے۔ پھر اپنے سر کے بال کٹوا ڈالے، سرتاپا سیاہ ماتمی لباس پہنا۔ اور تمام مال و متاع مرشد کے نام پر لٹا دیا۔ احباب صبر کی تلقین کرنے کے لئے جمع ہوئے تو فرمایا:۔

"بھائیو! میری کیا ہستی ہے کہ ایسے دو جہاں کے بادشاہ کے لئے روؤں، میں تو خود اپنے لئے روتا ہوں۔ کیونکہ میں حضور سلطان المشائخ کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔"

پھر مزارِ پُر انوار کی طرف منہ کر کے کہا:۔

"سُبحان اللہ! آفتاب زیرِ زمیں نہاں ہو اور خسروؔ زندہ رہے!"

اس کے بعد بے تحاشا یہ شعر پڑھا اور جاں بحق تسلیم ہو گئے ؎

گوری سوئے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسروؒ گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

ترجمہ:۔ محبوب بستر عیش پر محو خواب ہے۔ اور اس نے منہ پر کپڑا ڈال لیا ہے
اے خسرو! چل اپنے گھر کو چلیں، اب چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی دکھائی دیتی
ہے!"

یہ حادثہ ۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو وقوع میں آیا۔ یعنی پورے چھ ماہ بعد حضرت امیر خسروؒ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ بلاشبہ تمام صورتیں وحدت مطلقہ میں سے ابھرتی اور پھر عالم معنیٰ میں واپس چلی جاتی ہیں ؎

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد انا الیہ راجعون

حضرت قطب الاقطابؒ کو ملتان سے آئے کافی عرصہ گزر چکا تھا، ملتان کے لوگ بے چین تھے۔ اور آپ کو واپسی کے لئے خط پر خط مل رہے تھے مگر آپ خاموش تھے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت قطب الاقطابؒ کو سلطان المشائخؒ کی طرف سے اس امر کا کوئی باطنی اشارہ ہو چکا تھا کہ میرا ترکؒ[1] آرہا ہے۔ اس کا جنازہ پڑھ کر ہی جائیو۔ چنانچہ جب آپ کو امیر خسروؒ کے انتقال کی اطلاع ملی، آپ مع مریدوں سمیت تشریف لائے، اور جنازہ پڑھ کر اس کشتۂ محبت کو حضرت محبوب الٰہی کے قدموں میں سپرد خاک کر دیا۔ اِس واقعہ کے تھوڑا عرصہ بعد حضرت قطب الاقطابؒ ملتان کو روانہ ہوئے۔

[1] حیات خسروؒ ص ۶۴

سلطان محمد تغلق

سلطان غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا ولی عہد جونا خان، سلطان محمد تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر دہلی کی بجائے دولت آباد کو دارالسلطنت مقرر کیا۔ اور حکم دیا کہ دہلی اور ملتان کے نصف باشندے اس شہر میں منتقل ہو جائیں۔

کشلو خاں گورنر ملتان کو جب یہ حکم پہنچا، تو اس نے قاضی شہر مولانا کریم الدین سے اس امر میں مشورہ لیا۔ انہوں نے فرمایا، کہ شریعت بغیر کسی معقول وجہ کے کسی کو آبائی مکانات سے نکالنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ انہی ایام میں سلطان کے بھانجے ملک بہاء الدین اور شاہ بنگال ملک غیاث الدین بورا کی بھس بھری کھالیں بغرض تشہیر ملتان پہنچیں، تو کشلو خاں کو یہ امر بھی شاق گذرا اور اس نے دونوں امراء کی کھالوں کو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے جوار میں دفن کرا دیا۔ کشلو خاں بڑا صاحب اقتدار امیر تھا۔ اگر سلطان غیاث الدین کو اس کی امداد نہ ملتی تو خسرو خاں کا فتنہ فرو نہ ہوتا۔ اس لئے اُسے توقع تھی کہ سلطان کو جب صورت حال سمجھاؤں گا تو وہ محسوس نہیں کرے گا۔ لیکن جب یہ اطلاع سلطان محمد تغلق کو ملی تو اسے کشلو خاں کی یہ جسارت سخت شاق گذری۔ اس نے سوچا کہ اس شخص نے میرے والد کی مدد کی ہے اور اپنے آپ کو امراء سے اونچی سطح پر سمجھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت بغاوت کر دے، اس لئے مناسب ہے کہ اس کی طاقت توڑ دی جائے۔ اس نے ایک عام فرمان کے ذریعے سلطنت کے تمام امراء کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے اہل و عیال دولت آباد بھیج دیں اور یہاں

رہائشی مکانات تعمیر کریں۔ ساتھ ہی اس نے باغی امراء کی کھالوں کی تدفین کے سلسلہ میں کشلو خاں کے نام طلبی کا فرمان جاری کیا۔

کشلو خاں سلطان کی سیرت سے واقف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر میں دولت آباد گیا، تو سلطان سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے اس نے دولت آباد جانے سے انکار کر دیا۔ سلطان نے اپنا ایک افسر علی نام ملتان روانہ کیا کہ، وہ کشلو خاں کو دولت آباد میں مکانات تعمیر کرنے پر آمادہ کرے، جیسا کہ محصلین کا دستور ہے۔ اس نے کشلو خاں پر تشدد کیا اور تہدید و وعید کے الفاظ استعمال کرنے شروع کئے۔

ایک دن کشلو خان کا داماد محل سے نکل کر دیوانِ خاص کو جا رہا تھا کہ علی نے اُسے ٹوک کر کہا کہ

"تم اپنے اہل و عیال دولت آباد کیوں نہیں بھیجتے؟ معلوم ہوتا ہے، کہ تمہارے دل میں حرام زدگی ہے"۔

اُس نے کہا کہ "حرام زادہ کس کو کہتے ہیں؟"۔

علی نے کہا کہ "حرام زادہ وہ ہے جو گھر میں بیٹھ رہے۔ اور احکامِ شاہی کی تعمیل نہ کرے"۔

غرض اس طرح اُن میں جھگڑا بڑھ گیا اور علی نے کشلو خاں کے داماد کے بال پکڑ کر چند گھونسے لگائے۔ اس نے اپنے بال چھوڑا کر علی کو نیچے پٹخ دیا۔ ایک سپاہی پاس کھڑا تھا اُسے کہا

"کھڑے کیا دیکھتے ہو، مارو اس حرام زادے کو!"

چنانچہ اُس نے تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ علی کا سر کٹ، کر دُور جا پڑا۔ جب

کشلو خاں نے یہ حال دیکھا تو وہ سلطان کے قہر و غضب سے ڈر گیا۔ اور سوائے بغاوت کے اُسے اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ اُس نے لشکر کو آراستہ کیا، اور بے شمار ترک، افغان، خراسانی اور بلوچ فوج میں بھرتی کر لئے۔

ملتان میں قتلِ عام

سلطان محمد کو پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں، وہ اپنے افسر کے مارے جانے کی خبر سُن کر برہم ہو گیا۔ اور گھٹا کی طرح گرجتا برستا ملتان کو روانہ ہوا۔ ابوہر کے مقام پر سلطان اور کشلو خاں کے درمیان خونریز جنگ ہوئی۔ سلطان نے ایک امیر کو اپنی جگہ ہاتھی پر سوار کر کے فوج کے ساتھ لڑنے بھیجا۔ اور خود چار ہزار سپاہ لے کر جدا ہو گیا۔ کشلو خاں کے آدمیوں کو یہ دھوکہ ہوا کہ چترِ شاہی کے نیچے سلطان ہے اور وہی فوج کی کمان کر رہا ہے۔ وہ یکدم اس جانب ٹوٹ پڑے اور اس امیر کو قتل کر ڈالا اور یہ سمجھے کہ ہم نے سلطان کو قتل کر دیا ہے۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ سلطان مارا گیا ہے تو کشلو خان کا سارا لشکر مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گیا، اور انہوں نے اپنے سپہ سالار کو چھوڑ دیا۔ اب سلطان کمین گاہ سے شیرِ غرّاں کی طرح ڈکارتا ہوا نکلا اور اس نے کشلو خاں اور اس کے ساتھیوں کو قیمہ کر کے رکھ دیا۔ اہلِ ملتان میں بھگدڑ مچ گئی، اور وہ سب اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگ گئے۔

سلطان غیظ و غضب کے اس عالم میں شعلۂ جوالہ بنا ملتان کی طرف بڑھا شہر میں داخل ہوتے ہی اُس نے قاضی کریم الدین کو طلب کیا اور اس کی زندہ کھال کھچوائی۔ وہ جوانمرد بڑے صبر و استقلال سے خاموش بیٹھا رہا اور اُف تک نہ کی۔ اس کے بعد کشلو خان کے سر کو شہر کے دروازے پر آویزاں کرایا اور حکم دیا کہ اہلِ ملتان

کے خون سے نہریں بہا دو۔ چنانچہ قتلِ عام شروع ہو گیا۔

سلطانِ عالم! از خونِ ناحق دست بکش!

حضرت قطب الاقطابؒ ان دنوں اعتکاف میں تھے۔ جب اہلِ ملتان گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے تو لوگ بے تحاشا آستانۂ عالیہ کی طرف بھاگے۔ ہر شخص آپ کا نام لے لے کر فریاد کرنے لگا اور حجرے کے گرد و پیش قیامت برپا ہو گئی۔ حضرت یہ شور سن کر باہر نکلے۔ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ بادشاہ کشلو خاں کے رفیقوں، ساتھیوں اور حمایتیوں کو چن چن کر قتل کرا رہا ہے، تو آپ جس حالت میں حجرے سے برآمد ہوئے تھے۔ اسی طرح سلطان کے دربار کی طرف دوڑے۔ لوگوں نے دیکھا، ملتان شہر نے دیکھا، قلعے کے در و دیوار نے دیکھا کہ زمانے کا وہ قطب الاقطاب جو تختِ رواں کے بغیر کہیں نہیں جاتا، جو گھر سے نکلتا ہے تو سلطان التارکین حمید الدین حاکم اور مخدوم جہانیاں جیسے بے شمار مشائخ جلو میں چلتے ہیں اور ہزاروں نگاہیں ادب و احترام سے قدموں میں بچھ جاتی ہیں، اس وقت وہی رجلِ عظیم، ننگے سر، ننگے پاؤں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اڑا جا رہا ہے۔ آنکھیں وفورِ غم سے پھٹی ہوئی ہیں، اعضا میں کپکپاہٹ ہے، اضطرار اور اضطراب کے اس عالم میں اس عزم و ارادہ سے کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا جاں رسد بجاناں، یا جاں ز تن بر آید

قطب الاقطاب شاہی دربار میں پہنچ گئے۔ سلطان غیظ و غضب میں لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس نے تہیّہ کر رکھا تھا کہ جنہوں نے میرے مقابلے میں تلوار اٹھائی ہے آج میں ان کی لاشوں سے ملتان کے گلی کوچوں کو بھر دوں گا۔ اس معاملے میں وہ کسی

کی سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن جب حضرت کو ننگے پاؤں اور ننگے سر اپنی طرف بڑھتے دیکھا، تو وہ آپ کی جلالتِ قدر کے آگے جھک گیا۔ سفارش منظور ہوئی اور سلطان نے اُسی وقت تلوار نیام میں لے لی۔ سالارِ اعظم خواجہ کبیر کو حکم ہوا، کہ قتلِ عام روک دو اور جتنے قیدی گرفتار ہو چکے ہیں ان سب کو رہا کر دو۔ چنانچہ ہر طرف الامان، الامان کی صدا بلند ہوئی۔ سپاہیوں کی تلواریں جہاں اُٹھی تھیں وہیں رُک گئیں اور پل کے پل میں امن قائم ہو گیا۔ عصامی کہتا ہے ؎

ابو الفتح شیخ فرماں رکن دیں		مگر بُد دراں ہفتہ عزلت گزیں

اپنے زمانے کے بہت بڑے ولی ابو الفتح حضرت قطب الاقطاب رکن الدین والعالم قدس سرہٗ ان دنوں اعتکاف میں تھے۔

چوں بشنید در شہر طوفانِ خوں		برہنہ سر و پائے آمد بروں

جونہی سنا کہ شہر میں قتلِ عام ہو رہا ہے۔ حضرت ننگے سر اور ننگے پاؤں حجرہ سے باہر نکل آئے

کشادہ زبانِ شفاعت گری		ہمے گفت شاہا جہاں پروری

شفاعت کی غرض سے بادشاہ کی خدمت میں اس طرح کہنا شروع کیا کہ اے جہاں پرور شہنشاہ!

بسے خوں فشاندی دریں بوم و بر		ز تیغت گرفتہ جہاں خون تر

اس ملک میں آپ نے بڑا خون بہایا ہے، اور آپ کی تلوار سے دنیا لہو لہان ہو گئی ہے

برا اہلِ گنہ نزد اہلِ صفا		پسندیدہ تر ہست عفو از جزا

اہلِ صفا نے ہمیشہ گناہگاروں سے انتقام لینے کی بجائے ان سے درگذر زیادہ پسند کیا ہے

کنوں دست دار از سیاست گری		چو شد نوبتِ عفو و رحم آوری

چونکہ اب رحم کرنے اور خلقِ خدا کو معاف کرنے کا وقت آگیا ہے اس لئے قتل و غارت بند کیجئے!

چو بشنید آں شاہِ آفاق گیر		شد از شیخ مشفق شفاعت پذیر

جب دُنیا کو مسخر کرنے والے اس بادشاہ نے شفیق بزرگ سے یہ فقرات سُنے تو وہ بڑا متاثر ہُوا

کبیرِ نکو نام را گفت شاہ　　　　که دارند دستے ز اہلِ گناہ

نیک نام کبیرؔ سے بادشاہ نے فرمایا، کہ قصور واروں کو قتل کرنا بند کر دیا جائے۔

ببرّند بندِ اسیراں تمام
گذارند مرغانِ عاجز زدام

اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جائے

عصامی حضرت قطب الاقطابؒ کا معاصر ہے۔ اس نے اپنی منظوم تاریخ میں ملتان کے ہنگامہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، یہ اس کا مشاہدہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دَورِ تغلق میں حضرت قطب الاقطابؒ ہی ایسے بزرگ تھے جو نوع انسانی کی تربیت بھی فرماتے تھے اور خطرے کے وقت سینہ سپر ہو کر اہلِ ملتان کو ارضی و سماوی آفات سے بھی بچا لیتے تھے۔ بلاشبہ ؎

عظمتوں کا فسانہ تھے یہ لوگ
یادگارِ زمانہ تھے یہ لوگ

الغرض سلطان آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔ حضرت قطب الاقطابؒ شاہ رکن عالم علیہ الرحمۃ کی نہ صرف سفارش قبول کی، بلکہ اپنے باپ کا تعمیر کردہ فقید المثال پُرشوکت مقبرہ اور سَو دیہات بھی نذر کر گیا۔ حضرت نے مقبرہ تو شیخ الاسلامؒ کے شہرۂ آفاق مدرسہ بہائیہ کی تحویل میں دے دیا اور اراضی اپنے مستحق مریدوں میں تقسیم کر دی۔ حضرت کے تذکرہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس رقبے میں سے معقول اراضی اپنے مخلص مریدوں مُلّا نصیر اور مُلّا امام کو مرحمت کی تھی، جو مُلّا بوسن سندھی کے صاحبزادے تھے۔ اب ان کی اولاد نے ان

اراضیات میں بوسن نام سے دو گاؤں آباد کر لئے ہیں جو ملتان سے شمالی جانب واقع ہیں۔

ابن بطوطہ ملتان میں ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کے دور کا بہت بڑا مسلمان مؤرخ ہے۔ وہ ۷۳۴ھ میں براستہ اُچ ملتان پہنچا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ شہر (ملتان) صوبہ سندھ کا صدر مقام ہے، اور اس صوبہ کا امیر الامرا یہاں رہتا ہے۔ ملتان سے دس کوس اس طرف ایک دریا[1] عبور کرنا پڑتا ہے۔ جو بہت گہرا اور دشوار گزار ہے۔ کشتیوں کے سوا آر پار جانا ناممکن ہے۔ یہاں مسافروں سے پوچھ گچھ ہوتی ہے اور ان کے اسباب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ قانون کے مطابق ہر تاجر کو اپنے مال کا چوتھائی حصہ محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر گھوڑے کے سات دینار الگ دینے پڑتے ہیں۔ دو سال بعد جب میں پھر ملتان آیا۔ تو یہ محصول معاف ہو چکا تھا۔

عربوں کی حکومت کے زمانے میں عشر و زکوٰۃ کے سوا اور کوئی محصول نہ تھا۔ پہلے پہل تو میں اپنے مال و اسباب کی تلاشی سے ڈرا کیونکہ میرے اسباب میں قابل محصول چیزیں تو کم تھیں لیکن ان کا حجم زیادہ تھا، اور مجھے اندیشہ تھا کہ اگر سب مال کھولنا پڑا تو بڑی دقت کا سامنا ہو گا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ قطب الملک نے ملتان سے ایک فوجی افسر کے ہاتھ یہ پیغام بھیج دیا کہ میرا مال و اسباب کھولا نہ جائے، اور مجھ سے کوئی محصول وغیرہ نہ لیا جائے۔ ہم رات بھر دریا کے کنارے مقیم

---

[1] اُس زمانے میں ملتان اور سرور شکوٹ (کوٹ سرور شاہ) کے درمیان دریائے بیاس بہتا تھا۔ موسم گرما میں اس کا پاٹ بڑھ جاتا تھا۔ سوائے کشتیوں کے اس کا عبور ناممکن ہو جاتا تھا۔ بعد میں اس نے رُخ تبدیل کر لیا۔

رہے۔ صبح کے وقت ایک شخص جسے لوگ دہقان سمرقندی کہتے تھے۔ میرے پاس آیا۔ یہ شخص بادشاہ کا وقائع نگار تھا۔ میں اس کی ہمراہی میں حاکم دربار میں حاضر ہونے کے لئے ملتان روانہ ہوا۔

گورنر ملتان کا دربار

قطب الملک حاکم وقت ایک ذی شان اور قابل سردار تھا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا۔ تو وہ میری تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے مجھے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ میں نے بطور تحفہ ایک غلام، ایک گھوڑا کچھ کشمش اور بادام نذر کئے۔ کشمش اور بادام یہاں پیدا نہیں ہوتے اور علاقہ خراسان سے آتے ہیں۔

امیر مذکور ایک خوشنما چبوترے پر بیٹھا تھا۔ جس پر ایک گراں بہا قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کے پاس قاضی شہر جس کا نام سالار تھا (غالباً سالار شہر سے کوتوال شہر مراد ہے) اور خطیب جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا، دونوں بیٹھے تھے۔ پیچھے افسران فوج دست بستہ کھڑے تھے اور پہرے دار سپاہی بھی موجود تھے۔ سامنے سے کل فوج گزر رہی تھی۔ قریب ہی کچھ تیر بھی رکھے تھے۔ دیوار پر ایک ڈھول لٹک رہا تھا اور چوگان کا گیند بھی پڑا تھا۔ سپاہی تیر اندازی، نیزہ بازی اور چوگان بازی کا کمال دکھاتے اور انعام پاتے تھے۔

ہمیں حکم ملا کہ ہم حضرت شیخ رکن عالم رحمتہ اللہ علیہ کے مہمان خانہ میں قیام کریں چونکہ یہ آستان قدسی نشان قلعہ کے اندر واقع تھا۔ اس لئے غیر ملک کا کوئی مسافر بلا اجازت اس درگاہ میں بطور مہمان ٹھہر نہیں سکتا تھا۔

ابن بطوطہ کے بیان سے حسب ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:۔

۱۔ سلطان محمد تغلق کے دور میں دریائے بیاس سرور ششکوٹ کے پاس سے ہو کر

گزرتا تھا اور یہاں ملتان شہر کی چونگی تھی۔
۲۔ تجارت کے مال پر ۲۵ فی صدی محصول لیا جاتا تھا۔
۳۔ اہلِ علم اور شاہی مہمانوں سے محصول نہیں لیا جاتا تھا۔
۴۔ ملتان میں سلطان کی طرف سے وقائع نویس مقرر تھا، جو روزانہ اپنی رپورٹ سلطان کی خدمت میں ارسال کرتا تھا۔
۵۔ گورنر کو تحفے تحائف دینے کا رواج تھا۔
۶۔ قطب الملک گورنر ملتان اچھے اخلاق کا مالک تھا۔
۷۔ سلطان محمد کا جاسوسی کا نظام نہایت عمدہ تھا۔ جونہی ابنِ بطوطہ اس ملک میں داخل ہوا، فوراً سرکاری مخبروں کی تحویل میں آگیا۔ اگرچہ اس کا سفر جاری رہا مگر وہ جاسوسوں کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ وہ ملتان پہنچ گیا۔ اور پھر جب تک دار السلطنت سے اجازت نہ ملی۔ صوبیدار نے براہِ راست اسے اپنی نظر میں رکھا۔ اجازت ملنے پر اسے حضرت قطب الاقطاب رح کے مہمان خانہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس امر کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ حضرت قطب الاقطاب رح نے اس مہمانِ عزیز کو اپنے ہاں ٹھہرانے کی خواہش ظاہر کی تھی، یا ابن بطوطہ نے ہی از خود اس مقدس ماحول میں رہنا پسند کیا۔ لیکن ابن بطوطہ یہ خود لکھتا ہے کہ جب وہ اسکندریہ سے روانہ ہونے لگا تھا اُسے ایک بزرگ نے حضرت قطب الاقطاب رح کی خدمت میں سلام پہنچانے کی درخواست کی تھی۔

شاہ رکن عالم کے لمحاتِ آخر

جب حضرت شاہ رکن عالم کا سن مبارک چھیاسی برس کا ہو گیا تو ذاتِ الٰہی کی محبت نے کشش فرمائی اور آپ نے ۷، صفر ۷۳۵ھ کو حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین

زکریا علیہ الرحمۃ کے عرس مبارک کی تقریبات سے فارغ ہو کر خلقِ خدا سے کنارہ کشی کر لی اور حجرے میں معتکف ہو بیٹھے۔ مولانا ظہیر الدین کو طلب فرمایا، اور انہیں ہدایت کی کہ حجرے کو اپنی نگرانی میں لے لو۔ تمہارے سوا کوئی اور شخص اس ہاں نہ آئے اور تم ہر وقت اس حجرے میں حاضر رہو!

تین ماہ کا طویل عرصہ اسی نہج پر گزر گیا۔ مولانا نماز کے وقت مقررہ امام کو لے آتے تھے اور وہ حضرت کو فرض پڑھوا کر چپ چاپ باہر نکل آتا تھا۔ ۷ جمادی الاول ۷۳۵ھ کو عصر کی نماز کے بعد مولانا ظہیر الدین حجرے میں گئے، تو حضرت نے اشارے سے قریب بلایا اور فرمایا "جاؤ، میری تجہیز و تکفین کا انتظام کرو!"

نماز مغرب کا وقت آیا تو مولانا مقررہ امام کو لے کر حجرے میں داخل ہوئے نماز کے بعد امام صاحب رخصت ہو گئے، اور حضرت نے اوابین شروع کیں۔ جب فارغ ہوئے تو سر سجدے میں رکھا اور روح اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئی۔ جنازہ کے بعد تدفین کا معاملہ پیش ہوا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت کو سلطان غیاث الدین کے مقبرے میں دفن کیا جائے۔ مگر مولانا ظہیر الدین نے فرمایا کہ حضرت کی وصیت ہے کہ مجھے دادا جان کے قدموں میں دفن کیا جائے۔ ممکن ہے مقبرے پر سرکاری رقم خرچ ہوئی ہو اس لئے وہ مناسب نہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ اور حضرت قطب الاقطابؒ کو شیخ الاسلام زکریا علیہ الرحمۃ کے قدموں میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون ۝

ایک عارف نے حضرت قطب الاقطابؒ کی تاریخ وفات اس طرح نکالی ہے

شیخ رکنِ دیں ولی ابنِ ولی — از فنا شد چوں بسوئے جاوداں
قدسیاں فردوس را آراستند — شیخ بحر امید با صد عز و شاں

بار سالِ وصلِ آں حافظ بگفت
"رکنِ دیں عالی لقب قطبِ جہاں"

شاہ رکنِ عالمؒ کے فیوض و برکات

حضرت شیخ الاسلام زکریا علیہ الرحمۃ کے بابرکت دور سے شاہ رکنِ عالمؒ کے عہد تک ملتان شہر پر برابر انوار و تجلیات کا نزول ہو رہا تھا۔ مدرسہ بہائیہ[1] اور مدرسہ ناصریہ کے نام سے دو علمی درسگاہیں بڑی بہار پر تھیں۔ پاک و ہند کے طول و عرض سے ہزاروں تشنگانِ علوم آتے اور ان چشموں سے شادکام ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں سہروردی تبلیغی جماعتیں الگ مصروفِ کار تھیں۔ موسمِ بہار میں سندھ کے تبلیغی قافلے آتے اور روحانی تسکین حاصل کرتے تھے۔ شمالی ہند کی طرف آپ کے خلفاء قریہ بقریہ پہنچتے اور وہ نوردانِ بادیہ ضلالت کو صراط المستقیم پر گامزن کرتے۔ چنانچہ شور کوٹ کی جانب حضرت مخدوم سید جلال بخاریؒ اور ان کے نامور فرزند سید احمد کبیر سہروردیؒ تشریف لے جا کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ سیالوں اور بھٹی راجپوتوں کو سید جلالؒ نے ہی حلقہ بگوشِ اسلام کیا تھا۔ جو یہ اور ابو حن حضرت

---

[1] مدرسہ بہائیہ میں شاہ بدر رکن عالم، علامہ حسین جیسے کئی فضلائے عصر تعلیم دینے پر مامور تھے، مگر اکثر تذکرہ نگاروں نے دو علماء کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ ایک شیخ العالم الفقیہ علامہ مجد الدین عمانی ہیں جو زہد و ورع اور صلاح و تقویٰ میں معروف تھے۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے ایک سال تک آپ سے استفادہ کیا تھا۔ دوسرے شیخ موسیٰ بن جلال ملتانیؒ الملقب بہ نور الدین تھے۔ یہ حضرت شاہ رکن عالم کے ہمشیرزادہ تھے۔ انہوں نے سالہا سال تک مدرسہ بہائیہ کی بزمِ تدریس کو رونق بخشی۔ ان کے شاگردوں میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا نامِ نامی سرِ فہرست ہے۔

قطب الاقطابؒ کے دستِ حق پرست پر ہی مسلمان ہوئے تھے۔ گھلو، نون، کھرل، لانگ اور بھارہ کو حضرت قطب الاقطابؒ کے خلیفہٴ اعظم حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے مسلمان کیا تھا۔ یہ تمام مشائخ حضرت شیخ الاسلام زکریا علیہ الرحمۃ کے مرید در مرید تھے۔

حضرت قطب الاقطاب کے اکابر خلفاء

حضرت قطب الاقطابؒ کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ آپ شیخ عماد الدین اسمٰعیلؒ کے فرزند شیخ صدر الدین محمد کو اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔ اور بڑے بڑے علماء ان کی تعلیم و تربیت پر مقرر فرمائے تھے۔ حضرت سلطان التارکین حمید الدین حاکمؒ ان کے اتالیق تھے۔ حضرت قطب الاقطابؒ نے خلوت نشین ہونے سے قبل انہیں مسندِ غوثیہ پر متمکن کر دیا تھا۔ ویسے حضرت اپنی روحانی اولاد پر فخر کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ خداوندِ عالم نے مجھے ہزاروں ایسے فرزند عطا کئے ہیں جن کی وجہ سے قیامت تک میرے اعمال میں نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی۔ آپ کے اکابر خلفاء میں حضرت سلطان التارکین حمید الدین حاکمؒ کا نام سر فہرست ہے۔

سلطان التارکین حمید الدین حاکمؒ

سلطان التارکین حمید الدین حاکمؒ کا اسمِ گرامی اس کتاب میں کئی بار آچکا ہے۔ آپ کیچ مکران کے بادشاہ تھے۔ تخت و تاج چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی۔ پیر فرخ بخش شاہ صاحب نے اذکارِ قلندری میں آپ کا شجرہٴ نسب اس طرح سے درج کیا ہے۔

سلطان التارکین حمید الدین حاکم بن سلطان بہاء الدین بن سلطان قطب الدین بن سلطان رشید الدین بن سلطان بوعلی بن شیخ محمد موسیٰ بن شیخ ابوطاہر ۔۔۔ بن

الشیخ الشیوخ ابراہیم بوالحسن علی بن شیخ محمد بن شیخ یوسف بن شیخ محمد عمر بن شیخ عبدالوہاب بن حضرت زید بن زیاد بن ابوسفیان حارث بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

سلطان التارکین اپنے پیر قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ سے ۹ برس بڑے تھے۔ آپ نے زندگی کا اکثر حصہ مرشد کے قدموں میں بسر کیا۔ دہلی کے سفر میں، سندھ کے دورہ میں، جہاں کہیں قطب الاقطاب تشریف لے گئے۔ آپ سایہ کی طرح شیخ طریقت کے ہمراہ رہے۔ قطب الاقطاب نے دارِ فانی سے عالمِ باقی کو انتقال فرمایا، تو بھی آپ نے ملتان نہ چھوڑا۔ اور پیر کی وصیت کے مطابق شیخ صدرالدین محمد علیہ الرحمۃ کی اتالیقی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۲ ربیع الاول ۷۳۷ھ کو ایک سو ستاسٹھ (۱۶۷) سال کی عمر میں آپ نے بھی سفر آخرت اختیار کیا۔ پہلے آپ کو پیر طریقت کے مقبرے میں دفن کیا گیا پھر آپ کے ورثاء آپ کے صندوق کو مؤ مبارک میں لے گئے۔

حضرت سلطان التارکین حمیدالدین حاکمؒ کے خلفاء میں ان کے سوتیلے بھائی شیخ رکن الدین حاتمؒ، آپ کے فرزندان ارجمند شیخ نورالدین اور شیخ تاج الدین زیادہ مشہور ہیں۔ مریدوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ ان میں کئی مردانِ غیب ہیں، کئی اہل طیر اہلِ سیر، علماء، عباد، اوتاد، نجباء، غوث اور قطب وغیرہ[۱]

سلطان التارکین کی اولاد میں قطب العالم شیخ عبدالجلیل[۲]، اور حضرت شاہ موسیٰ[۳] کا بڑا مقام ہے، ان کی حسبی اور روحانی اولاد کا مفصل تذکرہ حضرت شاہ رکن عالم

[۱] تذکرہ حمیدیہ، اردو، ص ۴۵ [۲] آپ کا مقبرہ لاہور میں ہے۔ [۳] آپ پنڈی شیخ موسیٰ میں مدفون ہیں۔

قدس سرہٗ کی سیرت میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاریؒ

آپ کا نام نامی سید جلال الدین حسینؒ، اور مخدوم جہانیاںؒ لقب تھا۔ آپ سید احمد کبیر سہروردی کے بڑے فرزند تھے۔ ۷۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اوچ میں ہی پائی۔ پھر والد ماجد نے آپ کو مزید تعلیم کے لئے ملتان بھیجا۔ حضرت قطب الاقطابؒ نے آپ کو شیخ موسیٰ اور مولانا مجدالدین کے سپرد کیا۔ مولانا جمالی کا بیان ہے کہ ان حضرات کے علاوہ حضرت مخدوم نے ملتان میں ایک اور بزرگ سے بھی تعلیم پائی تھی۔ ان کا نام نامی مولانا شاہ رُخ عالم[1] قدس سرہٗ تھا۔ جب آپ تعلیم ختم کر چکے، تو حضرت قطب الاقطابؒ نے اپنی خاص کشتی میں سوار کر کے اُچ بھیج دیا۔ یہاں آکر مولانا رضی الدین گنج العلم سے آپ نے کلام پاک کی ساتوں قرأتیں سیکھیں۔ جب ارض پاک میں تشریف لے گئے تو مکہ مکرمہ میں امام عبداللہ یافعی اور مدینہ منورہ میں امام عبداللہ مطری سے صحاح ستہ، عوارف اور رسائل سلوک کا درس لیا۔ مولانا محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ مخدوم جہانیاں سب سے پہلے اپنے والد ماجد سید احمد کبیرؒ کے مرید ہوئے۔ ان کے بعد آپ نے اپنے عم مکرم سید محمد غوثؒ سے استفاضہ کیا۔ ازاں بعد آپ ملتان تشریف لے گئے اور حضرت قطب الاقطابؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ حضرت قطب الاقطابؒ سے محبت اس قدر بڑھی کہ ایک دفعہ جبکہ حضور اپنے چبوترہ کی دہلیز سے اُتر کر کہیں جانے کا

---

[1] مولانا شاہ رُخ عالمؒ ملتان کے بہت بڑے عالم تھے۔ ممکن ہے ان کا مدرسہ بہائیہ سے بھی کچھ تعلق ہو آپ کا مزار پُر انوار نواں شہر کے غرب میں اس سڑک پر واقع ہے جو ایدالی روڈ کو سول لائنز سے ملاتی ہے مزار کے گرد و پیش معتقدین کی قبریں ہیں، اور شمال میں مسجد ہے۔

ارادہ کر رہے تھے۔ دہلیز کے زینے کو نیچے دیکھ کر حضرت مخدوم فوراً چت لیٹ گئے، اور اپنا سینہ جو اسرارِ الٰہی کا گنجینہ تھا، زینہ بنا کر عرض کیا کہ حضور اس پر قدم پاک رکھ کر نیچے اُتریں ؎

بر دل و سینہ ام بنہ اے مہ نازنین قدم
بود بر سر نوشتِ من فیض قدم ازیں قدم

حضرت قطب الاقطابؒ نے حیرت سے اُنگلی منہ میں دبالی، اور فرمایا
"جلال! نبوت کا دروازہ تو بند ہو چکا ہے۔ بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟"
پھر خود ہی فرمایا۔ اچھا آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ۔ حضرت مخدوم تو اسی موقعہ کے منتظر تھے، فوراً اُٹھے اور شیخ طریقت کے سینہ بے کینہ سے چمٹ گئے۔ حضرت قطب الاقطابؒ نے گلے سے لگاتے ہوئے فرمایا۔ "اچھا آج سے تم مخدوم جہانیاں ہو۔"
اس کے بعد آپ جس طرف بھی گئے، لوگوں نے کہا۔ وہ دیکھو مخدوم جہانیاں آرہے ہیں۔ اس کے بعد مخدوم جہانیاںؒ نے دنیا بھر کے مشائخ کی زیارت کی، اور تقریباً بیس مشائخ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور جب واپس تشریف لائے سلطان فیروز شاہ تغلق نے آپ کی اُسی طرح عزت کی، جیسے سلاطین خلجی حضرت شاہ رکن عالمؒ کی کیا کرتے تھے۔ حضرت مخدوم نے اٹھتر سال کی عمر پا کر ۷۸۵ھ میں انتقال فرمایا اور اُچ میں دفن ہوئے۔ حضرت مخدومؒ کے اگرچہ اپنے صاحبزادے موجود تھے، مگر آپ نے اپنے بھائی مخدوم صدر الدین راجن قتالؒ کو اپنا جانشین بنایا اور اپنا سجادہ ان کے حوالے کیا۔
حضرت مخدوم کی اہلیہ محترمہ کو جب یہ اطلاع ہوئی کہ اس کے بیٹے سید ناصر الدین محمود کو باپ کی خلافت اور سجادگی سے محروم کر دیا گیا ہے تو مخدومہ نے اس امر کو

شدت سے محسوس کیا۔ جس پر مخدوم راجن قتالؒ اُچ سے ملتان چلے آئے۔ اور زندگی بھر یہاں اپنے پیرانِ عظام کے آستانِ قدسی نشان پر رہ کر امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اُن کے آنے سے اُچ سے بے شمار بخاری سادات بھی یہاں منتقل ہو آئے۔ سید احمد شاہ بخاری۔ سید معصوم شاہ بخاری سید گل دین بخاری کے قبرستان اسی دور کی یادگاریں ہیں۔ انہوں نے مخدوم راجن قتالؒ کی سربراہی میں ملتان میں اصلاحِ احوال کا بڑا کام کیا۔ مخدوم راجن ۱۶ جمادی الآخر ۸۲۷ھ کو فوت ہو کر بموجب وصیت اُچ میں دفن ہوئے۔

حضرت مخدوم جہانیاں کی اولاد امجاد اور خلفاء نے سہروردی مسلک کو خوب چمکایا، اور لاکھوں کافروں اور ہندوؤں کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا۔ ان کے خلفاء میں درجِ ذیل حضرات خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مخدوم سید فضل اللہ، شیخ کبیر الدین اسمٰعیل، شیخ عبدالوہاب بخاری، سید جمال الدین بخاری، حضرت شاہ عالم، مخدوم سید کیمیا نظر بخاری، سید عبدالوہاب دین پناہ، مشائخ بلگرام، رحمہم اللہ علیہم اجمعین

حاجی صدر الدین چراغ ہندؒ جون پوری

آپ حضرت قطب الاقطابؒ کے تیسرے نامور خلیفہ ہیں خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد ولایتِ ظفر آباد کی روحانی تربیت پر مامور ہوئے آپ حضرت میر اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمۃ کے معاصر تھے ۸۰۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا، اور ظفر آباد میں دفن ہوئے۔ حاجی چراغ ہندؒ کے خلفاء میں شیخ رکن الدین مسکینؒ ان کے فرزند ارجمند اور بادشاہ موسیٰ عاشقاں کے اسمائے گرامی خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔ اور زہد و پرہیز گاری میں بہت مقام رکھتے ہیں۔

شیخ وجیہہ الدین عثمان سیاح سنامی قدس سرہٗ

آپ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ آپ کافی عرصہ پیر طریقت کی خدمت میں رہے حضرت قطب الاقطابؒ نے بعد تکمیل انہیں دہلی روانہ کیا اور فرمایا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر میرے سلام پہنچانا اور جہاں وہ رہنے کا حکم دیں، وہیں سکونت اختیار کرنا۔ چنانچہ شیخ عثمانؒ نے دہلی پہنچ کر حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں مرشد کا سلام عرض کیا۔ وہ سنتے ہی سرو قد کھڑے ہو گئے اور فرمایا علیک و علیہ السلام۔ یعنی تجھے بھی سلام اور تیرے پیر و مرشد کو بھی سلام۔

مولانا ظہیر الدین محمد سہروردیؒ

مولانا ظہیر الدین تغلق دور کے بہت بڑے عالم تھے۔ سلطان غیاث الدین نے ایک دفعہ ان سے پوچھا کہ کبھی آپ نے شیخ رکن الدینؒ کی کوئی کرامت دیکھی ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ ایک مرتبہ جمعہ کے روز جبکہ لوگ حضرت شیخ کی قدمبوسی کے لئے جمع تھے، میں نے دل میں خیال کیا کہ شیخ کے پاس شاید تسخیر کا کوئی عمل ہے۔ میں بھی عالم ہوں لیکن میری طرف تو کوئی توجہ نہیں کرتا۔ میں نے سوچا کہ کل صبح کو شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھوں گا کہ وضو میں کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے میں کیا حکمت ہے؟

رات کو جب سویا تو خواب میں دیکھا کہ شیخ مجھے حلوا کھلا رہے ہیں، جس کی شیرینی بیداری میں بھی محسوس ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ اگر یہی کرامت ہے، تو شیطان بھی عوام کو اس طرح گمراہ کرتا ہے۔ صبح کو جب میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھ کو دیکھتے ہی فرمایا۔۔۔ "مولانا! میں آپ کا ہی منتظر تھا!"
پھر گفتگو شروع کی اور فرمایا۔۔۔ " جنابت دو قسم کی ہوتی ہے۔ جنابت جسم

اور جنابتِ دل ! ــــ جنابتِ جسم کا سبب تو بالکل ظاہر ہے، مگر دل کی جنابت ناہموار آدمیوں کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔ جسم تو پانی سے پاک ہو جاتا ہے، مگر دل کی جنابت آنکھوں کے پانی سے دُور ہوتی ہے۔"

اس کے بعد فرمایا کہ "پانی میں تین صفتیں ہیں۔ رنگ، مزہ اور بُو۔ اسی لیئے شریعت نے وضو میں کُلّی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کو مقدم رکھا ہے۔ کُلّی سے مزہ معلوم ہوتا ہے اور ناک میں پانی ڈالنے سے اس کی بُو محسوس ہوتی ہے۔"

پھر فرمایا کہ "جس طرح نبی کی صُورت میں شیطان نمودار نہیں ہو سکتا۔ اُسی طرح شیخ حقیقی کی صُورت میں بھی شیطان نمودار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شیخ حقیقی کو نبی کامل کی متابعت حاصل ہوتی ہے۔"

پھر فرمایا۔" مولانا ظہیر الدین اگرچہ علومِ ظاہری سے مالا مال ہیں، لیکن علومِ باطن سے خالی ہیں۔"

مولانا ظہیر الدین کا بیان ہے کہ جس وقت حضرت قطب الاقطاب رح کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اُس وقت میرے ہر بُنِ مُو سے پسینہ جاری تھا۔[1] (مولانا کا بیان ختم ہو گیا)

جونہی حضرت قطب الاقطاب رح نے اپنی تقریر ختم کی۔ مولانا نے شیخ کے قدموں پر بوسہ دیا۔ اور دستِ حق پرست میں اپنا ہاتھ دے کر بیعت کر لی۔ اور پھر حضرت کی ذاتِ والاصفات سے وابستہ ہو کر رہ گئے۔ مولانا کے بخت کی بلندی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں حضرت قطب الاقطاب رح جیسے شہنشاہِ طریقت کی آخری خدمت کا موقع ملا۔ اور سلطان حاکم، مخدوم جہانیاں اور علی بن احمد

---

[1] اخبار الاخیار۔ ص ۶۵

غوری جیسے اکابر خلفاء جنہیں حضرت سے عشق و محبت کے بڑے بڑے دعوے تھے۔ اس شرف و سعادت کے لئے تڑپتے رہ گئے۔ اس شہباز ولایت نے نہ صرف تین ماہ تک تخلیہ میں حضرت قطب الاقطابؒ کے دوش بدوش نمازیں ادا کیں بلکہ ان فدوران عبد اور معبود کے درمیان راز و نیاز اور اسرار و معارف کی جو کیفیات پیدا ہوئیں اُن کا برا العین مشاہدہ کیا۔ حضرت قطب الاقطابؒ کے وصال کے بعد اس رازدار قطبیت کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اغلب گمان یہی ہے کہ مولانا نے بقیہ زندگی انتہائی اخفا میں بسر کی اور جو آنکھیں تجلیاتِ الٰہی سے اکتساب نور کر چکی تھیں، وہ پھر کسی سے کیا چار ہوتیں! عمر طبعی ختم کرنے کے بعد یہ عارف زماں یقیناً حضرت شیخ الاسلام کے قدموں میں آسودۂ خواب ہوئے ہوں گے۔ اس نیاز مند نے ایک بزرگوار کے ہاں خانقاہ مبارک حضرت شیخ الاسلام کا نقشہ دیکھا تھا جو دائرے کی صورت میں تھا اور اس میں تمام مزارات کا محلِ وقوع دیا ہوا تھا۔ افسوس ہے، انتہائی کوشش کے باوجود وہ نقشہ نہیں مل سکا؛ ورنہ آج مولانا ظہیر الدین محمد اور ان جیسے دوسرے خدّام غوثیہ کے مقابر کی بڑے وثوق سے نشان دہی کی جا سکتی تھی۔

حضرت قطب الاقطابؒ کے دور کا علمی سرمایہ

حضرت قطب الاقطابؒ قدس سرہٗ کے ارادت مندوں میں علماء، شعراء، مورخین اور ادیب سبھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ وہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق مصروفِ کار رہے۔ اور

اپنے بعد خلق خدا کے لئے انتہائی مفید سرمایہ چھوڑ گئے۔ ان میں سے ایک قابل ذکر بزرگ علامہ فضل اللہ محمد بن ایوب ہیں۔ یہ اگرچہ مرید حضرت شیخ الاسلام کے تھے لیکن ان کی ساری زندگی حضرت قطب الاقطابؒ کے قدموں میں بسر ہوئی۔

فتاویٰ صوفیہ انہوں نے عوارف کے رنگ میں ۶۳ ابواب پر مشتمل فتاویٰ صوفیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو خاصی مقبول ہوئی اور متصوفین میں عرصہ تک متداول رہی۔ کنزالعباد کا مصنف اگرچہ علامہ کا معاصر ہے۔ مگر جگہ جگہ اس کتاب کے اقتباسات دیتا ہے۔ مولانا نظام الدین احمد نے بھی الاوراد پر حواشی لکھنے میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

کنزالعباد

حضرت قطب الاقطابؒ کے زمانے کی ایک اور نادر تصنیف "کنزالعباد" ہے۔ یہ خالص فقہی کتاب ہے، اور سہروردی سلسلے میں آئین کی حیثیت رکھتی ہے اس کے مصنف حضرت قطب الاقطاب کے نامور مرید مولانا علی بن احمد غوریؒ ہیں۔ انہوں نے یاران طریقت کی خواہش کے پیش نظر اس کی تدوین شروع کی جو حضرت قطب الاقطابؒ کی وفات کے بعد جاکر ختم ہوئی۔ یہ کتاب دراصل الاوراد کی شرح ہے۔ اس کے مضامین کی فہرست پر ایک نظر ڈال لینے سے یہ امر محتاج بیان نہیں رہتا کہ یہ اذکار حنفی فقہ سے متعلق ہیں اور حضرت شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا قدس سرہٗ مذہب اہلسنّت والجماعت کے امام تھے۔ حضرت الشیخ العارف صدرالدین محمد، حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم، سید السادات جلال بخاریؒ حضرت مخدوم جہانیاں، سید عبدالوہاب دین پناہ، حضرت سلطان احمد قتال (علا پیورہ پیروالا) وغیرہم بھی یہی مسلک رکھتے تھے۔ روحانی اعتبار سے ان حضرات کا مقام

اتنا او نچا ہے کہ آج تک کسی غیر مسلم کو بھی ان کی جلالت قدر سے انکار کی جرأت نہیں ہو سکی۔ بایں ہمہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کچھ عرصہ سے ان بزرگوں کی اولاد کے چند گھرانے اپنے آباء کرام کے اس پاک مسلک سے بعد بلکہ ہجر اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی حضرت کے مریدوں میں بھی یہ وبا پھیلتی جا رہی ہے۔ حضرت کی ایسی اولاد اور مریدوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے کہ ان کا یہ موقف کس حد تک صحیح ہے، اور کیا وہ اختلافِ عقائد کے باوجود شیخ الاسلام زکریاؒ کی روحِ پر فتوح سے استفاضہ کا حق رکھتے ہیں؟

اِنْ کُنْتَ تَدْرِیْ فَتِلْکَ مُصِیْبَۃٌ
وَاِنْ کُنْتَ لَا تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَۃُ اَعْظَمُ

وصایا شیخ رکن الدین حضرت محدث علیہ الرحمۃ نے حضرت قطب الاقطابؒ کے وصایا کو ایک کتاب مجمع الاخبار فی مناقب الاخیار سے نقل فرمایا ہے مگر مجمع الاخبار کے مصنف پر روشنی نہیں ڈال سکے۔ دراصل یہ ان وصایا کا مجموعہ ہے، جو حضرت قطب الاقطابؒ نے وقتاً فوقتاً اپنے مریدوں کو تحریر فرمائے تھے۔ بوجہ عدم گنجائش ہم یہاں وصایا درج نہیں کر رہے۔ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہیں وہ "تذکرہ شاہ رکنِ عالم" کا مطالعہ کریں۔

سلطان فیروز شاہ تغلق ۲۱ محرم ۷۵۲ھ کو سلطان محمد تغلق کا ٹھٹھہ (سندھ) میں انتقال ہو گیا۔ اُمرائے سلطنت نے اس کی جگہ سلطان فیروز شاہ کو تخت نشین کیا۔ یہ نوجوان تاجدار سندھ سے دہلی جاتا ہوا مشائخ کرام کی زیارت کے ارادے سے چند یوم ملتان میں ٹھہرا اور شیخ الاسلام محمد یوسف گردیزیؒ اور حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہم الرحمۃ کے آستانوں

پر حاضر ہوا۔ چونکہ دہلی میں وزیر اعظم نے ایک مجہول النّسب لڑکے کو سلطان محمد
کا فرزند ظاہر کر کے تخت نشین کر رکھا تھا۔ اس لئے سلطان نے ان بزرگوں کے توسّل
سے اپنی کامیابی کی دُعا مانگی۔ مخدوم صدرالدین محمد سجادہ نشین حضرت زکریّا ملتانی
علیہ الرحمۃ اور دیگر امرائے شہر نے اشرفیوں کی تھیلیاں نذر گزاریں۔ سلطان نے کہا۔
اس وقت ضرورت کے پیشِ نظر آپ کا یہ ہدیہ قبول کر لیتا ہوں، مگر یہ مجھ پر قرض
ہے، دہلی پہنچ کر واپس کر دوں گا۔ چنانچہ جب سلطان کو وزیر اعظم کے مقابلے
میں کامیابی ہوئی اور خزائن شاہی اس کے تصرف میں آئے تو اس نے اہلِ ملتان
کا پیسہ پیسہ ادا کر دیا۔

شاہ رُکنِ عالم کے تابُوت کی منتقلی

کچھ عرصہ کے بعد ٹھٹھ کے جام سلطان سے باغی ہو گئے۔ ان
کی بغاوت فرو کرنے کے لئے خود فیروز شاہ کو سندھ میں جانا پڑا۔ جب قادرِ مطلق
نے اسے سندھ پر فتح عطا کی تو دہلی جاتے ہوئے سلطان پھر ملتان میں داخل ہوا۔
اور حضرت شیخ الاسلام زکریّا و شیخ الاسلام محمد یوسف گردیزی علیہم الرحمۃ کے
مقابر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد اس نے دربار منعقد کیا۔ جس میں اس نے اہلِ شہر کو
انعامات سے نوازا۔ حضرت مخدوم صدرالدین محمدؒ نے التماس کی کہ میں نے خواب میں
دیکھا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام زکریا علیہ الرحمۃ فرما رہے ہیں۔ "بیٹا! تم لوگوں نے
قطب الاقطابؒ کو میری پائنتی میں دفن کر دیا ہے، اس سے مجھے سخت تکلیف ہو
رہی ہے۔ تم ان کے صندوق کو دوسرے مقبرے میں منتقل کر دو!"

۱؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، "تذکرہ صدرالدین عارف، جلد اول، ص ۲۸۹، ۲۹۰

سلطان نے عرض کیا کہ یہ مقبرہ تو سلطان محمد نے اپنی زندگی میں ہی حضرت قطب الاقطابؒ کو نذر کیا تھا۔ آپ لوگوں نے حضرت کو اس میں دفن کیوں نہیں کیا حضرت مخدوم صدرالدین محمد نے فرمایا کہ حضرت کا خیال تھا کہ ممکن ہے اس مقبرہ میں سرکاری خزانے کا روپیہ صرف ہوا ہو، اس لئے آپ نے اپنے لئے پسند نہ فرمایا۔ سلطان نے کہا۔ میں ذاتی واقفیت کی بنا پر دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اس مقبرے پر سرکاری روپیہ صرف نہیں ہوا۔ اپنی قبر کے لئے کون پسند کرتا ہے کہ اس پر مشتبہ مال سے عمارت تیار ہو۔ سلطان تغلق نے بزمانہ صوبیداری دیپالپور محال خالصہ کی آمدنی سے اسے تیار کرایا تھا۔ نہایت متدین معمار اس کی تعمیر پر لگائے گئے تھے اسی طرح جو مقبرہ کوٹلہ تغلق آباد میں تعمیر ہوا ہے۔ اس پر بھی سلطان کی ذاتی رقم صرف ہوئی ہے۔ آپ بلا توقف حضرت کے تابوت کو اس عمارت میں منتقل کریں، بلکہ یہ کام میری موجودگی میں ہونا چاہیئے۔ سلطان کی اس تقریر سے حضرت مخدوم کی طبیعت شگفتہ ہو گئی۔ اور مقبرے کی تعمیر سے متعلق جو تشویش تھی وہ جاتی رہی۔ چنانچہ سلطان کی موجودگی میں قطب الاقطابؒ کے تابوت کو حضرت زکریا علیہ الرحمۃ کی پائنتی سے نکال کر مقبرہ سلطانی میں منتقل کیا گیا۔ اس تقریب میں ملتان شہر کے تمام لوگ جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے بڑھ چڑھ کر کندھا دیا۔ خود فیروز شاہ بھی تابوت اٹھانے میں شریک تھا۔

مقبرے کا سراپا

حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم علیہ الرحمۃ کا مقبرہ بلحاظ وسعت اور بلندی پاکستان و ہند کے جملہ مقابر میں دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ یہ خوشنما اور مثمن شکل کا مقبرہ سو فٹ دو انچ بلند ہے، اور چونکہ بلندی پر واقع ہے۔ اس لئے سطح زمین سے ڈیڑھ سو فٹ کے قریب اونچا ہے۔

یہ گنبد بارہ پندرہ میل سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب کبھی رات کو اس پر بجلی کے قمقمے روشن کئے جاتے ہیں تو گنبد کی بیرونی سطح بے حد دیدہ زیب اور دلفریب معلوم ہوتی ہے۔ روضہ پاک کا مرکزی قطر ۵۱ فٹ ۹ انچ اور آثار ۱۲ فٹ ۶ انچ ہے۔ ہر زاویہ پر عمودی ستون استادہ ہے۔ اوپر ایک اور مثمن شکل کی عمارت بنی ہوئی ہے اور "یا اللہ" بطور ہالہ کے چاروں طرف کندہ ہے۔

یہ مقبرہ سات سو برس سے سابقہ پنجاب اور سندھ کے سنگھم پر کھڑا حوادث دہر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ لنگاہوں کے دور میں اسے سخت دھچکا لگا۔ ۱۸۲۸ء میں انگریزوں نے اس مقبرے پر گولے برسائے، جو گزشتہ سالوں میں مرمت کے وقت نکالے گئے۔ مقبرہ کے قریب ہی اورنگ زیب کی بنائی ہوئی ایک مسجد تھی۔ چونکہ دیوان مول راج نے اسے بارود خانہ کے طور پر استعمال کر رکھا تھا، گولہ باری کے سبب بھک سے اڑ گئی۔ مقبرہ کے گرد و پیش مسافروں کے لئے جو سرائیں بنی ہوئی تھیں وہ بھی کھنڈر بن گئیں۔ اورنگ زیب کی شکستہ مسجد کو بھونگ، ضلع رحیم یار خاں کے رئیس اعظم سردار غازی محمد خاں اندھڑ نے پینتالیس ہزار کے مصرف سے دوبارہ تعمیر کرایا ہے۔ اس مسجد کی تعمیر سے مقبرے کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ شام کے وقت جبکہ سایہ کافی ڈھل چکا ہوتا ہے، عیدگاہ سے دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا پہاڑ کے دامن میں کوئی سنگ مرمر کی بارہ دری استادہ ہے۔ عیدگاہ سے قلعہ کا ارتفاع اور حضرت شیخ الاسلام زکریا اور قطب الاقطاب رحمہم اللہ کے مقابر نہایت پر شوکت نظارہ پیش کرتے ہیں۔

لاہور سے آنے والے نووارد کی نظر جب اس طرف سے میلوں تک پھیلے ہوئے شہر پہ پڑتی ہے اور اس پر مشائخ اسلام کے حسین و جمیل مقابر، خانقاہوں

کے فلک بوس قبے اور بلند پایہ مینار، جاہ و جلال بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ ملتان کی روحانی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلتا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

مرمریں کٹہرہ شروع میں اس شہنشاہِ دُنیا و دین کی قبر بالکل سادہ، کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ چند سال گزرے کہ الحاج سردار غازی محمد خاں اندھڑ تمندار اعظم بھونگ نے جہاں مقبرے کے پہلو میں دیدہ زیب مسجد تعمیر کی وہاں آپ کے مزارِ پُر انوار کی تزئین و آرائش پر بھی روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہا دیا۔ قبر شریف اور کٹہرہ کئی قسم کے رنگدار پتھروں سے تعمیر کرایا چھت پر شیشہ بندی کرائی، مگر افسوس ہے، کاریگروں نے کٹہرہ بناتے وقت مقبرہ کی وسعت اور بلندی کے تناسب کا خیال نہیں رکھا۔ لمبائی میں تو کٹہرہ ٹھیک ہے، مگر چوڑائی اور بلندی میں کم ہے۔ مناسب ہے کہ کٹہرے کے دونوں جانب مرمریں مرغول بنا دیئے جائیں، تاکہ دیکھنے والوں کو یہ نقص محسوس نہ ہو۔

حضرت مخدوم دہلی میں سلطان فیروز شاہ نے قیامِ ملتان کے دوران حضرت شیخ صدرالدین محمد سے درخواست کی تھی کہ آپ کے آبا و کرام گاہے گاہے دارالسلطنت میں تشریف لا کر سلاطین وقت کی بزرگانہ نصائح سے راہنمائی فرمایا کرتے تھے۔ آپ بھی ان کی سُنّت کو پورا کرنے کے لیے ضرور تشریف لایا کریں۔ شیخ کو سلطان کا یہ نیاز و انکسار بہت پسند آیا۔ اور دہلی

آنے کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ آپ خاندانی معمولات کے مطابق پہلے دہلی تشریف لے گئے اور پھر سلطان کے ہمراہ حصار فیروزہ تشریف لائے۔ یہاں سلطان نے حضرت سے شیخ الاسلامی کے منصب کو قبول کرنے کی درخواست کی اور ساتھ ہی گراں بہا خلعت، شمشیر مرصع اور زریں ہودج کا ہاتھی نذر کیا۔ اس کے بعد بڑے اعزاز و اکرام سے آپ کو رخصت کیا۔ شیخ صدرالدین محمد شیخ الاسلامی کے فرائض کی تکمیل کے لئے گاہے گاہے بادشاہ کے پاس دہلی تشریف لے جاتے تھے۔ وہ کس شان سے آتے اور بادشاہ کس ادب و احترام سے ان کا استقبال کرتا اور ان کے ارشادات کی تعمیل کرتا تھا۔ وہ عفیف شمس سراج کی زبان سے سُنئے:۔

عفیف کا بیان

عفیف شمس لکھتا ہے کہ حضرت مخدوم ایک پہر گزرنے کے بعد بادشاہ کی ملاقات کو آتے تھے۔ اس وقت بادشاہ محل چھجہ[1] میں قالین کے اوپر بیٹھتا تھا۔ جب حضرت مخدوم محل کے قریب پہنچتے تو سلطان باہر نکل کر ان کا استقبال کرتا، اور اپنے ہاتھ حضرت مخدوم کے قدموں تک لے جاتا۔ حضرت مخدوم بادشاہ کو دُعا دیتے اور اپنے سینے سے لگاتے، اس کے بعد بادشاہ اور حضرت مخدوم دونوں ایک [illegible] پر تشریف فرما ہوتے۔ اس مجلس میں قاضی بغدادی اور ملک کبیر کے علاوہ کسی دُوسرے آدمی کو شریک،

---

[1] ملاقات کے لئے بادشاہ کے تین محل مشہور تھے۔ ایک کا نام محل صحن گلی۔ اس کو محل انگور بھی کہتے تھے۔ دوسرے کا نام محل "چھجہ چوبین" تھا۔ اور تیسرے کو محل دربار عام بھی کہتے تھے۔ پہلے محل میں صرف خواتین، ملوک، امراء اور خاص خاص اہل قلم سے ملاقات ہوتی تھی۔ دوسرا محل چھجہ گویا خلوت کدہ تھا۔ اور نہایت ہی مخصوص امراء کے ساتھ وہاں نشست ہوتی۔ تیسرا محل دربار عام کے لئے تھا (تاریخ فیروز شاہی)

ہونے کی اجازت نہ ہوتی۔ یہ دونوں معتمد امرار بادشاہ کے پس پشت استادہ رہتے تھے۔ بادشاہ بڑے ادب و احترام سے حضرت مخدوم سے خیریت مزاج دریافت کرتا اور دینوی و دُنیادی معاملات پر گفتگو رہتی۔ اس دوران میں قسم قسم کے طعام، بہترین شربت، میوہ جات اور پان سے خاطر تواضع ہوتی رہتی۔ اس کے بعد حضرت مخدوم بادشاہ سے رخصت ہو کر تشریف لے جاتے، اور بادشاہ چند قدم تک انہیں خدا حافظ کہنے کے لئے جاتا۔ رخصت ہونے کے وقت بھی حضرت مخدوم بادشاہ کو دُعا دے کر اپنے سینے سے لگاتے۔ اگر حضرت مخدوم کو بادشاہ سے کسی ضرورت کے لئے کچھ کہنا ہوتا تو وہ اپنی زبان فیض ترجمان سے کچھ ارشاد نہ فرماتے، بلکہ کاغذ پر لکھ لیتے اور اسے اپنے رومال میں لپیٹ کر وہیں چھوڑ آتے۔ بادشاہ حضرت کو رخصت کر کے واپس آتا اور قالین پر سے حضرت کے رومال اور کاغذ کو اٹھا کر سر آنکھوں سے لگاتا اور اس مکتوب گرامی کو شروع سے آخیر تک بڑی احتیاط سے پڑھتا اور اس کا جواب حضرت کی منشار کے مطابق لکھ کر اپنے حضور میں مرتب کرا کے کسی معتمد امیر کے سپرد کرتا اور حکم دیتا کہ یہ خط جلد سے جلد حضرت مخدوم تک پہنچا دے۔ بالعموم یہ فرمان حضرت مخدوم سے پیشتر ان کی قیام گاہ پر پہنچ جاتا۔

حضرتؒ مخدوم کی تقریر

ایک اور ملاقات کا ذکر عفیف اس طرح کرتا ہے کہ ایک روز مخدوم صدر الدین محمد علیہ الرحمۃ بادشاہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، اور وجہ معاش کا ذکر ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے اُن دنوں رعایا کے لئے وظائف کا کوئی تازہ حکم جاری کیا تھا۔ اس پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے حضرت مخدوم نے فرمایا:-

وفات کے وقت مومن کے دل پر دو رنج و الم طاری ہوتے ہیں۔ ایک اندوہِ دینی، دُوسرا رنج دنیاوی، اندیشۂ دینی سے یہ مراد ہے کہ لمحاتِ آخر میں بندۂ مؤمن اپنی فطری خصلت وکیفیت کے مطابق رنج و غم میں مبتلا ہوتا ہے کہ ایسے نازک وقت میں اس کو نجات کی بشارت ہوتی ہے یا عذابِ آخرت کی۔ اس لئے کہ کسی شخص کو اپنے خاتمہ کا صحیح علم نہیں ہے۔ اور یہ کہ سوائے انبیاء علیہم السّلام اور عشرہ مبشّرہ کے کوئی فرد عصمتِ انسانی کا مرتبہ نہیں رکھتا، دُوسرا اندوہ جو مؤمن کے قلب پر طاری ہوتا ہے، وہ دُنیاوی رنج والم ہے، ہر شخص سکرات کے عالم میں اسی فکر و الم کا شکار ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کے بال بچے کس حال میں زندگی بسر کریں گے جہاں پناہ نے اپنے عہد معدلت مہد میں، ہر مومن کو دُنیاوی فکر اور رنج سے نجات دے دی ہے۔ اس حکم میں رعایا کے لئے اطمینان اور حضرت بادشاہ کے لئے بے شمار ثواب ہے۔ اور میرا ایمان ہے، آپ نے جو کہ مخلوق کا درجہ رکھتے ہیں، مؤمن کے قلب کو دُنیاوی رنج و غم سے نجات دلادی ہے، تو پروردگارِ عالم جو خالقِ مطلق ہے اور جس کا رحم وکرم بے شمار و لامحدود ہے اپنے بندے کو دینی فکر (عاقبت کے غم) سے نجات دے دے گا اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ دارالسّلام میں جگہ عنایت فرمائے گا۔"

اس وقت دربار پر سناٹا سا چھا رہا تھا۔ جب حضرت مخدوم نے تقریر ختم کی تمام حاضرینِ دربار سربسجدہ ہو گئے، اور دیر تک رب العٰلمین کی بارگاہ میں ا...

حسنِ خاتمہ اور بادشاہ کی سلامتی کے لئے دُعا مانگتے رہے۔ سلطان بھی یہ منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ عرض کی۔ حضرت! آپ کو معلوم ہے کہ قدیم سلاطین نے صرف چند روز دُنیا میں حکمرانی کی ہے اور اس کے بعد دُنیا سے چل بسے، ہم کو بھی ایک روز اس جہانِ فانی سے سفر کرنا ہے۔

اس کے بعد بادشاہ نے یہ شعر پڑھا ؎

چوں بزم ما بہ بینی خالی ز ما بگوئی —!
روزے دریں محلّت غوغا زدے حبابی

سلطان فیروز شاہ بڑا نیک اور دیندار بادشاہ تھا۔ اس نے رفاہِ عامہ کے اس قدر کام کئے ہیں کہ آج تک اس کا نام عزّت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ حصار فیروزہ، فیروز پور، کوٹلہ فیروز شاہ، نہر جمن غربی اس کی اچھی یادگاریں ہیں۔ نوّے سال کی طبعی عمر پا کر ۷۹۰ھ میں دارِ فانی سے عالمِ بقا کو رخصت ہو گیا۔

طوائف الملوکی

سلطان فیروز شاہ کا لائق لڑکا شہزادہ فتح خاں اس کی زندگی میں فوت ہو چکا تھا۔ اس لئے سلطان کے انتقال پر شہزادے کا بیٹا غیاث الدین تخت نشین ہوا۔ لیکن ابھی اسے ۵۳ یوم ہی گزرے تھے کہ امراء کے ہاتھوں قتل ہو گیا اس کے بعد سلطان ابوبکر بن ظفر شاہ بن شہزادہ فتح خاں تخت پر بیٹھا۔ مگر یہ بھی ڈیڑھ سال کے بعد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان محمد شاہ بن فیروز شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے چھ سال سات ماہ حکومت کی اور دار البقاء کو رخصت ہوا

سلطان محمد شاہ کی وفات پر اس کا لڑکا سلطان علاء الدین سکندر شاہ تخت پر بیٹھا لیکن یہ بھی ۱½ ماہ حکومت کر کے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا۔ مرحوم کے انتقال پر اس کا بھائی سلطان ناصر الدین محمود شاہ آبائی تخت و تاج کا مالک بنا۔ مگر اب سلطنت کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ امرار خود سر ہو گئے تھے۔ جسے بھی سلطان کسی علاقے کا حاکم مقرر کرتا وہ باغی ہو جاتا۔ چنانچہ ایک دفعہ چار صوبیداروں کا تقرر کیا۔ ایک نجومی دربار میں حاضر تھا۔ اس نے کہا کہ یہ چاروں خود مختار ہو کر بادشاہ بنیں گے۔ چنانچہ اتفاق سے ایسا ہی ہوا۔ خضر خاں کو ملتان کی صوبیداری پر تعینات کیا تھا جو بالآخر مسندِ شاہی پر متمکن ہوا۔ اس وقت دہلی میں بیک وقت دو بادشاہوں کا سکہ چلتا تھا۔ پرانی دلی میں محمود شاہ حکومت کرتا تھا، اور فیروز آباد میں اس کا ایک عزیز نصرت شاہ کے نام سے کوس لمن الملکی بجا رہا تھا۔ دونوں کے لشکر آئے دن ٹکراتے رہتے تھے، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔

مغلوں کا حملہ

اس آئے دن کی خانہ جنگیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے قدیم ترین دشمن مغل تیمور لنگ کی کمان میں گھٹا کی طرح اس ملک پر چڑھ آئے۔ امیر تیمور کے بھانجے میرزا پیر محمد جہانگیر نے لپک کر ملتان کو محاصرے میں لے لیا۔ سارنگ خاں صوبیدار نے چھ ماہ تک مقابلہ کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہریوں کو چوہے، بلّی بھی کھانے کو نہیں ملتے تھے۔ انجام کار تنگ آ کر سارنگ خاں نے شہر کے دروازے کھول دیئے۔ مغلوں نے جی بھر کر شہر کو لوٹا اور جسے چاہا قتل کیا۔ ملتان کی فتح کے بعد شہزادے نے اپنے جدِ بزرگوار تیمور اعظم کی خدمت میں عرضداشت بھیجی

کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔ انہی ایّام میں ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی اور کئی دنوں تک مسلسل بارش برستی رہی۔ جس سے شہزادہ کے گھوڑے بیمار پڑ گئے اور بہت سے جانور مر گئے۔ شہزادہ یہ کیفیت دیکھ کر ملتان سے نکلا۔ اس وقت ملک کے طول و عرض میں ایک خاص جوشش پیدا ہو چکا تھا۔ اور اکثر پرگنوں کے حاکم باغی ہو گئے۔ چنانچہ دیپال پور کا گورنر عوام کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اسی اثنا میں تیمور دریائے بیاس تک آ پہنچا اور میرزا پیر محمد ۱۴ر صفر بروز جمعہ وہاں جا کر اپنے جدِ امجد کی قدمبوسی سے مشرف ہوا۔ تیمور یہاں سے گرجتا برستا دہلی کو روانہ ہوا۔ اور اسے لنگڑا لولا کر کے ۱۹ر جمادی الثانی سنہ ۸۰۱ھ کو براہِ نگر کوٹ افغانستان کی وادیوں میں غائب ہو گیا۔

ملتان خاندانِ سادات کی پناہ میں

تیمور نے جاتے جاتے ایک اچھا کام کیا کہ دہلی کی سلطنت ایک خدا ترس انسان کے ہاتھ میں دے گیا۔ یہ رعایا پرور سلطان خضر خاں تھا۔ سلطان محمود تغلق نے اسے ملتان کا صوبیدار مقرر کیا تھا۔ جب خضر خاں کے باغی ہونے کی خبر دہلی میں پہنچی۔ تو دارالسلطنت سے سارنگ خاں کو ملتان کی صوبیداری کا پروانہ مرحمت ہوا۔ اس نے ملتان پہنچ کر خضر خاں کو شکست دی۔ چونکہ موصوف نسباً سیّد تھا۔ اس لئے سارنگ خاں نے پرگنہ فتح پور[1] اس کو جاگیر میں مرحمت کیا تیمور دہلی کو فتح کرنے کے بعد جب واپس لوٹنے لگا تو ۲ر جمادی الآخر بروز پنجشنبہ خضر خان اس کے دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے ملتان کی حکومت کا

---

[1] یہ میلسی کے قریب ایک معمولی سا قصبہ ہے۔ لیکن ان دنوں یہ پرگنہ کا صدر مقام تھا۔

پروانہ عنایت کیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ ہم نے ہندوستان کی سلطنت خضر خان کو بخش دی۔ خضر خاں نہایت شریف اور منتظم حکمران تھا۔ اُس نے ملتان کا اچھا انتظام کیا۔ اگرچہ تیمور کے بعد سلطان محمود تغلق دہلی واپس آگیا تھا۔ مگر اب اس کی حکومت دہلی سے چند کوس سے زیادہ فاصلے تک نہ تھی۔ ۸۱۵ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ خضر خاں جو اب اپنے آپ کو تیمور کا قائم مقام اور ہند کے تخت و تاج کا مالک سمجھتا تھا، فوج لے کر دہلی کو روانہ ہوا۔ محمود کے انتقال پر دولت خاں نام ایک زبردست امیر دہلی پر قابض ہو چکا تھا۔ فیصلہ کن جنگ کے بعد دولت خاں کو شکست ہوئی اور اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

خضر خاں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد شاہرخ مرزا کے نام خطبہ پڑھنے کا حکم دیا۔ اور سکّہ پر بھی اس کا نام مسکوک کیا۔ تیمور اس اثنا میں فوت ہو چکا تھا۔ خضر خاں نے ملک کا بڑا اچھا انتظام کیا، اور سات سال ۳ ماہ نیک نامی سے حکومت کرنے کے بعد راہگرائے عالم جاودانی ہوا۔

سُلطان مبارک شاہ

خضر خان کے بعد اس کا بڑا لڑکا سلطان مبارک شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے باپ کے علی الرغم تیموری ایالت کا جُوا کندھے سے اُتار پھینکا۔ شاہرخ مرزا کی طرف سے شیخ علی صوبیدار کابل نے شورکوٹ اور ملتان کے قریب دو تین سخت جنگیں لڑیں مگر اسے شکست ہوئی۔ سلطان مبارک شاہ فتح یاب ہو کر ملتان آیا۔ اور حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ، شاہ رکن عالمؒ اور محمد یوسف گردیزی رحمہم اللہ علیہم کے مقابر پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی۔ سجّادہ نشین حضرات اور درویشانِ خانقاہ کو انعام و اکرام سے نوازا، اور دہلی لوٹ گیا۔ تیرہ سال حکومت کر کے یہ بادشاہ

بھی قبر میں جا سویا۔

سادات خاندان کے آخری سلاطین

۸۴۱ھ میں سلطان مبارک شاہ کا بھتیجا سلطان محمد شاہ تخت نشین ہوا ۸۴۸ھ میں اپنے چچا کی طرح ملتان آیا، اور بارگاہ غوثیہ، قطبیہ اور آستانۂ یوسفیہ پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھا، اور سجادگان وخدام مقابر کو نذرانہ اور صدقات وخیرات سے راضی کر کے واپس دہلی کو مرخص ہوا۔ ۸۴۹ھ میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے لڑکے سلطان علاء الدین نے آبائی تخت پر قدم رکھا، مگر یہ اتنا کم ہمت تھا کہ دہلی کے سوا کچھ اس کے قبضے میں نہ رہا، اور یہ بھی اس سے نہ سنبھل سکی۔ آخر بدآیوں جا کر گوشہ نشین ہو گیا اور دہلی پر بہلول خاں لودھی نے قبضہ کر لیا۔

سلطان بہلول لودھی

بہلول خان کا دادا ملک بہرام ملتان کے صوبیدار مردان دولت کا ملازم تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ ملک سلطان خاں، ملک کالا، ملک فیروز، ملک محمد، اور ملک خواجہ۔ جب خضر خاں ملتان کا صوبیدار مقرر ہوا، تو اس نے سلطان خان کو اپنی ملازمت میں لے لیا، اور اسلام خاں کا خطاب اور سرہند کی حکومت سپرد کی۔ اس کے اور بھائی بھی ہمراہ تھے، اور وہ فوج میں افسر تھے۔ ان میں سے ملک کالا، نیازی افغانوں کی لڑائی میں مارا گیا۔ اس کی بیوی حاملہ تھی اور ملتان میں رہتی تھی۔ وضع حمل کے ایام قریب تھے۔ کہ اتفاقاً ان پر مکان کی چھت آپڑی وہ تو اس صدمہ سے مر گئی لیکن جنین زندہ رہا، جو اس وقت ماں کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا۔ یہی وہ یتیم بچہ تھا۔ جس کی قسمت میں آئندہ سلطان بہلول لودھی

ہونا لکھا تھا۔ یہ ایک ماہ کا تھا کہ اسے اسلام خاں کے پاس لے آئے۔ اُس نے اسے پالا پوسا، تربیت کیا، اپنا جانشین بنایا اور اپنی پگڑی اس کے سر پر بندھوائی اسلام خاں کے مرنے کے بعد بہلول خاں کا اقتدار بڑھ گیا۔ اور علاء الدین کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس نے دہلی کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا۔ کہتے ہیں جھنگ کی ایک عارفہ مائی ہیر نے، جس کا اصل نام عزت بی بی تھا، بہلول سے کہا تھا کہ دہلی کا تخت تیرا انتظار کر رہا ہے، فوراً دہلی پہنچو۔ ایک اور مجذوب نے بھی بہلول کو دہلی کی بادشاہت کی خوشخبری دی تھی، جس سے اس کے قلب و دماغ میں غیر معمولی قوت پیدا ہو گئی اور وہ یقین کامل کی برکت سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

شیخ محمد یوسف قریشی فرمانروائے ملتان

۸۴۷ھ میں سلطان علاء الدین کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر مغل فوج جو کابل، غزنی اور قندھار میں متعین تھی، متحدہ طور پر ملتان پر حملہ آور ہوئی۔ یہاں کوئی صوبیدار یا حاکم ایسا نہیں تھا جو اس طوفان کا مقابلہ کرتا مغل بلا کسی مزاحمت کے ملتان میں گھس آئے اور شہر کو ایسا لوٹا کھسوٹا کہ بس قیامت آگئی۔ سارا شہر تباہ و برباد ہو گیا۔ مغلوں سے جو اُٹھ سکا اُٹھا لے گئے، اور جو نہ اُٹھا سکے، اُسے جلا کر راکھ کر دیا۔

اس مصیبت کبریٰ کے بعد جب اہلِ ملتان کے ہوش بجا ہوئے تو انہوں نے مل کر یہ صلاح کی کہ اپنا خود مختار حاکم بنایا جائے جو اس ملک کا خاطر خواہ انتظام کرے۔ اس سلسلے میں کئی نام پیش ہوئے۔ ان میں حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ کے سجادہ نشین شیخ محمد یوسف کا نام نامی بھی تھا۔ ان

کی خدا ترسی، دینداری اور انتظامی قابلیت مسلمہ تھی۔ شہر بھر میں ہر دلعزیز تھے۔ سب نے باتفاق رائے انہیں اپنا بادشاہ بنا لیا۔ بقول مولانا ذکاءاللہ ۸۴۷ھ میں شیخ محمد یوسف کی تخت نشینی عمل میں آئی۔ تاریخ نظام الدین کا بھی یہی بیان ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"چوں در ۸۴۷ھ نوبت سلطنت و فرمانروائی دہلی بسلطان علاء الدین بن محمد شاہ رسید امر حکومت و کار سلطنت مختل گشت و در ممالک محروسۂ ہند طوائف بہم رسید۔ ولایت ملتان بواسطہ تواتر صدمات قہر مغول از حاکم خالی ماند۔ چوں بندگی شیخ الطریقہ بہاء الدین زکریا در قلوب اہل ملتان و جمہور زمینداران صوبہ بنوع قرار گرفتہ بود کہ زیادہ براں متصور نباشد[1]۔ جمیع اہالی و اشراف و عموم سکنہ و جمہور متوطنان آنحدود شیخ محمد یوسف را کہ تولیت خانقاہ و حراست و مجاورت روضۂ رضیۂ شیخ بہاء الدین زکریا بادمتعلق بود سلطنت و بادشاہی برداشتہ بر مغابر ملتان و اوچہ وغیرہ بعضے قصبات خطبہ بنام او خواندند و مشارٌ الیہ نیز با انتظام مہام حکومت پرداختہ شروع در انزو یاد جمعیت و افزونی لشکر نمودہ دلہائے زمینداراں بجود دام ساخت و مہمات ملکی را رونقے و رواجے داد[2]۔"

الغرض ملتان، اوچ اور مضافات کے اکثر قصبات میں شیخ محمد یوسف کا خطبہ پڑھا گیا۔ اور اس نے تھوڑے سے عرصے میں ملک کا انتظام قائم کر دیا۔ لشکر میں

---

[1] ملا نظام الدین کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کی خانقاہ مبارک کا لوگوں کے دلوں پر کتنا گہرا اثر تھا کہ انہیں بادشاہت کے لئے حضرت کے صاحب سجادہ سے اور کوئی شخص موزوں نظر نہ آیا۔ [2] تاریخ نظام الدین۔

خاصہ اضافہ کیا اور اس حدود کے جملہ زمینداران و ملوہان داران پر لطف و احسان کر کے ان کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ چونکہ یہ طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ دلّی کے تخت کا رُعب اُٹھ چکا تھا۔ اس لیے ہر سردار جس کی تھوڑی بہت کچھ جمعیت تھی بادشاہی کے خواب دیکھنے لگ گیا تھا۔ بہلول لودھی اسی طمع میں دہلی کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ ادھر سیوی (سندھ) میں رائے سہرہ نامی ایک لنگاہ سردار کے دِل میں بھی ہوس کا ناگ جھُوم اُٹھا۔ شیخ یوسف کی حکومت اس کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگی۔ چونکہ لوگوں نے شیخ کو از خود اپنا بادشاہ بنایا تھا، اور ان کے انتظام سے تمام لوگ خوش تھے۔ اس لیے رائے سہرہ کو علی الاعلان جنگ کی ہمت نہ ہوئی اس نے کچھ سوچ کر حضرت کی خدمت میں ایک پیغام بھیجا کہ "ہم باپ دادا کے وقت سے آپ کے سلسلہ سے اعتقاد رکھتے چلے آئے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ دہلی کی سلطنت فتنہ و خلل سے پُر ہے اور اسی دوران میں بہلول افغان نے دہلی میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا ہے۔ مناسب ہے کہ آپ قوم لنگاہ کی دلجوئی کریں، اور اسے اپنے لشکر میں شامل کریں۔ تاکہ ضرورت کے وقت وہ جاں سپاری کریں۔ بافضل ارادت کی پختگی کے لیے اپنی لڑکی کو آپ کی زوجیت میں دیتا ہوں"۔ شیخ محمد یوسف جو اس سازش سے قطعاً بے خبر تھے۔ رائے سہرہ کی درخواست کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور اس کی لڑکی کو سلاطین کی رسم کے مطابق نکاح کر کے حرم میں داخل کر لیا۔

رائے سہرہ کا فریب رائے سہرہ کبھی کبھی اپنی لڑکی سے ملنے کے

لئے خفیہ طریق سے آتا اور شیخ کو عمدہ عمدہ تحفے پیش کرتا۔ اگرچہ رائے سہرہ اور حضرت میں حد درجہ بے تکلفی ہو چکی تھی، اور وہ شہر میں رہائش رکھنے کا آرزومند تھا۔ لیکن بررسم سلاطین شیخ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ رائے ملتان شہر میں قیام کرے وہ جب آتا شہر سے باہر اُترتا، اور بیٹی کو تنہا دیکھنے آتا۔ اس طرح جب اس کا اعتبار قائم ہو گیا، تو اس نے اپنی سوچی سمجھی سکیم پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا۔

شیخ کو تاجِ شاہی سر پر رکھے تقریباً بارہ سال گزرے تھے کہ ۸۵۹ھ ۱۴۵۴ء میں رائے سہرہ اپنے جنگ آزما جوانوں کو جمع کر کے ملتان پر چڑھ آیا۔ جب وہ ملتان کے مضافات میں پہنچا تو اس نے عرضی بھیجی کہ اس دفعہ اپنی قوم کے تمام جنگجو مرد ہمراہ لایا ہوں، تاکہ آپ میری جمعیت دیکھ کر لائق خدمات تجویز فرمائیں۔ شیخ اپنی نیک دلی کے سبب رائے کے دھوکہ میں آ گئے۔ اور وہ بلا کسی مزاحمت کے ملتان کے قلعہ تک آ پہنچا اور مع اپنے لشکر کے خیمہ زن ہو گیا۔

یہ تمام نام و نمود دکھانے کے بعد رائے سہرہ شام کے بعد ایک خدمت گار کے ہمراہ لڑکی کو ملنے کے لئے شاہی محل کو روانہ ہوا، اور ملازم کو یہ سکھا دیا، کہ مکان کے کسی کونے میں بزغالہ کو ذبح کر کے اس کا خون میرے پاس لے آنا۔ چنانچہ رائے سہرہ جب لڑکی کو مل کر ایک کمرے میں جا لیٹا، تو خدمت گار گرم خون سے بھرا ہوا ایک پیالہ لے آیا، اور اس نے غٹا غٹ چڑھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بے ہنگم شور سے سارا محل سر پر اُٹھا لیا۔ اس کی لڑکی اور خادمائیں بھاگی بھاگی آئیں۔ اس نے ہائے وائے کرتے ہوئے کہا کہ "میرے خاتمے کا وقت قریب آ گیا۔ شدتِ درد سے پیٹ پھٹا جا رہا ہے۔ میرے خویش و اقارب کو بلاؤ تاکہ ایک نظر انہیں دیکھ لوں۔"

رائے سہرہ کی لڑکی نے شیخ کو اطلاع کی۔ انہوں نے اپنے معتمد آدمی امر واقعہ معلوم کرنے کے لئے بھیجے۔ ان کے سامنے رائے سہرہ نے خون کی قے کی، جس سے انہیں یقین ہو گیا کہ رائے سہرہ کا بچنا محال ہے۔ ادھر رائے نے چیخ چیخ کر کہا کہ "میرے آدمیوں کو بلاؤ۔ غضب ہے کہ تم اس وقت میں بھی مجھے خویش و اقارب سے ملنے نہیں دیتے!" سوچی سمجھی سکیم کے مطابق اس کے تمام سپاہی دروازے پر گوش بر آواز کھڑے تھے، اور اپنے آقا کو دیکھنے کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ جب وکلائے سلطنت نے یہ حالت دیکھی تو وہ مزاحم نہ ہوئے اور رائے کے اکثر شمشیر آزما جوان اندر آ گئے۔ رائے سہرہ جھوٹ موٹ کراہے جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی نگاہیں بے چینی سے اس امر کا جائزہ لے رہی تھیں کہ تیر نشانے پر پڑا ہے یا نہیں۔ اسی اثنا میں خدمت گار نے اس کے پاؤں دبانے شروع کئے۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ فوج اندر آ چکی ہے آپ اپنا کام شروع کریں۔

اشارہ پاتے ہی رائے سہرہ مستعدی اور ہوشیاری سے بستر پر اُٹھ بیٹھا، اپنے معتمد نوکروں کو حکم دیا کہ قلعہ کے تمام دروازوں پر پہرہ لگا دیں تاکہ شیخ کا کوئی ملازم اندر نہ آ سکے۔ پھر اپنی فوج کا ایک دستہ لے کر شیخ کی خلوت گاہ میں داخل ہوا۔ وہ نماز پڑھنے کے بعد بے خبر پڑے سو رہے تھے[1] کہ دشمن سر پر آ پہنچا۔ اس عالم میں وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ ان کے پلنگ کے چاروں طرف ننگی تلواروں کا پہرہ تھا۔ وہ حیرت سے کھڑے ایک ایک کا

[1] صاحب تذکرۃ الملتان لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ اوراد و وظائف میں مصروف تھے۔

مُنہ تک رہے تھے کہ کیا یوں بھی ہو سکتا ہے۔ اتنے میں رائے سہرہ نے بڑھ کر انہیں گرفتار کر لیا۔

یہ سب کچھ اتنی ہوشیاری اور رازداری سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو سکی۔ صبح کو اہلِ شہر نے یہی سُنا کہ شیخ محمد یوسف گرفتار ہو گئے اور رائے سہرہ سلطان قطب الدین کے لقب سے تخت پر بیٹھ گیا۔ ملتان کی سیاسی فضا میں تھوڑی سی جنبش ہوئی، مگر جب شہر کے ہر چوک اور موڑ پر تلواریں چمکتی نظر آئیں تو پھر ہر شخص نے صبر کا گھونٹ پی لیا۔

سلطان قطب الدّین لنگاہ

رائے سہرہ نے بہت جلد اعیانِ دولت پر قابو پا لیا اور ساتھ ہی اس نے شیخ محمد یوسف کے اعزّہ واقارب کو انعام واکرام سے نوازا، جس سے تمام لوگ اس کی حکومت پر راضی ہو گئے۔ شیخ محمد یوسف کو ان کے اپنے محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ جب ان کی طرف سے کسی دغدغے اور خدشے کا امکان نہ رہا، تو ایک دن انہیں خاموشی کے ساتھ قلعے سے نکل بھاگنے کی اجازت دے دی گئی۔ اور وہ تیز رو گھوڑے پر سوار ہو کر دہلی کو روانہ ہو گئے۔ ملّا نظام الدین لکھتے ہیں کہ جس دروازے سے شیخ نکل کر گئے تھے، اُسے سُلطان قطب الدین نے پختہ اینٹوں سے چُنوا دیا۔ ۱۰۰۲ھ تک یہ دروازہ اسی طرح مسدود تھا۔ تاریخ ملّا نظام الدین کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

"شیخ محمد یوسف را از دروازہ کہ شمال رویہ و قریب مزار نور الانوار الہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا واقع است بر آوردہ رخصت دہلی

نمود و فرمود تا آں دروازہ را بخشت پختہ چیدند و چنیں گویند کہ
آں دروازہ تا ۱۰۰۲ھ مسدود است[1]۔"

مُلّا عبدالباقی نہاوندی مؤلف ماثر رحیمی نے ۱۰۳۱ھ میں بھی اس دروازے
کو جوں کا توں بند پایا تھا۔

شیخ محمد یوسف دہلی پہنچے۔ تو سلطان بہلول لودھی نے ان کا بڑا
احترام کیا۔ اور ان کے بیٹے شیخ عبداللہؒ کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی
کر دی۔ شیخ نے سلطان کو ملتان پر حملہ کرنے کا بارہا مشورہ دیا، مگر وہ اپنی
مصلحتوں کے سبب ادھر متوجہ نہ ہو سکے۔ کیونکہ ابھی تخت و سلطنت
کے کئی دعوے دار موجود تھے۔ جون پور کی سلطنت الگ گلے کا ہار بنی
ہوئی تھی۔ اس لئے شیخ کو محض وعدوں سے خوش کرتے رہے اور لنگاہوں
کے خلاف کوئی عملی اقدام نہ کر سکے[2]۔

اہل ملتان کا انخلاء

شیخ محمد یوسف قریشی کی ذات ملتان اور
اہل ملتان کے لئے سرمایۂ صد افتخار تھی۔ ہر
طرف سکون و اطمینان کا دَور دورہ رہا تھا۔ ان کے عزل سے عروس البلاد ملتان
پر نحوست و ادبار کے دل بادل چھا گئے۔ سب سے بڑی حیرت اس بات
سے ہوتی ہے کہ قریشی حکومت کے ایام میں اجناس کی فراوانی تھی، اور
خوردنی اشیاء کے نرخ بھی ارزاں تھے۔ مگر جونہی حالات نے پلٹا کھایا۔
اور ملتان کے تخت پر رائے سہرہ نے قدم رکھا۔ تمام اجناس غائب ہو گئیں
منڈیوں اور ذخیرہ اندوں کے نجی گوداموں میں غلّے کا نشان تک نہ رہا۔
اور ملتان شہر قحط کی شدید لپیٹ میں آگیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر صنعت کار

لہ و ۲ہ تاریخ نظام الدین۔

حرب وضرب کے ماہرین، حکماء، تجار اور ممتاز علماء و مشائخ اس شہر سے نقل مکانی کر گئے۔ کاریگروں اور سوداگروں نے نئے ٹھکانوں میں پہنچ کر کاروبار کو خوب چمکایا علماء اور مشائخ نے جہاں قدم رکھا، وہیں علم وادب کے چراغ روشن ہو گئے۔ ان لوگوں کے چلے جانے سے ملتان کی علمی دنیا میں جو خلاء پیدا ہوا، اس کی تلافی صدیوں تک نہ ہو سکی۔ یہاں ہم چند اُن علماء اور مشائخ کا ذکر کرتے ہیں جو قحط کی تاب نہ لا کر ملتان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

قطب المشائخ شیخ سماء الدینؒ سہروردی

ایسے تارکین وطن میں قطب المشائخ شیخ سماء الدین علیہ الرحمۃ کا نام نامی سرِ فہرست ہے۔ آپ ذات کے کنبوہ اور ملتان کے قدیم باشندے تھے۔ آپ کے اجداد میں حاجی جمال کنبوہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے حضرت شیخ الاسلام کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا تھا حاجی جمال کے دو صاحبزادے تھے۔ شیخ احمد اور شیخ بہاء الدین۔ مولانا شیخ سماء الدینؒ شیخ احمد کے فرزند تھے۔

مولانا سماء الدینؒ اور مولانا اسحٰقؒ دونوں حقیقی بھائی تھے اور دونوں علم وادب، اور فقر وولایت کے آسمان پر مہر و ماہ بن کر چمکے۔ مولانا نے میر سید شریف جرجانی کے شاگرد رشید، مولانا ثناء الدین سے تعلیم پائی تھی، مخدوم سید راجن قتالؒ کے مرید تھے۔ اور خرقہ خلافت شیخ کبیر الدین اسمٰعیل بخاریؒ سے حاصل کیا تھا۔ لنگاہوں کے ابتدائی دور میں قحط کی شدت سے تنگ آ کر دہلی منتقل ہو گئے۔ سلطان بہلول لودھی کا زمانہ تھا۔ اُس نے حضرت کو سرآنکھوں

پر جگہ دی، مگر مولانا نے ہر حالت میں درویشی کی عظمت کو قائم رکھا، نہ کسی پر بار ہوئے اور نہ کسی سے مرعوب ہوئے۔ زندگی بھر کمال جرأت و استقلال سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۷ جمادی الاول ۹۰۱ھ کو آپ کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

سید احمد حنفی الملتانیؒ

فقہ، اصول، کلام اور ادب میں ممتاز تھے۔ قحط کے ایام میں ملتان چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔

شیخ محمد بن منکن ملاوی

شیخ الاسلامؒ کے مدرسہ میں مولانا حسین سے جملہ درسیات پڑھیں، بڑے عالم تھے۔ دہلی پہنچے تو سلطان سکندر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آپ کی ضیافت کی، بے شمار لوگ آپ کے مرید ہوئے۔ آپ نے یکم رجب ۹۳۱ھ کو انتقال فرمایا۔

مولانا عبداللہ تلمبیؒ

مولانا عبداللہ بن مولانا الہ داد علیہ الرحمۃ اپنے دور کے اجل علماء میں سے تھے، تلمبہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر میں پائی پھر ملتان جا کر تکمیل کی۔ یہاں سے عراق تشریف لے گئے اور علامہ عبداللہ یزدی سے منطق اور فلسفہ کی کتابیں پڑھیں، برسوں ان کی خدمت میں رہ کر استفاضہ کیا۔ پھر ملتان آکر مسندِ درس کو زینت دی۔ سالہا سال تک طالبانِ علم و ادب کو مستفید کیا۔ انتہائی ذکی اور متبحر عالم تھے۔ شیخ محمد یوسف قریشی کے بعد جب قحط کی شدت نے زندگی دوبھر کر دی تو دہلی کا رخ کیا۔ سکندر لودھی کا زمانہ تھا۔ اس نے آپ کو ملک العلماء کا اعزاز عطا کیا اور گزر اوقات کے لئے ایک بیرحاصل جاگیر بھی نذر کی۔

اس زمانے میں مولانا الہ داد جون پوری اور ان کے صاحبزادے علامہ

بھکاری کے علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔ سلطان کو مناظرے کی سوجھی۔ انہیں طلب کر کے ایک بڑے جلسے کا انتظام کیا۔ ایک طرف مولانا عبداللہ تلمبی اور ان کے رفیقِ شفیق مولانا عزیز اللہ تھے، دوسری جانب مولانا الہ داد اور ان کے صاحبزادے تھے۔ خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ انجام کار ثالثوں نے یہ فیصلہ دیا کہ تقریر میں مولانا عبداللہ اور تحریر میں مولانا الہ داد فائق ہیں۔

مولانا کے ویسے تو سینکڑوں شاگرد تھے۔ لیکن چالیس باکمال علم تھے جن میں مفتی جمال الدین اور ان کے بھائی عبدالغفور بن نصیر الدین دہلوی، میاں شیخ گۂ البیاری، میراں جلال الدین بدایونی کا بڑا درجہ ہے۔ ان سے پہلے صرف شرح شمسیہ (منطق)، اور شرح صحائف (کلام) متداول تھیں۔ ان کے آنے پر فلسفہ اور منطق کی کئی اور کتب شاملِ نصاب ہو گئیں۔[1]

مولانا عزیز اللہ تلمبی الملتانی رح

لنگاہوں کے ابتدائی دور میں مولانا عبداللہ تلمبی کے بعد جس دوسری عظیم علمی و ادبی شخصیت نے ملتان سے رختِ سفر باندھا وہ حضرت علامہ عزیز اللہ تلمبی تھے۔ آپ تلمبہ میں پیدا ہوئے، ملتان سے علوم شرعیہ کی تکمیل کی۔ ارغونی حملے کے دوران دہلی منتقل ہو گئے اور مولانا عبداللہ کے ہاں درس تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ بڑے عابد اور تنہائی پسند بزرگ تھے اصول، کلام، منطق، حکمت اور دیگر جملہ فنون میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ سکندر لودھی کا زمانہ تھا۔ اس کی قدر دانیوں نے آپ کو اور آپ ایسے دوسرے فاضل علماء کو قوت لایموت کی فکر سے بے نیاز کر دیا تھا۔ سکندر شاہ نے جو مناظرہ ترتیب دیا تھا، اس میں آپ مولانا عبداللہ کے ساتھ تھے۔ تقریر کا

[1] نزہۃ الخواطر جلد چہارم صہ ۲۲۵

میدان آپ لوگوں کے ہاتھ رہا۔ دہلی سے آپ سنبھل کو منتقل ہو گئے۔ سینکڑوں طالبانِ علم و ادب نے آپ سے استفادہ کیا اور اپنے دور کے مجتہد کہلائے۔ ان میں شیخ نظام الدین خیر آبادی اور شیخ حاتم سنبھلی کا مقام بہت بلند ہے۔ مؤخر الذکر کے بارے میں تاریخ بنی اسرائیل کے مصنف لکھتے ہیں:-

"مولانا محمد حاتم علامۂ وقت، بڑے سخی اور متواضع انسان تھے۔ اس زمانے میں کوئی ایسا عالم جامع معقول و منقول نہ تھا۔ خصوصاً آپ علم کلام، اصول و فقہ اور ادب میں بے نظیر تھے اور فقہ میں تو گویا ثانی امام اعظمؒ تھے۔ مدتوں انواعِ علوم کا فیض آپ کی ذات سے جاری رہا۔ آپ صوری اور معنوی کمالات کی جامع شخصیت تھے۔"

یہی مصنف آگے چل کر مزید لکھتا ہے کہ "مولانا حاتم سنبھلی، ظاہری قیل و قال کو ترک کر کے اپنے استاد شیخ عزیز اللہؒ کے مرید ہو گئے، جو بہت بڑے عالم ربانی اور ولیِ کامل تھے۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی جو اکبر کے زمانے کا مشہور نگار مورخ اور اکبری دین کا سب سے بڑا مخالف تھا، مولانا حاتم ہی کا شاگرد تھا۔ اور مولانا حاتمؒ نے جب اسے اپنے استاد کا کلاہ اور شجرہ عنایت کیا تو اس کے والد سے کہا کہ یہ میں نے اس لئے دیا ہے کہ عبدالقادر میرے استاد علامہ عزیز اللہؒ کی نسبت سے علومِ ظاہری سے بھی مستفید ہو۔ مولانا عزیز اللہ نے ۹۳۲ھ میں وفات پائی۔[1]

مفتی بہاء الدین اکبر آبادی

آپ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کی اولاد اور شیخ شمس الدین قریشی کے صاحبزادے تھے۔ مخدوم شیخ محمد یوسف کے عزل پر ملتان کو خیر باد کہہ کر آگرہ

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد چہارم ص ۲۲۵

پہنچے۔ مدرسہ جاری کیا اور شہر کے مفتی قرار پائے۔ آپ بڑے سخی انسان تھے۔ غرباء کی ضرورتیں پوری کرنے میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا جنیدؒ بھی جود و سخا میں خاص مقام رکھتے تھے۔ مفتی صاحب نے ۱۵ شوال ۸۷۹ھ کو وفات پائی۔ مولانا جنیدؒ ان کی جگہ مسند نشین ہوئے اور ۸۹۹ھ میں عالم قدس کو تشریف لے گئے۔

الشیخ العالم الفقیہ شمس الدینؒ ملتانی ثم لاہوری

آپ بھی حضرت شیخ الاسلامؒ کی اولاد میں سے تھے۔ مخدوم شیخ یوسف قریشی کی گرفتاری پر جب قریشیوں پر افتاد پڑی تو اس بدامنی میں آپ بھی ملتان سے لاہور تشریف لے گئے اور لاہوری بن کر رہ گئے۔ آپ بڑے عالم اور صوفی تھے۔ آپ نے لاہور میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے آپ ہی مہتمم اور آپ ہی شیخ المدرس تھے۔ بے شمار تشنگانِ علوم نے اس چشمہ فیض سے استفادہ کیا حضرت ۸۹۰ھ میں فوت ہوئے۔

آپ کی اولاد میں پیر برہان الدینؒ، شاہ عنایتؒ، پیر جمال شاہ نوریؒ پیر کرم شاہ قریشیؒ المعروف شاہ کھارا، اور پیر امیر شاہ (رحمہم اللہ علیہم) نے شمالی پنجاب میں تبلیغ اسلام کا بڑا کام کیا ہے۔

پیر محمد کرم شاہ ایم اے

حضرت علامہ شمس الدین ملتانی کی اولاد امجاد میں پیر محمد کرم شاہ ایم اے آنرز (الازہر) سجادہ نشین بھیرہ کا وجودِ مسعود مغربی پاکستان کے تمام متصوفین حضرات کے لئے باعثِ فخر ہے۔ آپ پنجاب یونیورسٹی کے گریجویٹ، الازہر (مصر) کے ایم اے

صوفی مذاق عالم، کئی زبانوں کے ماہر، مفسّر، محدّث، فقیہ اور سحر بیان خطیب، ہیں۔ غیر ادبی ماحول میں فردِ واحد ہونے کے باوجود اتنے اہم امور عمدگی سے انجام دے رہے ہیں۔ جو شاید کئی ادارے مل کر بھی نہ کر سکتے۔ پیر صاحب کی دینی، ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا ایک، ڈھندلا سا عکس سطورِ ذیل کے آئینہ میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ دارالعلوم محمدؐیہ غوثیہ بھیرہ

اس درسگاہ میں عصرِ جدید کے تقاضاؤں کے پیشِ نظر علوم دینیہ اور مروّجہ سرکاری تعلیم کا قابلِ تعریف انتظام ہے۔

۲۔ تفسیر ضیاء القرآن

یہ شہرۂ آفاق تفسیر بلاشبہ روشنی کا ایک ایسا مینار ہے جس کی ضیاپاشیوں نے ناظورۂ عالم کے تمام گوشوں کو منوّر کر رکھا ہے، زبان شگفتہ، بیان دلکش، ترجمہ کی جامع تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ اگر اُسے پھر عربی کا جامہ پہنایا جائے تو قرآنِ عزیز کا متن ہی سامنے آجائے گا۔

۳۔ سُنّت خیر الانام

منکرینِ حدیث کے لیے پیر صاحب کی یہ تصنیف برہانِ قاطع کا حکم رکھتی ہے۔ اس میں قرآن و سُنّت کے باہمی ربط، اتباع کے عقلی و نقلی دلائل اور تدوینِ احادیث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۴۔ ضیائے حرم

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کی نگرانی اور کتب کی تدوین کے ساتھ ساتھ آپ نے "ضیائے حرم" کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کر رکھا ہے جو اسلامی اقدار

کے فروغ کے لئے ایک تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مجلہ الحاد و دہریت کے موجودہ تیرہ و تار ماحول میں باطل کی ستم رانیوں کے خلاف مسلسل جہاد کر رہا ہے۔ پیر محمد کرم شاہ صاحب نے اپنے قول و فعل سے ثابت کر دیا ہے کہ ؎

آج بھی تم میں جو ہو ابراہیمؑ کا ایماں پیدا
نار کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اُن نامور علماء کا تذکرہ

جنہوں نے قحط اور ناموافق حالات کے باوجود

ملتان کی سکونت ترک نہ کی

مولانا عبداللہؒ، مولانا عزیز اللہؒ، مفتی بہاء الدینؒ اور علامہ شمس الدینؒ جیسے اکابر علماء و مشائخ کے علاوہ اور بھی بہت سے مقتدر خاندان ملتان چھوڑ گئے۔ کئی ناگور میں جا کر آباد ہوئے اور بعض نے دولت آباد اور گلبرگہ میں درس و تدریس اور فقر و ولایت کی مسندوں کو آراستہ کیا۔ لیکن ملتان میں چند ایسے نفوسِ قدسیہ بھی تھے جو ہر قسم کے مصائب اور آلام سہتے رہے، مگر انہوں نے ملتان نہ چھوڑا ان میں سے ہم صرف دو علماء کا ذکر کرتے ہیں جو اگر دہلی اور آگرے کا رُخ کرتے تو وہاں کی علمی شخصیتیں اُن کے آگے گھٹنے ٹیک دیتیں۔ وہ بزرگوار یہ ہیں:-

الشیخ العالم الفقیہ مولانا سناء الدین

مولانا سناء الدین ملتان کے قدیم باشندے اور حضرت علامہ میر

سید شریف کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے حالات خود اس طرح بیان کرتے ہیں، کہ میرے والد مولانا قطب بہرام اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ وہ کلام اللہ کے حافظ تھے اور ہمیشہ تلاوت قرآن حکیم میں قیام فرماتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ ہر جمعہ کی شب کو شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ کے مقبرے میں جاتے اور دونوں بزرگوں کے مزارات کی زیارت کرتے۔ کلام اللہ کا ایک ختم ان کی ارواح صادقہ کو ایصال کرتے اور اولادِ نرینہ کے لئے دُعا مانگتے۔

ایک دفعہ جمعہ کی رات کو حسب معمول آپ نے زیارت کر کے قرآن مجید کا ایک ختم ان کی ارواح پاک کو نذر کیا اور وہیں مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ آپ پر غنودگی طاری ہوگئی۔ خواب میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے دو کھجوریں مرحمت فرمائیں اور ارشاد ہوا، مولانا قطب بہرامؒ! ایک کھجور تم کھالو اور دوسری اپنی بیوی کو کھلاؤ، انشاء اللہ نیک بخت بچہ پیدا ہوگا۔ خواب دیکھنے کے بعد حضرت والد ماجد روضۂ اقدس سے باہر نکلے۔ دروازے پر ایک پیر مرد کھڑے تھے۔ اُنہوں نے دو سلیمانی چھوہارے آپ کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ یہاں سے خوش ہو کر حضرت والد ماجد گھر آئے۔ ایک چھوہارا خود کھایا اور دوسرا میری والدہ کو کھلایا۔ ان کی برکت سے میں وجود میں آیا۔

مولانا عبدالحی لکھتے ہیں کہ مولانا سناء الدین نے ابتدائی تعلیم ملتان میں پائی پھر شیراز گئے، اور حضرت علامہ میر سید شریفؒ سے علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ واپس لوٹ کر آئے ملتان میں درس دینا شروع کیا، اور بے شمار افراد نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۶ محرم ۸۹۶ھ کو فوت ہوئے۔

مخدوم العلمار الشیخ الکبیر علامہ فتح اللہ الملتانی رح

مولانا فتح اللہ علیہ الرحمۃ کا ملتان کے اساتذہ میں بڑا مقام ہے۔ جس قدر ان سے علوم دینیہ کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس کی مثال ہند سندھ میں نہیں ملتی۔ بے شمار اکابر علمار ان کے شاگرد تھے۔ مولانا جمالی رح لکھتے ہیں کہ حضرت علامہ کو اس درویش سے کمال محبت تھی۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنی طالب علمی کے حالات سُنائے اور فرمایا کہ میں بیس سال کی عمر تک جاہل محض رہا۔ یہاں تک کہ قرآن مجید بھی نہ پڑھ سکا۔ ایک رات میں نے سلطان العارفین شیخ العارف صدرالدین محمد علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا کہ مسجد میں بیٹھے ہیں شیر برنج (کھیر) سے بھرا ہُوا ایک طشت ان کے سامنے رکھا ہے، اور وہ حاضرین میں تقسیم کر رہے ہیں حضور نے مجھے بُلا کر ایک چمچ کھیر کا مرحمت کیا اور فرمایا کہ کھا اور سورہ یوسف حفظ کر۔ صبح کو میں نے یہ خواب حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد (اس مسجد کے امام) سے ذکر کیا۔ وہ فوراً اُٹھ کر مجھ سے بغل گیر ہوئے اور فرمایا۔ جب حضرت شیخ العارف رح نے آپ پر اتنی مہربانی کی ہے تو ضرور سعادت کے دروازے آپ پر کھُل جائیں گے۔ الغرض دُوسرے دن مولانا سے سورۂ یوسف پڑھنا شروع کی اور پانچ دنوں میں حفظ کر لی اور سات ماہ کے عرصہ میں پُورا قرآن از بر ہو گیا۔ اس کے بعد تحصیل علم میں معروف ہُوا۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور شیخ کی برکت سے تھوڑی سی مدت میں ہی منزل مقصود کو پہنچ گیا۔

صاحب نزہتہ الخواطر لکھتے ہیں کہ حضرت علامہ فتح اللہ، مولانا سمار الدین سے ابتدائی کتب پڑھنے کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور باقی کتابیں مولانا موسےٰ جیسبری سے پڑھیں جو علامہ سعد الدین تفتازانی کے شاگرد تھے۔ مولانا جیسبری سے

سندِ تکمیل حاصل کر کے ملتان واپس آئے اور مسندِ تدریس کو عزّت بخشی۔ آپ کے شاگردوں میں آپ کے صاحبزادے مولانا ابراہیم الجامعی، مولانا عزیز اللہ، شیخ نظام الدین قریشی، اور شیخ بایزید کے اسمائے گرامی زیادہ ممتاز ہیں۔ صاحب مقالات داؤدی لکھتے ہیں کہ ان کا پایہ علم و فضل کے اعتبار سے اتنا بلند تھا کہ ان تین کا جوڑ تھا ہند، سندھ میں کہیں نہیں تھا۔ مؤخر الذکر دو علماء ارغون کے حملے کے وقت ملتان چھوڑ کر دیپال پور اور پھر لاہور تشریف لے گئے۔ مرزا کامران نے ان کے لیے مدرسہ تعمیر کرایا اور اخراجات کے لیے جاگیر مرحمت کی۔ مولانا سناء الدین کی طرح مولانا فتح اللہ بھی ملتان کی خاکِ پاک میں آسودہ ہوئے۔

افسوس ہے کہ ملتان کی سرزمین ان فخرِ روزگار علماء کی قبروں کی نشان دہی کرنے سے قاصر ہے۔ ایسے بزرگوار مساجد کے قریب ہی دفن ہوئے تھے۔ آج سے تیس بتیس برس پیشتر مساجد کے پہلوؤں میں ایسی کافی قبریں موجود تھیں جنہیں ہندوؤں اور سکھوں نے بر چھا گردی کے دور میں بھی نہیں مٹایا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ جب مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہوئی، خود مسلمانوں نے ہی اپنے قدسی صفات اسلاف کے نشانات کو مٹانا شروع کر دیا۔ بیشتر قبریں منہدم ہو چکی ہیں۔ جو موجود ہیں وہ "اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند" کے مصداق چند دنوں کی مہمان نظر آتی ہیں ؎

تا سحر تُو نے نہ چھوڑی اے بادِ صبا!
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک